ایم عبد الرحمن خا...

ناشر: ایم ثناء اللہ خاں، ۲۶ ریلوے روڈ، لاہور

٧٨٦

وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِأَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ ؕ
جو صالح عمل کرے گا وہ اپنی ہی راہ سنوارے گا

داستانِ عمل

تاریخ اسلام کے حیرت انگیز ایمان افروز اور سبق آموز واقعات کا
انتخاب لاجواب

مرتبہ
ایم عبد الرحمن خان
چہلیک ملتان شہر
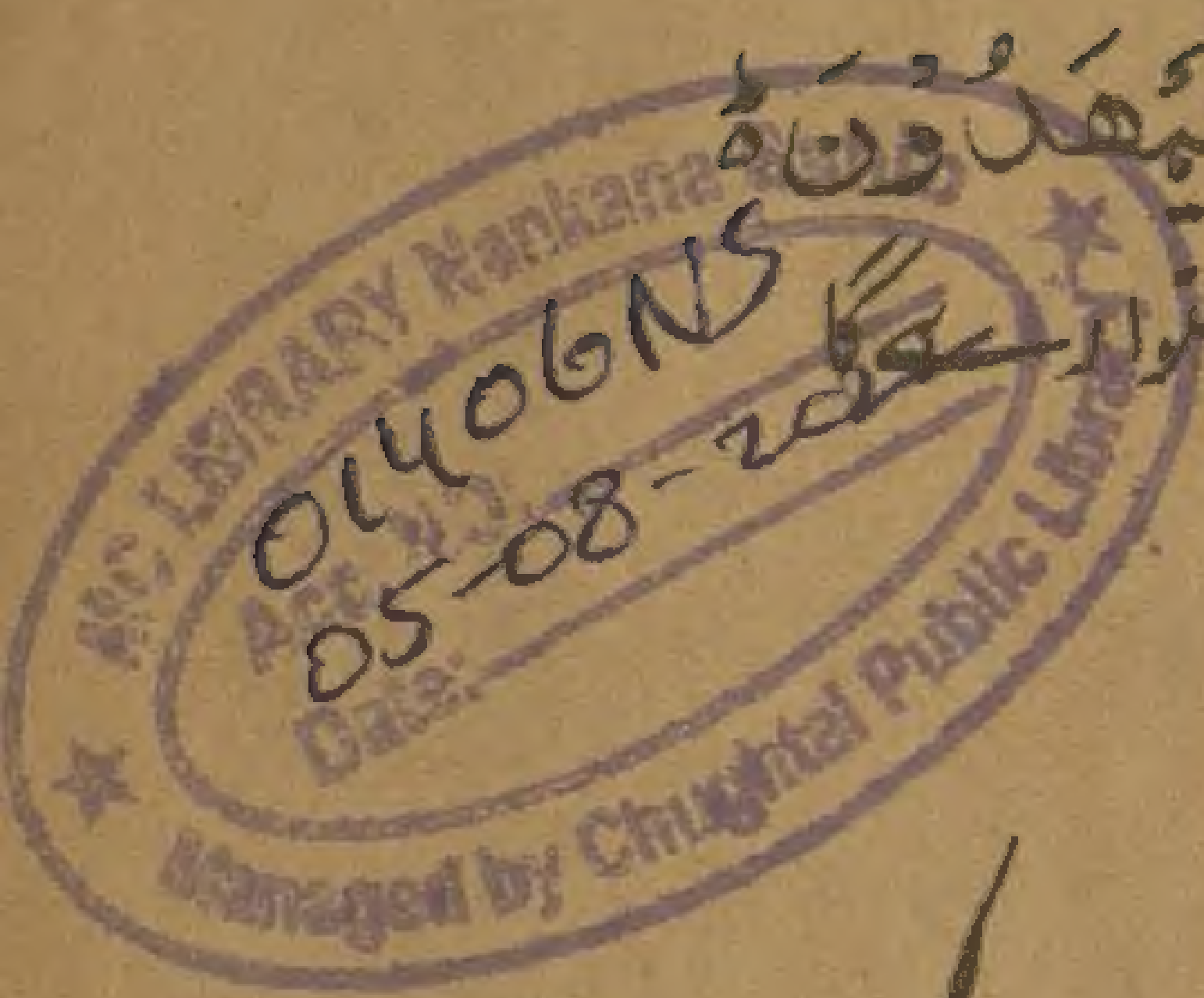
ناشر:- ایم ثناء اللہ خان ۲۶ ریلوے روڈ لاہور

پرمٹ نمبر ۹۵۵ مؤرخہ ۲۷ اکتوبر ۵۳ء

نقشِ اول ایک ہزار

قیمت:- چھ روپے

جنوری ۱۹۵۴ء

طابع:- انشاء پریس اُردو بازار - لاہور

ناشر:- ایم ثناءاللہ خان - ۲۶ ریلوے روڈ - لاہور

اُنکے نام

جنہوں نے اللہ کا نام بلند کرنے کتاب و سنت کو دستورِ حیات بنانے اور دینِ اسلام کو دنیا میں پھیلانے کی خاطر اپنی جان اولاد اور مال نثار کر کے ہمارے لیے صحیح عملی اسلامی زندگی کا نمونہ پیش کیا۔

مؤلف داستانِ عمل کی دوسری مقبول تالیفات

تعارفِ قرآنی　　احکامِ قرآنی　　بصائرِ قرآنی

حکومت سے مطالبہ کرنے کی بجائے اگر آج سے ہم خود احکام قرآن پر عمل کرنے اور سنت نبوی پر چلنے کا عہد کر لیں تو خود بخود اسلامی نظام قائم ہو سکتا ہے اور تعلیماتِ قرآن سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ان کتابوں کا مطالعہ اشد ضروری ہے جن کے متعلق

۱۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ صدر جمعیۃ العلماءِ اسلام لکھ گئے ہیں۔

ان کے ذریعہ آسان۔ دلچسپ اور تاریخی طریقہ سے قرآن کے جمالِ جہاں آراء سے دنیا کو روشناس کرایا گیا ہے۔

۲۔ حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی سابق صدر شعبہ دینیات عثمانیہ یونیورسٹی لکھتے ہیں

ان کتابوں کا مطالعہ لوگوں کیلئے اکسیر ہے اور انکا داخل نصاب کرنا ضروری ہے

۳۔ مورخ اسلام حضرت العلامہ سید سلیمان صاحب ندوی لکھتے ہیں۔

قرآن مجید کے متعلق ایسی عام فہم اور آسان کتابیں کم ہیں جن سے ہر شخص فائدہ اُٹھا سکے ان میں قرآن پاک کے نام۔ کام اور پیغام کو اختصار و خوش اسلوبی سے جمع کر دیا گیا ہے۔

۴۔ شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری لکھتے ہیں:۔

ان کے پڑھنے سے مضامین قرآن مجید کا ایک بہترین خاکہ پڑھنے والے کے ذہن میں آجاتا ہے اسلئے ہر مسلمان کے گھر میں اس سلسلہ کا مکمل سیٹ رہنا چاہیئے

تعارف قرآنی ۱۲؍　　بصائر قرآنی ۸؍　　احکام قرآنی ۸؍

(ناشر)

مؤلف داستانِ عمل کی نئی پیشکش

اخلاق و آداب

کوئی قوم اس وقت تک ترقی نہیں کر سکتی جب تک اس کا اخلاق و کردار صحیح اور بلند نہ ہو۔ یہ اس وقت ممکن ہے جب وہ شہریت کے ابتدائی اصول سے کما حقہٗ واقف ہو اور اس کا ہر فرد روزمرہ کی زندگی میں معاشرتی ضبط و نظم سے کام لے۔ تا وقتیکہ یہ معاشرتی انقلاب پیدا نہ ہو۔ ہمارا سیاسی انقلاب کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔

ایک پاکیزہ معاشرہ پیدا کرنے کیلئے اس کتاب میں زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق اخلاق و آداب جمع کر کے انسانی حرکات و سکنات اور قول و کردار کا صحیح مقام۔ قاعدہ اور طریقہ بتایا گیا ہے۔ جسے اختیار کرنے سے انسان زندگی بھر انشاء اللہ کبھی ٹھوکر نہیں کھا سکتا اور نہ گمراہ اور پریشان ہو سکتا ہے۔

انتخابِ مضامین حسنِ ترتیب سلاستِ زبان اور طرزِ بیان نے کتاب میں ایک عجیب دلکشی پیدا کر دی ہے جس سے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس پرآشوب زمانہ اور تاریک ماحول میں یہ کتاب قوم کیلئے ایک سرمایہ حیات اور شمعِ ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔

ناشر

ابواب

عنوانات

ضبط و نظم

سخاوت و خدمت

خلق و تواضع

محبوبیت و فوقیت

جرأت و آزادی

تدبیر و سیاست

عفو و کرم

امانت و دیانت

اثر و تاثیر

شجاعت و مردانگی

تجارت اور دیانت

سادگی و پاکیزگی

فیاضی و بے نیازی

دین و دنیا

علم و ادب

عدل و مساوات

صبر و ثبات

ایثار و قربانی

علوم و فنون

خوف وخشیت

نصیحت و وصیت

ماخذات

۱	الفاروق	شبلی نعمانیؒ
۲	المامون	شبلی نعمانیؒ
۳	تابعین	معین الدین احمد۔ ندوی
۴	تاریخ طلوع اسلام	رشید اختر۔ ندوی
۵	تمدن اسلام	عبد الباسط۔ ایم۔ اے
۶	تاریخ الخلفاء	علامہ سیوطیؒ
۷	فتوح العجم	علامہ واقدیؒ
۸	فتوح المصر	علامہ واقدیؒ
۹	سیرۃ النعمان	شبلی نعمانیؒ
۱۰	انقلاب ترکی	قمر اجنالوی
۱۱	عالمگیر پر ایک نظر	شبلی نعمانیؒ
۱۲	مسلمان اندلس میں	رشید اختر۔ ندوی
۱۳	موازنہ ہلال و صلیب	نکہت۔ شاہ جہان پوری
۱۴	سیرۃ عمر بن عبد العزیز	عبد السلام۔ ندوی

۱۵	ایک ہزار سال پہلے	سید مناظر احسن گیلانی
۱۶	اسلام کا نظام سیاست و عدالت	یعقوب الرحمن عثمانی
۱۷	علماء حق کی مظلومیت کی داستان	مفتی انتظام اللہ شہابی
۱۸	مقالات	الہلال۔ معارف۔ مستقبل۔ عارف۔ آستانہ۔ اسلامی زندگی صبح صادق۔

توفیقِ عمل

(از جناب خان محمد اسد خان صاحب اسد ملتانی)

مذہب میں نکتہ سنجی و تدقیق چاہیئے
دیں کے لئے تو جذبۂ صدیقؓ چاہیئے

دیں کے معاملے میں اطاعت ہے ناگزیر
مذہب کے مسئلے ہوں تو تحقیق چاہیئے

کافی نہیں زبان سے اور دل سے ماننا
ایمان کی عمل سے بھی تصدیق چاہیئے

دل سے ادا ہوں خالق و مخلوق کے حقوق
پیشِ نگاہ مقصدِ تخلیق چاہیئے

آئینِ ملک و دیں میں رہے اختلاف کیوں
دونوں میں ہر لحاظ سے تطبیق چاہیئے

حسنِ عمل کی سعی ضروری تو ہے مگر
اس کے لئے خدا سے بھی توفیق چاہیئے

مانا کہ صلحِ کل تو امسلک ہے اے اسد
پھر بھی تمیزِ مومن و زندیق چاہیئے

مسلمانی و رکتاب

(ایک صاحب نظر کے قلم حقیقت رقم سے)

قانونِ قدرت نہیں بدلا کرتا۔ حق تعالیٰ پہلی امتوں کی نافرمانیوں اور بداعمالیوں کی وجہ سے ان کی ظاہری صورت بدل دیتے تھے۔ گر بطفیل رحمۃ اللعالمین صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ نے امتِ مسلمہ کے لئے اپنے قانون کو تو نہیں بدلا۔ گو صورتِ سزا بدل دی ہے یعنی ہر شخص کے اعمال کے مطابق اس کی شکل اب بھی بدل دی جاتی ہے۔ لیکن یہ بدلی ہوئی صورت عام انسان نہیں دیکھ سکتا۔ ایسے صرف مقربانِ خدا۔ جماعتِ مجاذیب اور اہلِ فراست و بصیرت نہ صرف عالمِ برزخ یا عالمِ مثال میں بلکہ عالمِ موجودات میں بھی دیکھ سکتے ہیں اور دکھا سکتے ہیں۔ ان کو جب باشندگانِ ازل کے گروہ میں صحیح انسانی شکل نظر نہیں آتی۔ تو وہ تڑپ اُٹھتے ہیں۔ مندرجہ ذیل پیغام بھی ایک ایسے ہی صاحب نظر بزرگ کی تڑپ کی صدا ہے جس نے صرف انسان ہی

نہیں دیکھا۔ بلکہ ایک ایسے انسان کے ہاتھوں تربیت پائی ہے۔ جو قانونِ قدرت کے مطابق ہر سو سال کے بعد پیدا کیا جاتا ہے۔ اور اب جب وہ پسِ پردہ چلا گیا ہے تو یہ پھر کتاب و سنت کی روشنی میں ہر شخص کو یہ صحیح انسانی شکل میں دیکھنے کے متمنی نظر آتے ہیں مگر

خدا مل جائے یہ ممکن ہے فطرت
مگر ملتے نہیں بندے خدا کے

یہ ان کا میرے نام ایک ذاتی پیغام تھا۔ مگر انکے پرخلوص جذبہ تڑپ کا تقاضا تھا کہ اسے اپنے تک محدود نہ رکھا جائے۔ بلکہ قارئین داستانِ عمل تک بھی پہنچا دیا جائے اسلئے جب ان سے اس امر کی اجازت طلب کی گئی۔ تو انہوں نے اہل اللہ کے طریق کے مطابق اس سے کتاب کو زینت بخشنے کی اجازت تو دے دی۔ مگر اپنا نام ظاہر کرنے سے روک دیا۔ اسلئے بہ تعمیلِ حکم ان کا نام ظاہر کئے بغیر انکا پیغام اس درخواست کے ساتھ ہدیہ قارئین کرام کیا جاتا ہے کہ آپ کو اس امر کی جستجو نہیں کرنی چاہیئے کہ کہنے والا کون ہے۔ بلکہ اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے (مؤلف)

... داستانِ عمل کے ابواب پر نظر دوڑائی۔ جن امور کی ضرورت کی طرف آپ نے اپنے مسلمان بھائیوں کو متوجہ کرنے کے لئے سلف کی کتابوں سے واقعات اخذ کر کے ایک جگہ جمع کئے ہیں۔ ان پر اس وقت تو کیا ہر وقت ہر شخص کو عمل کرنے کی ضرورت ہے اگر اس کتاب کی تالیف کے بعد بھی مسلمانوں پر "مسلمانی در گور" کی مثال صادق آتی رہے۔ تو مجھے اس کتاب کی کوئی خوشی نہ ہوگی۔ خوشی تو تب ہو۔ جب اس کا نمونہ بھی کہیں نظر آئے۔ ورنہ یہ کتاب بھی "مسلمانی در کتاب" ہی ثابت ہوگی۔ اور ایسی کتابوں میں ایک اضافہ

اگر اس وقت کوئی جماعت یا فروان الواب کا مجموعہ یا ان پر عامل نظر آئے۔ تو مجھے اس کا ضرور پتہ دیں کہ میں اس کا بہت زیادہ متلاشی ہوں۔ کیونکہ بقول اقبالؒ

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں۔ بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا۔

عملی نقوش

(از حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی مدظلہٗ)

"داستانِ عمل" کا مسودہ میرے مطالعہ سے گزرا۔ دل نے بیساختہ دعائیں دیں اور ان دعاؤں میں دوسرے احباب کو شریک کرنے کے لئے یہ چند سطریں سپردِ قلم ہیں۔

"داستانِ عمل" کے مؤلف منشی عبد الرحمٰن خاں صاحب ملتانی اپنی دوسری تالیفات کی بدولت جدید علمی دنیا میں خاصے متعارف ہیں یہ کتاب اپنی نوعیت کے اعتبار سے سابقہ تالیفات پر بدرجہا فائق ہے اور ایک انوکھے طرز پر اسلام کی مؤثر خدمت ہے۔

مؤلف گرامی قدر نے اس عجالۂ نافعہ میں اسلامی زندگی کے نقوش جو بجز عبادات کے تقریباً تمام شعبہ ہائے حیات میں دھندلے اور ماند پڑ چکے ہیں۔ اور جن کے احیاء کے متعلق نوجوانوں پر ایک عالم مایوسی چھائی ہوئی ہے عملی شکل میں پیش کر دیئے ہیں۔

مجھے امید ہے کہ اس کے مطالعہ سے مسلمانوں کی مایوسی توقع اور امید میں اور کاہلی و سستی چستی میں بدل جائے گی۔ حق تعالیٰ مؤلف موصوف کو اس کا اجر عطا فرمائے۔ آمین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تعمیرِ اقوام کا راز

(از مورخِ اسلام حضرت العلامہ سید سلیمان صاحب ندوی مدظلہ العالی)

"داستانِ عمل" کتابت کا مرحلہ طے کر کے جب پریس میں پہنچی، تو کنٹرول کی "برکت" سے کاغذ انتہائی گراں بلکہ نایاب ہو گیا۔ ارباب علم و ذوق کے پیہم تقاضوں کے باوجود کتاب کی طباعت و اشاعت میں تاخیر ہو گئی۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسودہ کی نقل قبلہ سید صاحب مدظلہ کی خدمت میں بھیج دی تاکہ قبل از اشاعت ان کی رائے حاصل کر کے تبرکاً شاملِ کتاب کی جا سکے۔ انہوں نے از رہِ ذرہ نوازی کتاب کے مطالعہ کے بعد اطلاع دی کہ

"آپ کی کتاب کو بڑی دلچسپی سے پڑھا۔ آپ نے ایک اچھی خدمت انجام دی ہے اور میں نے بھی دیباچہ کے طور پر کچھ لکھ دیا ہے"۔

جسے بصد شکریہ درج ذیل کیا جاتا ہے۔ جو راہِ عمل کی طرف

صحیح راہنمائی کرتا ہے۔ (مؤلف)

"قوموں کی تعمیر ان کے افراد کے کردار و سیرت کی تعمیر سے ہوتی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی بنا پر انگریزی عہد سے پہلے ہماری زبان اور تعلیم کا بڑا سرمایہ اخلاقی کتابوں کا نصاب تھا۔ کریما سے گلستاں تک جو کچھ پڑھایا جاتا تھا۔ وہ سرتاسر اخلاقی تھا۔ اور اس سے جو سبق ملتا تھا۔ وہ ہر عمر میں پڑھنے والے کے کام آتا تھا۔ انگریز آئے تو بچوں کے لئے کتّے اور بلیوں کے قصے اپنے ساتھ لائے جن سے لطف اندوز دلچسپی کے سوا کوئی اخلاقی تعمیر سیرت کا فائدہ۔ اور نہ زندگی کا کوئی قاعدہ معلوم ہوا۔ ہماری کتابوں میں جو کچھ تھا۔ وہ سرتاپا بزرگوں کی حکایات۔ دانایانِ روزگار کے حکیمانہ مقولے اور قرآنِ پاک اور احادیث کے احکام و ارشادات تھے۔ جو عمر بھر کے ہر موقعہ کے لئے کافی تھے۔

اب جب سیاسی حالات بدل چکے ہیں۔ تو ضرورت ہے کہ ہمارے تعلیمی نصاب میں بھی اصلاح ہو۔ اور پھر سے اخلاقی تعلیمات کو ہمارے نصاب میں مناسب جگہ دی جائے۔ اس وقت پاکستان کے عملہ سرکاری ملازمین۔ تجّار اور عام افراد میں جو اخلاقی نقائص نظر آ رہے ہیں۔ اور جن کا ہر روز اخباروں میں اظہار ہوتا رہتا ہے۔ وہ سب کا

سبب اسی تعلیمی نقص کا نتیجہ ہے۔

ہماری پچھلی تاریخ صرف قتل و خون اور فوج کشی کی داستان نہیں ہے بلکہ بزرگوں، بادشاہوں، اکابر، امراء، وزراء، اہل ریاست اور اہل علم کے اخلاقی کارناموں سے لبریز ہے۔ ضرورت ہے کہ ہمارے اہل علم اور مصنفین ان جواہر ریزوں کو یکجا کر کے قوم کے سامنے پیش کریں۔ اور شعبہ تعلیم ان کو اپنے نصاب میں جگہ دے۔ تاکہ نوجوانوں کے اخلاق پاک و صاف اور بلند ہوں۔ ورنہ یاد رہے کہ اخلاقی بلندی کے بغیر نہ کوئی قوم زندہ رہی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔

اسی جذبہ کے تحت ایم عبدالرحمٰن خاں صاحب اس سے پہلے قرآن پاک کی اخلاقی تعلیمات کی تالیف میں کامیابی حاصل کر چکے ہیں۔ اور اب انہوں نے اسلامی تاریخ کے اخلاقی واقعات کو یکجا کر کے قوم کے نوجوانوں کے سامنے پیش کیا ہے امید ہے کہ یہ کتاب بھی مفید اور کامیاب ہوگی۔

کراچی
۳ر اگست ۱۹۵۳ء

ہیچمدان
سید سلیمان ندوی

ابتداء

جائزہ

آرزوؤں نے ہزاروں پیچ و خم پیدا کیے
زندگی کا راستہ تھا بے نیازِ پیچ و خم

زمانہ آفتابِ نبوت سے جتنا دور ہوتا جا رہا ہے۔ تاریکی اتنی زیادہ پھیلتی جا رہی ہے۔ دین سے بے رغبتی بڑھ رہی ہے۔ دنیا کی محبت غالب آ رہی ہے۔ ایمان و عمل اور اخلاق و آداب کا دامن ہاتھ سے چھوٹ رہا ہے۔ حلال و حرام اور جائز و ناجائز کی تمیز کا احساس مٹ رہا ہے۔ اسلام اور قرآن کے نام پر نئے نئے فتنے پیدا کیے جاتے ہیں۔ روزمرہ کی زندگی میں ایسی گرہیں پڑتی جا رہی ہیں کہ ناخنِ تدبیر انہیں کھولنے سے عاجز نظر آتا ہے۔ زندگی کے صاف و شفاف راستے تاریکیوں اور گمراہیوں میں بدلتے جا رہے ہیں۔ اور ایک انسان کیلئے

صراطِ مستقیم کی تلاش و شناخت ناممکن بنتی جا رہی ہے۔

قبل ازیں ہمارا نظامِ تعلیم و تربیت اُس قوم کے ہاتھ میں رہا جو شروع سے دشمنِ اسلام چلی آئی ہے اس نے تاریخ کے ہر دور میں مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لیے کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ ماضیٔ قریب میں بھی اس نے اپنی اس پالیسی پر عمل کرتے ہوئے ہمارے لیے ایک ایسا نصابِ تعلیم تجویز کیا جس کا مقصد ہمارے دلوں سے اسلام اور تاریخِ اسلام کی عظمت و شوکت کو مٹا کر لادینی اور مغربیت کا سکہ بٹھانا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے دورِ حکومت میں اس مقصد کو بخوبی پایۂ تکمیل تک پہنچایا جس کی مورخِ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی نے تیسری کل پاکستان تاریخ کانفرنس منعقدہ ڈھاکہ میں یوں وضاحت فرمائی

"یہاں انگریزوں نے تاریخ نویسی کے طرز کو بالکل بدل ڈالا ان کی سیاست نے ملک میں تفریق کا بیج بویا۔ اس ملک کی بلندی اور رفعت کی بجائے انگریزی راج کے جاہ و جلال شان و شکوہ عدل و انصاف اور بحالیٔ امن و امان کی تشہیر کا کام اس فن سے لیا گیا جس سے ملک خود اہل ملک کی آنکھوں میں ذلیل اور سات سمندر پار کا ملک انکی نگاہوں میں معزز بنایا گیا۔ ملک کے پورے سابق عہد حکومت کو صرف

تاریکی اور ظلمت ظاہر کیا گیا۔ تاکہ انگریزی راج کا کارنامہ روشن نظر آئے۔ ان مکاریوں اور فریبیوں پر پردہ پڑ جائے۔ جس کے ذریعہ سے بیرونی لوگوں نے اس ملک کی دولت و صنعت و حکومت پر قبضہ کیا۔"

آج کوئی بھی مسلمان ایسا نظر نہیں آتا۔ جو اپنے ماضی کی تاریخ سے صحیح طور پر واقف ہو۔ بڑے بڑے ثقہ اور تعلیم یافتہ لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ اپنے شاندار ماضی کو نفرت و حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ بیکن، شیکسپیئر، جانسن۔ ملٹن۔ میزینی اور ڈنکن پر جان دیتے ہیں۔ انکی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں۔ مگر انہیں اتنی خبر نہیں کہ عہدِ اسلام میں علم ادب کے جاحظ، شیخ عبدالقاہر جرجانی۔ ابوالقاسم حریری۔ بدیع الزمان ہمدانی۔ ابوالفرج اصفہانی، علم نظم کے حسان بن ثابت۔ مختشی۔ فرزدق۔ ابوالعلا معری۔ ابو نواس متنبی۔ قطری بن الفجاد وغیرہ علم ہندسہ کے محمد بن جبیر البتانی۔ ابن ہیثم مصری۔ ابن اماجور۔ موسیٰ ابن شاکر کے تینوں بیٹے محمد، احمد اور حسن۔ علم فلسفہ کے ابن رشد۔ امام غزالی۔ امام فخرالدین رازی۔ بوعلی سینا۔ علم ہیئت کے ابوریحان محمد البیرونی۔ ابوالقاسم۔ علم جغرافیہ کے عرب تاجر سلیمان۔ مسعودی۔ ابن حوقل۔ البیرونی۔ ابوالحسن علی بن ابی القاسم۔ بن ماجور۔ ابن بطوطہ۔ الاسطخری۔ ادریسی۔ علم کیمیا کے

جابر ابن حیان اور الرازی۔ علم تاریخ کے احمد ہمدانی نشوان بن سعد حمیری۔ واقدی۔ ابن اسحاق۔ ابن ہشام۔ ابن قتیبہ۔ بلاذری۔ طبری۔ ابن اثیر۔ مقریزی وغیرہ امام گزرے ہیں۔ جن کی گرد کو بھی وہ لوگ نہیں پہنچ سکتے۔ بلکہ ان کی قوم اب تک ان کے علمی کارناموں سے استفادہ کرتی رہتی ہے۔

مشاہیر مغرب اس لیئے یاد ہیں کہ اہل مغرب نے اپنے اپنے وقت کے مشاہیر کی یادگاریں قائم رکھی ہوئی ہیں۔ ان کی تعلیمات کی نشر و اشاعت کے لیئے بڑے بڑے ادارے تمام دنیا میں کام کر رہے ہیں۔ مگر مشاہیر اسلام کے اعمال حسنہ۔ عزائم ہمم۔ نتائج عظیمہ اور عبائر و مواعظ جلیلہ دنیا کے سامنے عملی یا علمی شکل میں موجود نہیں۔ نہ ہی انہیں قائم و دائم رکھنے کا کوئی صحیح اور معقول انتظام موجود ہے۔ اسلیئے ہم سب ایک شاندار تاریخ رکھنے کے باوجود اس سے بے خبر ہیں۔

دورِ غلامی ختم ہوا۔ تو لوگوں نے دورِ آزادی سے بڑی بڑی توقعات وابستہ کر لیں۔ اکثر خوش فہم یہی سمجھنے لگے کہ آزادی کی صبح طلوع ہوتے ہی آئین اسلام پر عملدرآمد شروع ہو جائیگا۔ جیسے شام میں ہوا تھا۔ سلطان صلاح الدین نے جب ملکِ شام فتح کیا تو اس کے وزرا نے اسے مشورہ دیا کہ یہ سرکش لوگوں کا ملک ہے۔ اسلامی قوانین نرم

ہیں۔ یہاں سخت گیری کی ضرورت ہے۔ لہٰذا احکامِ اسلام کے ساتھ کچھ اور قوانین بھی حالاتِ زمانہ کے مطابق نافذ کیے جائیں۔ سلطان نے کہا۔

"کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نے جو ملک فتح کیا ہے۔ وہ خود حکومت و سلطنت کرنے کے لیے کیا ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ میں نے محض اللہ کو خوش کرنے کے لیے یہ سب کوشش کی ہیں۔ احکامِ اسلام ہی نافذ کروں گا۔ ملک رہے یا جائے مجھے اس کی پروا نہیں۔ لہٰذا ایک حکم بھی اسلام کے خلاف صادر نہیں کروں گا۔"

ہمارے اربابِ اقتدار اگر ہمت دکھاتے تو ان کے لیے ایسا کرنا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ عوام کی بھی یہی خواہش تھی۔ بلکہ انہوں نے قیامِ پاکستان کے لیے قربانی بھی اسی غرض کے لیے دی تھی۔ مگر جمہوری تقاضوں نے ایسا نہ ہونے دیا۔ نہ اب تک کچھ ہوا ہے۔ نہ آئندہ کسی صحیح اقدام کی توقع ہے۔ آئینی تبدیلی کا خواب جب شرمندۂ تعبیر نہ ہوا تو ملک کے گوشہ گوشہ سے موجودہ نصابِ تعلیم کو بدلنے کے لیے آوازیں بلند ہوئیں جو کہ عہدِ غلامی کی بدترین یادگار ہے۔ مگر نصابِ تعلیم کی تبدیلی کا مطالبہ کرنے والوں نے یہ نہ سوچا کہ یہ برسرِ اقتدار طبقہ بھی تو شاطرانِ مغرب کا ہی

تربیت یافتہ ہے۔ جن کا "دستِ شفقت" ابھی تک ان کے سر پر موجود
ہے۔ جس سے آزاد ہونا یہ خلافِ مصلحت سمجھتا ہے۔ جو ابھی تک انہی
کی بولی بولتا ہے۔ انہی کی چال چلتا ہے۔ انہی کی رعایت کرتا ہے۔
خود دین کی اہمیت اور تاریخِ اسلام کی حقیقت سے پوری طرح واقف
نہیں۔ بلکہ ان ناموں سے بھی گھبراتا ہے۔ وہ یہ مطالبہ کیسے فی الفور تسلیم
کر سکتا تھا چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اس اہم ترین مسئلہ کی طرف ویسی فوری
توجہ نہیں دی گئی جس کا یہ مستحق تھا۔ اور نہ ہی دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ
اسے اندیشہ ہے کہ تعلیم دین اور تاریخِ اسلام کے اسباق سے لوگوں
میں جذبۂ بلندیٔ نظری و حریتِ فکر پیدا ہو گی۔ اس سے ان کی مسندِ اقتدار
کا معرضِ خطر میں آجانا ایک لازمی امر ہے۔

قوم کی تعلیم و ترقی کی اولین ذمہ داری اربابِ حکومت پر عائد ہوتی
ہے۔ اگر وہ اپنے فرائض سے غافل ہوں تو پھر اکابرین و عمائدین قوم
کا فرض ہوتا ہے کہ وہ ایسے ذرائع و وسائل اختیار کریں جس سے قوم
کے دماغ اور اعمال کی اصلاح ہو سکے۔ مگر اس گروہ کا یہ حال ہے کہ
کوئی قرآن پاک کو داستانِ پارینہ ثابت کرنے کی فکر میں غلطاں و پیچاں
ہے۔ کوئی علمِ حدیث کی تردید و تنسیخ میں اپنا زورِ قلم صرف کر رہا ہے۔ کوئی
سلف صالحین اور آئمہ و مفسرین کی محنتوں اور کاوشوں کے نتائج کو دفتر

بے معنی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ کوئی
ان فتنوں سے اپنے دین و ایمان کو بچانے کے لئے گوشہ نشینی اختیار
کر کے صرف تعلیم دین اور اصلاح و تربیت پر اکتفا کر کے بیٹھ گیا ہے لیڈروں
کو جنگِ اقتدار سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ ہر لیڈر دوسرے لیڈر کو گرانے
اور اس کی گردن توڑنے کی فکر میں رہتا ہے یہ اپنی نفس پرستیوں اور خود
غرضیوں پر قوم کے مفادات کو قربان کرنے سے دریغ نہیں کرتے غرضیکہ
ہر طرف جنگِ اقتدار و نظریات جاری ہے جس نے مسلمانوں کو ٹولیوں
اور فرقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ہر فرقہ اپنے خیالات دوسروں سے منوانا
چاہتا ہے۔ خود کچھ ماننے کے لئے تیار نہیں۔ حالانکہ خود اس کا اپنا
عمل اس کے خیالات کی تائید نہیں کرتا۔ ان حالات میں قوم کے پنپنے
کی کیا امید ہو سکتی ہے جبکہ دشمنانِ اسلام تو یہاں سے کوچ کر چکے ہیں۔
مگر کام ابھی تک ان کی مرضی و منشاء کے عین مطابق ہو رہا ہے۔

قومیں ہمیشہ اپنے رہنماؤں کے قول و کردار کی مظہر ہوا کرتی ہیں جہاں
آقاؤں کا یہ حال ہو وہاں ان کی پیروی کرنے والوں کے اخلاق و عادات
کا بخوبی اندازہ لگایا جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں اس اقرار
سے ہم خود کو ان حدود و قیود کا پابند بنا لیتے ہیں جن کا تعین حق تعالیٰ نے
کلامِ پاک میں فرمایا اور جن کی نشان دہی رسولِ مقبولؐ نے اپنے قول و

نقل سے کی۔ اس کے بعد اگر ہم اپنے آپ کو ان حدود میں محدود کرنے کی بجائے خدا اور رسولؐ کی عائد کردہ پابندیوں سے جن میں سراسر ہمارا فائدہ ہے انکار و انحراف کرتے ہیں۔ تو عملی طور پر ہم مسلمان نہیں رہتے۔ بلکہ باغی بن جاتے ہیں۔

ہمارے اعمال اس بات کے شاہد ہیں کہ ہمیں اس اقرار کے باوجود خدا اور رسولؐ کے فرامین اور ضوابط پر اعتبار نہیں رہا۔ آخرت کے نفع کی امید پر دنیا کی عزت و دولت چھوڑنا ایک حماقت نظر آتی ہے۔ دیانت و امانت کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ایثار و قربانی، صبر و ثبات، اخلاص و محبت، قناعت، مردانگی، سخاوت و خدمت، سادگی و پاکیزگی، شرافت و انسانیت، فراخ دلی، جرأت و دلیری، عفو و کرم، ادب و احترام، شرم و حیا اور خوف و خشیت ایسی صفات مفقود ہو چکی ہیں۔ صنعت و حرفت دھوکا و فریب کے اصولوں پر چلائی جا رہی ہے۔ تجارت و وکالت کی کامیابی آمیزش اور ملاوٹ کی مرہونِ منت ہو گئی ہے اور عدل و انصاف اسلامی معیار پر قائم نہیں رہا۔ نہ معاملت صحیح رہی ہے اور نہ معاشرت۔

رشوت، سفارش، اقربا پروری، چور بازاری، ناجائز نفع گیری، ذخیرہ اندوزی کا ہر طرف بازار گرم ہے۔ حاکم محکوم کا خون چوس رہا ہے۔ مسلمان مسلمان کو کاٹے کھا رہا ہے۔ عام گزرگاہوں پر شریف زادیوں کا چلنا

ناممکن بنایا جا رہا ہے۔ مدارس و مساجد خالی نظر آتی ہیں قحبہ خانے۔ شراب
خانے۔ قمار خانے اور سینما گھروں کی رونق غربت و افلاس کے باوجود
بڑھتی جا رہی ہے۔ قتل و غارت۔ چوری و سینہ زوری اغوا اور دغا کی
روز افزوں وارداتوں نے گزشتہ تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں۔ غرضیکہ خود
غرضی اور نفس پرستی کا ایک ایسا دور آیا ہے جس میں بقول ے

ہم گرتے گرتے اب اس جگہ پہنچ گئے ہیں۔ جہاں برائی میں بھی
ہمیں دلکشی اور حسن نظر آنے لگا ہے۔ جہاں تک اسلامی غیرت
کا تعلق ہے ہم اس سے اتنے دور ہو چکے ہیں۔ کہ اب
دختران اسلام کھلے بندوں ہوٹلوں اور کلبوں میں رقص کرتی
ہیں۔ شراب پیتی ہیں۔ اور ہم مزے سے دیکھتے ہیں۔ آج ہماری
بہو بیٹیاں گلے میں دوپٹہ ڈالے سولہ سنگار کئے بازاروں اور
سینماؤں میں بے حیائی اور بے راہ روی کے فرخ مظاہرے
کرتی ہیں اور مسلمان ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ آج بازاروں میں
اس لٹریچر کی مانگ ہے۔ جو فحش ہو۔ آج وہ اخبارات پسند
کئے جاتے ہیں۔ جو فلم ایکٹرسوں کی تصاویر اور ان کے حالات
سے مزین ہوں۔ ہمارا ملک خدا کے فضل و کرم سے پاکستان
کہلاتا ہے۔ یہاں سب کچھ ہے۔ مگر اسلام نہیں۔"

یہی وہ حالات ہیں جن کے پیش نظر ایک غیر مسلم یہ کہنے میں حق بجانب نظر آتا ہے کہ

"اسلام ایک بہترین مذہب ہے مگر مسلمان ایک بدترین قوم ہے"

جب ہم اپنے حال پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہ رائے سو فی صدی صحیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ ہمارے اسلاف کا عمل اس پر تھا کہ تمام اختیار و اقتدار اللہ جل شانہٗ کے ہاتھ میں ہے۔ تمام قومیں اسی کے حکم اور اسی کی حکمت کے ماتحت ہیں ہمیں ایک قلیل عرصہ کے لئے آخرت کی نجات کا سامان جمع کرنے کے لئے اس دار الفنا میں بھیجا گیا ہے جس کے بعد ہمیں دار البقا کو لوٹنا ہے اور اس احکم الحاکمین کے دربار میں اپنا نامہ اعمال لے کر اپنی قسمت کا آخری فیصلہ سننے کے لئے پیش ہونا ہے۔ جہاں ذرہ ذرہ اور پائی پائی کا حساب لیا جائے گا۔ خدانخواستہ اگر کسی امر کے متعلق گرفت ہوگئی تو اس کی طویل المیعاد سزا ملے گی جس کی شدت اور سختی تصور میں بھی نہیں لائی جا سکتی۔ اور اگر رو بہ حساب میں سرخرو ہو کر نکلے تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے لازوال مسرت و انبساط کی زندگی نصیب ہوگی جس کی وجہ سے وہ ہر کام میں رضائے الٰہی ڈھونڈتے تھے ہر وقت عذاب الٰہی سے ڈرتے رہتے تھے۔ زر و جواہر کے انبار ان کے سامنے آتی

کشش نہ رکھتے تھے۔ راہِ خدا میں خوب زر و مال لٹاتے تھے۔ جہاں جاتے تھے۔ اُسی کے نام اور اُسی کے دین کا عَلَم بلند کرتے تھے موت کو بازیچۂ اطفال سمجھتے تھے۔ مصائب و آلام کا اس طرح ہنستے ہنستے مقابلہ کرتے تھے کہ مخالف انہیں مافوق الفطرت ہستی۔ فرشتے اور تقدیر مجسم کے نام سے پکارنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔

غرضیکہ وہ آخرت کے حریص تھے ہم دنیا کے حریص ہیں۔ اُس وقت دنیا ان کے پیچھے دوڑا کرتی تھی۔ آج ہم دنیا کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔ وہ دامنِ دین پکڑ کر اوجِ عزت پر پہنچے تھے۔ اور ہم دنیا کی محبت میں گرفتار ہو کر ذلت کے گڑھوں میں اُترتے چلے جا رہے ہیں مگر ان سے نکلنے کا نام نہیں لیتے۔ جو ہمیں قعرِ ذلت سے نکالنا چاہتے ہیں انکو قریب نہیں آنے دیتے بلکہ انہیں اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔ ان کی مخلصانہ مساعی کو فلاں ازم کے قیام سے تعبیر کرتے ہیں اور اسے ختم کرنے پر تلے ہوئے ہیں حالانکہ علمائے حق انہی لوگوں کو احکامِ کتاب و سنت کا پیرو دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ تاکہ یہ پھر بامِ ترقی پر پہنچ سکیں۔

اس میں شک نہیں کہ علمائے سوء اسلام کے شاہی دور کی پیداوار ہیں ملتِ اسلامیہ کے لئے ایک ناسور کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ قریباً ہر زمانہ میں برسرِ اقتدار طبقہ نے اس

گروں کی پرورش و پرداخت کی ہے اور اسے اپنی مطلب براری کے لئے
بطور آلۂ کار استعمال کیا ہے۔ پاکستان کے قیام کے بعد جب یہاں آئین
اسلام کے نفاذ کا غلغلہ بلند ہوا تو اربابِ اغراض نے اسے مُلّا ازم کے
قیام کی تحریک سے تعبیر کر کے اس مطالبہ کی اہمیت گھٹانے کی ایک نئی
کوشش کی۔ جب بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی دوسری رپورٹ مجلس دستور
ساز میں پیش کی گئی تو اس میں ان لوگوں نے کمال ہوشیاری سے
کتاب و سنت کی تفسیر و تعبیر کا حق ایوانِ عام کے ممبروں کے لئے
محفوظ رکھ دیا۔ جو اس علم کی ابجد سے بھی قریباً ناواقف ہوں گے اور
صرف اختلافی مسائل میں علماء کی رائے لینے کے لئے علماء کے ایسے بورڈ
کی تشکیل کی گنجائش رکھ دی جیسے شاہانِ اسلام کے دربار میں اکثر موجود
ہوا کرتے تھے۔ وہ ان سے جس قسم کا فتویٰ چاہتے حاصل کر لیتے
تھے۔ ہمارے اربابِ اقتدار بھی آئینِ اسلام کی پابندیوں سے بچنے
کے لئے اس مُلّا ازم کا ہوّا کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور
عوام کو یوں طفل تسلی دے رہے ہیں کہ آئینِ اسلام چونکہ کہیں کتابی
صورت میں موجود نہیں۔ اس لئے اس کی تشکیل و تدوین میں تاخیر ہو
رہی ہے۔ یہ محض ایک عذرِ لنگ ہے۔ مگر ہنگامی ضرورتوں کے تحت قلیل
ترین وقفہ کے اندر طویل و پیچیدہ آرڈیننس مرتب و نافذ کئے جا سکتے ہیں

تو یہ کام کبھی چند مہینوں کے اندر اختتام پذیر ہو سکتا تھا جبکہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی کتاب قرآن۔ اسوۂ رسولؐ۔ سیرۃ صحابہؓ اور خلفار راشدین کے طرز حکومت کی زندہ جاوید مثالیں سامنے موجود ہیں ایسے حقائق و شواہد کی موجودگی میں آئین اسلام کی تدوین کو مشکلات کا نام دینا ایک بہت بڑی جسارت ہے۔ جس سے خدا اور رسولؐ کے ان فرامین کو جھٹلانا ہے جن میں صاف صاف کہا گیا ہے کہ کتاب و سنت قیام قیامت تک کے لئے ایک مکمل دستور حیات ہے جس کے مطابق مسلمان چین سے لے کر اسپین تک حکمرانی کرتے رہے ہیں جس کا غیر مسلموں نے بھی اعتراف ہے ڈاکٹر سموئیل جانسن لکھتا ہے:۔

"قرآن کے مطالب ایسے ہمہ گیر ہیں اور ہر زمانہ کے لئے اس قدر موزوں ہیں کہ زمانہ کی تمام صدائیں خواہ مخواہ اس کو قبول کر لیتی ہیں۔ اور دو محلوں۔ ریگستانوں۔ شہروں اور سلطنتوں میں گونجتا ہے۔"

روڈلف کریہل جس نے ۱۸۶۸ء میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات شائع کئے تھے لکھتا ہے:۔

قرآن میں عقائد۔ اخلاق اور ان کی بنا پر قانون کا مکمل مجموعہ موجود ہے۔ اس میں ایک وسیع جمہوری سلطنت کے ہر

ہر شعبہ کی بنیادیں رکھ دی گئی ہیں۔ عدالت، حربی انتظامات ملیات اور نہایت محتاط قانون غربا وغیرہ کی بنیادیں خدائے واحد کے یقین پر رکھی گئی ہیں۔"

خود بانیٔ پاکستان نے ۱۹۴۳ء میں مہاتما گاندھی کو نامہ حیثیت میں جو خط لکھا تھا۔ اس میں انھوں نے اس حقیقت کا ان الفاظ میں اعتراف کیا۔

"قرآن مسلمانوں کا ضابطۂ حیات ہے۔ اس میں مذہبی، مجلسی، دیوانی، فوجداری، عسکری، تعزیری، معاشی اور معاشرتی، غرض کہ سب شعبوں کے احکام موجود ہیں۔ مذہبی رسوم سے لے کر روزانہ کے امورِ حیات تک روح کی نجات سے لے کر جسم کی صحت تک جماعت کے حقوق سے لے کر فرد کے حقوق و فرائض تک دنیوی زندگی میں جزا و سزا سے لے کر عقبیٰ کی جزا و سزا تک ہر فعل، قول اور حرکت پر مکمل احکام کا مجموعہ ہے۔"

اس سلسلہ میں بعض خود غرضوں کی طرف سے یہ عذر بڑے زور و شور سے پیش کیا جاتا ہے کہ قرآنی دستور کے لئے وہی زمانہ موزوں تھا آج کل کے ذوق و مزاج کو یہ راس نہیں آسکتا۔ یہ تہذیب و تمدن کا زمانہ ہے،

اس کے تقاضے اُس وقت سے بالکل جدا اور مختلف ہیں۔ اس لئے اس پر عمل درآمد ایک ناممکن امر ہے۔ جو ہماری ترقیوں کی راہ میں ایک سنگِ گراں ثابت ہوگا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون!

ایسا کہنا خدا اور اس کے رسول کے واضح احکامات و اعلانات کو جھٹلانا اور ان سے اعلانیہ بغاوت کرنا ہے اور باغی ہر دور اور ہر حکومت میں واجب القتل ٹھہرایا گیا ہے۔ احکم الحاکمین بہت بڑے حلم والا ہے جو ان کو ڈھیل دے رہا ہے مگر یہ نہیں سمجھ رہے۔ اگر آج ان ہی احکام دینیہ کو حکومت اپنی قوتِ قاہرہ سے نافذ کر دے۔ ان کے تارکین پر شرعی سزائیں جاری کر دے۔ تو یہی احکام سب کے مزاج کے موافق ہو سکتے ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ بعض باتوں سے مانتے ہیں۔ اور بعض لاتوں سے ورنہ دنیا میں کوئی کام مشکل نہیں۔ صرف ارادہ و ہمت ہی ہر مشکل کو آسان کر سکتی ہے۔ ایک صاحبِ ایمان سے تو ایسے الفاظ کی کبھی توقع ہی نہیں ہو سکتی۔ جیسے حضرت اسد ملتانی فرماتے ہیں ؎

سر و ساماں ہے عمل ہی سے۔ عمل ایماں سے
صرف ایماں کی کمی ہے۔ سر و ساماں کی نہیں
دل میں ہو اور عمل پر اثر انداز نہ ہو
بات ایماں کی یہ ہے۔ بات یہ ایماں کی نہیں

انسان اس دنیا میں صرف جسم و جان کی پرورش و زیبائش اور
آرام و آسائش کے لئے ہی ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ اس کی بقا کی خاطر
ہر قسم کے جھوٹ۔ فریب اور مکر سے کام لیتا ہے۔ بسا اوقات اس سلسلہ
میں طرح طرح کی مشکلات اور مصائب بھی برداشت کرتا ہے۔ مگر اس
عزیز ترین جان کو عذاب آخرت سے بچانے کی فکر نہیں کرتا حالانکہ
موت قطعیات سے ہے۔ روزِ حساب اور جزا و سزا سے انکار نہیں
ہو سکتا۔ جس کی زندہ مثال بصورت سینما ہر شخص کے سامنے ہے۔
جہاں سال ہا سال کی اپنی کارکردگی کی فلم ایک یا چند گھنٹوں میں
دکھا دیتا ہے۔ اس کے سامنے خود اس کی تصویر بول رہی ہوتی ہے
اور اس کے اعمال پیش کر رہی ہوتی ہے۔

باقی رہا یہ سوال کہ ہمارے ایمان ویسے قوی نہیں۔ ہمارے دل
اتنے مضبوط نہیں۔ ہماری ہمت اتنی بلند نہیں کہ ہم صحابہ کرام جیسے کام کر سکیں
یہ کسی حد تک صحیح ہے۔ مگر ایسے حالات میں بھی خلوصِ نیت اور سعی پیہم
انسان کو اس بلند و بالا مقام پر پہنچا سکتی ہے اور اگر بفرضِ محال وہاں
تک نہ بھی پہنچ سکے۔ تو اس جد و جہد سے جو بھی اچھے نتائج برآمد ہوں گے۔
وہ اجر و ثواب کی میزان میں بقولِ مخبرِ صادق قرونِ اولیٰ کے اعمالِ صالحہ
کے برابر ہی انشاء اللہ وزن میں اتریں گے۔

جب قلیل عمل پر کثیر اجر کی ضمانت اور بشارت موجود ہے پھر اس میں چستی کی بجائے سستی دکھلانی اپنی اس جانِ عزیز پر ظلم کرنا ہے اور اسے اپنے ہاتھوں سے دوزخ کے لپکتے ہوئے شعلوں کی طرف دھکیلنا ہے۔ اگر آپ کسی دوسرے پر رحم و کرم نہیں کرنا چاہتے یا نہیں کر سکتے تو کم از کم اپنی ذاتِ خاص پر ہی رحم کریں اور اسے آخرت کے عذاب سے بچائیں۔

ان ناگفتہ بہ حالات نے اس امر کی تحریک کی کہ اسلاف کے اُن اعمال کی تاریخ جن کو یہ ناممکن العمل سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے سامنے رکھی جائے۔ حق تعالےٰ نے اس کام کی تکمیل کی توفیق بخشی اور فرصت کے لمحات میں بعض کتب کی ورق گردانی سے (جن کی فہرست الگ شامل ہے) علم و عمل کے ایسے بے شمار واقعات سامنے آئے۔ جن کے آئینہ میں ہم اپنی مسخ شدہ اور غیر اسلامی صورت و سیرت بخوبی دیکھ سکتے ہیں۔ اِن کی تفصیل کئی جلدوں کی متحمل تھی۔ مگر بمصداق مشتے نمونہ از خروارے ہر باب میں مختلف زمانہ کے چند ایسے تاریخی حقائق جمع کر کے "داستانِ عمل" کی شکل میں پیش کئے گئے ہیں۔ جن سے ایمان۔ عبرت۔ شوق اور ہمت کے جذبات بیدار ہو سکتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے ان واقعات کو موضوعِ بحث بنانے کی بجائے من وعن مختصر ترین تبصرہ کے

ساتھ قارئین کرام کے غور و فکر کے لئے پیش کر دیا گیا ہے تاکہ ہر شخص ان کی روشنی میں اپنے حالات کا جائزہ لے کہ وہ مسلمان کہلانے کے باوجود اپنے اندر وہ ـــــ خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ جو ہمارے اسلاف کی طرۂ امتیاز تھیں۔

تاریخِ اسلام کے ان زریں اور حیرت انگیز واقعات کو جمع کرتے وقت خلافتِ راشدہ کے دور کو حتی الوسع نظرانداز کرنے کی کوشش کی گئی ہے کیونکہ بقولے وہ تو نیک لوگوں کا زمانہ تھا۔ اسلئے ماسوائے چند واقعات کے جن کی اہمیت کا اندازہ موقعہ و محل کے مطابق بخوبی ہو جائیگا اکثر و بیشتر شواہد عہدِ رسالت و خلافت کے پُر بہار دور کے بعد کے زمانہ سے جمع کئے گئے ہیں۔ تاکہ آپ اندازہ لگا سکیں کہ علم و عمل کے جن راستوں پر آج چلنا ناممکن بنایا جاتا ہے اس پر عہدِ رفتہ کے لوگوں نے اس خوبی سے دوڑ لگائی کہ عقل و فکر حیران و پریشان ہو کر رہ جاتی ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک فرمان ہے۔ کہ

"اللہ اس آدمی کو تر و تازہ رکھے جس نے میری بات سن کر یاد کی۔ پھر اسے ان لوگوں تک پہنچایا جنہوں نے نہ سنی تھی۔ کیونکہ بہت سے مسئلہ جاننے والے بھی پورے سمجھدار نہیں ہوتے اور بسا اوقات لوگ ایک مسئلہ کو ایسے شخص تک پہنچا دیتے ہیں جو ان سے زیادہ سمجھدار ہوتا ہے۔"

اس فرمان کے پیشِ نظر قارئینِ داستانِ عمل سے یہ درخواست ہے کہ داستانِ عمل ان لوگوں کے حالات پر مشتمل ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول مقبول کی باتوں کو عملی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کرتے رہے۔ اسلئے آپ یہ کتاب پڑھنے کے بعد اپنے احباب کو بھی پڑھائیں یا پڑھنے کی ترغیب دیں۔ اور وہ دور واپس لانے کی کوشش کریں۔ جو چنداں مشکل نہیں۔ صرف ہمت کر کے اپنی خواہشات و اغراض کو خدا و رسول کی مرضی و منشار کے تابع بنانے اور ایسے کاموں سے باز رہنے کی ضرورت ہے۔ جن سے وہ منع کرتے ہیں۔ ورنہ

کوئی دنیا میں نہیں اب آسرا تیرے لئے
تو خدا کا ہو کہ ہو جائے خدا تیرے لئے

پھلیک۔ ملتان شہر
۲۰ مارچ ۱۹۵۳ء

احقر العباد
عبدالرحمن خاں

گزر چکی ہے یہ فصلِ بہار ہم پر بھی

(۱)

تعلیم و تربیت

عشق کی تیغِ جگردار اُڑا لی کس نے

علم کے ہاتھ میں خالی ہے نیام اے ساقی

عوام کا علمی شغف

شروع شروع میں مسلمانوں نے علم و عمل کے میدان میں ایسے حیرت انگیز کارنامے دکھلائے کہ دنیا حیران رہ گئی۔ ہر میدان میں اولیت کا سہرا مسلمانوں کے سر رہا جس کام کو بھی انہوں نے سنبھالا اسے معراجِ ترقی پر پہنچا کر چھوڑا ان میں تعلیم عام تھی جس کا اندازہ ان واقعات سے بخوبی ہو سکتا ہے۔

سلیمان بن حرب کے لئے بغداد میں ایک بہت بڑا پلیٹ فارم تیار کرایا گیا تھا جس پر بیٹھ کر وہ املائے حدیث کرایا کرتے تھے۔ اس میں نہ صرف عوام بلکہ امراء و وزراء بھی شریک ہوتے تھے۔ جب شرکائے مجلس املائے حدیث کا تخمینہ لگایا گیا۔ تو چالیس ہزار کے قریب نکلا۔

امام احمد بن حنبلؒ کے اُستاد یزید بن ہارون کے حلقہ درس میں بقول یحییٰ بن ابی طالب کم و بیش ستر ہزار کی حاضری ہوا کرتی تھی۔

خلیفہ معتصم باللہ نے ایک مرتبہ امام عاصم بن علی کی جماعت کا اندازہ کرنے کے لئے اپنا محتسب بھیجا تھا جس کی رپورٹ کے مطابق

اُس میں ایک لاکھ بیس ہزار کی تعداد تھی"۔

تیسری صدی میں تو یہ کیفیت تھی کہ ایک ایک مجلس علمیہ میں دس دس ہزار دواتیں رکھی جاتی تھیں۔ مگر اس کا پتہ نہیں چل سکا۔ کہ ایک دوات کتنوں کے کام آتی تھی۔

امام بخاریؒ کے صرف ایک شاگرد رشید فربری سے نوے ہزار لوگوں نے درس لیا۔

مسلم بن ابراہیم کے بیان کے مطابق انہوں نے صرف بغداد میں آٹھ سو شیوخ سے فن حدیث حاصل کیا۔ اس میں دیگر آئمہ فنون شامل نہیں۔ جن سے وہ فیض یاب ہوتے رہے۔ جب ایک شہر میں ایک فن کے شیخ الحدیث آٹھ سو کی تعداد میں ہوں۔ وہاں طلبار کا اندازہ آپ خود کر لیجئے۔

اُستادوں اور طالب علموں کی اس کثرت کے بعد اُستادوں کے مقام اور شاگردوں کے احترام کا اندازہ اس سے لگا لیجئے۔ کہ جب امام ادب نضر بن شمیل بصرہ سے خراسان جانے لگے۔ تو علم لغت۔ علم عروض اور علم حدیث کے تین ہزار ماہر علمار ان کو شہر سے باہر چھوڑنے کے لئے گئے۔ جنہیں ان کی شاگردی کا فخر حاصل تھا۔

ان واقعات سے اس بات کا آپ خود اندازہ کر لیجئے کہ اُس زمانہ

یہاں تعلیم عام تھی یا آج عام ہے، ایسے حالات میں تو اس معیار پر شاید یورپ اور امریکہ بھی آج پورے نہ اتر سکیں۔ امریکہ میں ایک کتاب حال ہی میں "غیر تعلیم یافتہ" کے نام سے شائع ہوئی ہے جس کی رو سے امریکہ میں دس سال سے زیادہ عمر والے اَن پڑھ اشخاص کی تعداد پچیس ۲۵ لاکھ ہے۔

روس میں گو یورپ اور امریکہ سے تعلیم زیادہ ہے مگر وہاں بھی سو فیصدی آبادی تعلیم یافتہ نہیں۔

مگر مسلمانوں کے دورِ حکومت میں اندلس کی ساڑھے تین کروڑ کی آبادی میں ایک شخص بھی اَن پڑھ نہیں تھا۔

جبکہ ہمارے ہاں تعلیم یافتہ حضرات آٹے میں نمک کے برابر ہیں۔

اُمرا کا علمی ذوق

عوام کے ذوقِ علمی کے ساتھ اُس وقت کے امرا و سلاطین کے علمی شغف کا تذکرہ نہ کرنا بھی شاید ایک ظلم سے کم نہ ہو۔ جو علماء کے فیوضِ دینی و دنیوی سے برابر فیضیاب ہوتے رہے تھے۔

سلطان فخر الدولہ کے وزیر سلطنت ابن عباد علم ادب کے ماہرین سے تھے ایک موقعہ پر ان کو امیر بخارا نے قلمدانِ وزارت سنبھالنے کی پیش کش کی۔ آپ نے اس اعزاز کو قبول کرنے سے معذوری ظاہر کی اور اپنے عذراتِ معذرت میں ایک عذر یہ بھی لکھا کہ

میری کتابوں کے اُٹھانے کے لئے چار سو اونٹوں کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ عام سفر میں صرف علم ادب کی کتابوں کے تیس اونٹ ہمراہ ہوتے ہیں۔

یہ پریس کا زمانہ نہیں تھا۔ کتابیں آجکل کی طرح کوڑیوں کے مول نہیں ملتی تھیں اور نہ ہی آج کل کی طرح بکثرت دستیاب ہوتی تھیں اور

نہ ہی وہ لوگ آج کل کی طرح دوسروں سے مانگ تانگ کر گزارہ کرتے تھے۔ بلکہ ہر ایک کے پاس کتابوں کا اپنا ذخیرہ ہوتا تھا۔

ان واقعات کو مدِنظر رکھ کر اندازہ لگایئے کہ چار سو اونٹوں پر جو کتب لادی جائیں۔ ان کی تعداد اور قیمت کتنی ہوگی؟ جبکہ ایک اونٹ آٹھ من سے بارہ من وزن اُٹھاتا ہے

شخصی یا ذاتی لائبریریوں میں شاید ہی آج کل کوئی ایسی مثال مل سکے۔

اندلس کے مسلمان بادشاہ تو بڑے عالم ہوتے تھے۔ عبدالرحمٰن اول ہشام اول۔ الحکم اول۔ عبدالرحمٰن ثانی۔ الحکم ثانی۔ ہشام ثانی۔ ابن ابی عامر۔ محمد ابوالحسن۔ المزئل اور ابو عبداللہ اپنے اپنے وقت میں درجۂ علماء میں شمار ہوتے تھے۔ انہیں علم سے اتنی ہی محبت ہوتی تھی جتنی آج کل تخت و تاج سے۔ ان کا بہترین رفیق اور بہترین لباس علم ہی تھا۔

بطلیوس کے بادشاہ المظفر اتنے بڑے عالم تھے کہ انہوں نے عربی زبان میں ایک حیرت انگیز انسائیکلوپیڈیا تصنیف کی تھی۔

بدقسمتی سے اب آج کل ایسا ذوق و شوق قریباً ناپید ہے۔

قوتِ حافظہ

حضرت اصمعی۔ ابوعبیدہ۔ ابوبکر نحوی۔ ابوحاتم۔ رازی اور ابوزرعہ عالمِ اسلام میں اپنی غیر معمولی قوتِ حافظہ کی وجہ سے بہت مشہور تھے۔ مگر قرطمہ ان سب سے بازی لے گیا تھا۔ اس کی اپنی ایک ذاتی لائبریری تھی۔ جو سینکڑوں کتابوں سے بھری ہوئی تھی ان کا دعویٰ تھا۔ کہ

"اس لائبریری سے جو کتاب چاہو۔ نکال کر اسکے متن رجحان مجھ سے زبانی سن لو۔"

ایک مرتبہ کسی نے اس کا یہ دعویٰ سن لیا۔ اسے اعتبار نہ آیا۔ وہ قرطمہ کا امتحان لینے کے لئے اس کی لائبریری میں پہنچا۔ اور اس کا امتحان لینا شروع کیا۔ اس کا بیان ہے۔

"کوئی کتاب ایسی نہ ملی۔ جو الاول تا آخر اس کے نوکِ زبان نہ ہو۔"

ایک موقعہ پر امام دارقطنی اوائل عمر میں اسمٰعیل سفار کی مجلس املا میں موجود تھے۔ اُستاد جماعت کو املا لکھا رہے تھے۔ مگر یہ خود ایک کتاب نقل کرنے میں مصروف تھے۔ حاضرین میں سے ایک نے اعتراض کیا۔

"تمہارا سماع کس طرح قابل وثوق ہو سکتا ہے۔ جبکہ تم نقل کتاب میں منہمک ہو؟"

علامہ مذکور نے اس کو جواب دیا۔

"سماع سماع میں بھی تو بہت فرق ہے"

اور پھر اسی معترض سے پوچھا۔

"حضرت آپ تو ہمہ تن متوجہ ہیں۔ یہ فرمایئے کہ اس وقت تک کس قدر احادیث بیان ہوئی ہیں؟"

معترض کو مجموعی تعداد یاد ہی نہ تھی۔ اس لیئے اسے مجبوراً خاموش ہونا پڑا لیکن امام موصوف نے فرمایا۔

"اس وقت تک کل اٹھارہ احادیث املا کرائی گئی ہیں—"

اور ان میں سے ہر ایک کا جداگانہ متن اور اس کی اسناد سب نقطہ بہ نقطہ بیان کر دیں جس سے حاضرین مجلس حیران رہ گئے۔

اس دور میں یہ قوتِ حافظہ کہاں۔ اب تو صرف نصاب کی کتب پر عبور حاصل کرنا طلبار کے لیئے وبالِ جان ہو جاتا ہے۔

انہماکِ مطالعہ

علم ایک ایسا سمندر ہے جس سے کسی کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔

ابن رشد جسے اہل یورپ خدا کی عقل کا مظہر کہتے تھے اور جس کے خلاف کفر کا فتویٰ دیا گیا تھا۔ اپنے علمی مطالعہ میں اتنا منہمک رہتا تھا کہ اس کی تمام عمر میں صرف دو راتیں ایسی گزریں جب یہ مطالعہ سے مجبوراً رُک گیا۔ یہ ایک شادی کی اور دوسری والد کی وفات کی رات تھی۔ ورنہ اس پر تیسری ایسی کوئی رات نہیں آئی جس کو اس نے مطالعہِ کتاب میں صرف نہ کیا ہو۔

امام الادیب ابو العباس ثعلب اپنی عمر کے اکیانوے[۹۱] سال سے گزر رہے تھے۔ ثقلِ سماعت (اونچا سننے) کا عارضہ لاحق تھا۔ ضعیفی کے باوجود نماز باجماعت پڑھنے کے عادی تھے۔ مطالعہ کا ذوق و شوق بڑھاپے کے ساتھ ہی بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک روز آپ نماز جمعہ پڑھ کر اپنے گھر کو آ رہے تھے۔ مگر کتاب ہاتھ میں تھی۔ راستہ میں ہی

مطالعہ کرتے آ رہے تھے۔ اس محویت کے عالم میں آپ کی ایک گھوڑے سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس حادثہ سے بیہوش ہو کر وہیں گر پڑے اور جاں بحق ہو گئے۔

خلیفہ الحکم ثانی کے ذاتی کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن کے حاشیوں پر اس نے اپنے قلمی نوٹ لکھے ہوئے تھے۔ ان میں سے کئی کی شرحیں اس نے خود لکھی تھیں اور بعض پر لمبے لمبے اشارات تحریر کئے تھے جو لاکھوں کتابیں پڑھنے کا عادی ہو۔ اس کی بینائی کا کمزور ہو جانا ایک لازمی امر تھا۔ چنانچہ اخیر عمر میں کثرتِ مطالعہ کے سبب اس کی بینائی نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ مگر ان کے شوقِ مطالعہ میں فرق نہ آیا۔ اور وہ آخری وقت تک نئی نئی کتابیں سنتے رہے۔

اُس زمانہ میں اکثر لوگ اخیر وقت تک طالب علمانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن آج کل کی طالب علمی صرف چند پرچوں میں ایسے نمبروں کے حصول کی کوشش تک محدود رہتی ہے۔ جس سے امتحان میں پاس ہونے کے لئے نمبر مل جائیں۔ اس لئے صحیح قابلیت اور لیاقت پیدا نہیں ہوتی۔ جس کی وجہ سے قحط الرجال ہے۔

نوجوان ماہرین

بوعلی سینا سولہ برس کی عمر میں "عظیم الشان فاضل اور حکیم" بن چکے تھے
امامِ نحو یونس کی کل عمر اٹھارہ سال کی ہوئی ہے جس میں وہ امامِ
نحو بن گئے تھے۔ ان کی بابت ابن خلکان لکھتے ہیں۔
"تمام عمر ان کی شادی نہیں ہوئی۔ اور دمِ آخر تک پیش نظر
بجز طلبِ علم اور مباحثِ علمیہ اور کچھ نہیں رہا۔"
جمال الدین افغانی اٹھارہ برس کی عمر میں فارغ التحصیل ہو گئے
تھے۔ اور نحو۔ بلاغت۔ تاریخ۔ فقہ۔ منطق۔ تصوف۔ فلسفہ طبیعیات
ما بعد الطبیعیات۔ ریاضی۔ طب۔ تشریح الابدان وغیرہ کل اسلامی
علوم و فنون میں انہوں نے منتہیانہ استعداد بہم پہنچائی۔
علامہ صدیبہ نے اپنے چچا رشید الدین کی بابت لکھا ہے۔
"انہوں نے سب سے پہلے قرآن شریف حفظ کیا۔ اسکے
بعد فنِ ریاضی میں تکمیل کی۔ اس کے بعد طب شروع کی اور

مصر میں تقریباً سو رسالہ طب جالینوس کے ازبر یاد کیے
اس کے بعد شفا خانوں میں جا کر عملی دستگاہ حاصل کی۔
اور اس سلسلہ میں فن کحالی یعنی آنکھوں کے متعلق تمام
علوم کی تکمیل کی۔ پھر جراحی میں مشق مہارت کے درجہ کو
پہنچائی اس کے بعد ادب اور فلسفہ شیخ عبد اللطیف بغدادی
سے حاصل کیا۔ اور منطق استاد العلوم صدر الدین منطقی سے
پڑھی۔ انہوں نے نہ صرف اس پر اکتفا کیا۔ بلکہ فن نجوم
میں ابو محمد جعفری سے اور علوم موسیقی میں ابن دحیہ سے
کامل دستگاہ حاصل کی۔ یہ تمام علوم انہوں نے اپنی عمر
کے بیسویں سال میں ختم کر لئے تھے۔ وہ علاوہ دیگر زبانوں
کے ترکی اور فارسی زبانوں سے بھی بخوبی واقف تھے۔
اور فارسی کے اشعار بھی کہتے تھے۔

خلیفہ مستنصر ثانی اپنی عمر کے چھبیس برس میں اپنے زمانہ کے تمام
مروجہ علوم کے ماہر بن چکے تھے۔ یہ مختصر داستان مستقبل کے ہمارے
نونہالوں کے لئے سامان عبرت ہے جو صرف بی اے پر اکتفا کر
لیتے ہیں۔ اور بی اے پاس کرنے میں اس سے بھی زیادہ عمر
لگا دیتے ہیں۔

عاشقانِ علم

پرانے زمانے میں وسائل سفر بالکل محدود تھے۔ مختلف علوم کے حصول کیلئے شائقین علم کو دور دراز مقامات کا سفر طے کرنا پڑتا تھا۔ مگر شوق کی دھن میں ہزاروں میل کا سفر ان کو گراں نہ گزرتا تھا۔

امام دارمی نے طلب حدیث میں حرمین۔ عراق۔ خراسان۔ شام اور مصر کا سفر طے کیا۔

امام بخاری۔ امام ابو حاتم اور امام بغوی نے ہزاروں میلوں کا سفر طے کر کے ان تمام ممالک کی سیاحت کی۔ جہاں جہاں بھی راویانِ حدیث کا پتہ چلا۔

حافظ بن مصرح نے حدیث کی سماعت سعید بن الاعرابی سے مکہ مکرمہ میں۔ بن راشد سے دمشق میں۔ قاسم بن اصبغ سے قرطبہ میں۔ ابن سلیمان سے طرابلس میں۔ محمد سے مصر میں اور دیگر مشائخ سے جدہ۔ رملہ اور بیت المقدس میں جا کر کی۔

ان سے زیادہ ہمت ابوالعباس رازی نے دکھلائی جو ایک مادر زاد نابینا تھے۔ مگر انہیں بھی شوقِ علم نے گھر نہ بیٹھنے دیا۔ احادیثِ نبوی کی سماعت کے شوق میں جو گھر سے نکلے تو بلخ، بخارا، نیشاپور اور بغداد کا سفر طے کیا۔ اور حافظِ حدیث بن کر واپس لوٹے۔

علم خواہ کتنا ہی حاصل کیا جائے۔ اسے ہمیشہ تھوڑا سمجھنا چاہیے لیکن جو شخص محض دنیا کے لئے علم سیکھتا ہے علم اس کے دل میں جگہ نہیں پکڑتا۔ حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ علم کی قیمت ہے۔ اسلئے قیمت لئے بغیر علم کسی کو نہ دیا کرو۔

لوگوں نے پوچھا۔ بھلا علم کی قیمت کیا ہے؟

آپ نے فرمایا۔ اس کا ایسے شخص کے پاس رکھنا جو خوبی کے ساتھ اس کا بار اٹھائے۔ باحفاظت رکھے اور اس کو ضائع نہ کرے۔

یہ خوبیاں انہی لوگوں میں پائی جاتی تھیں۔ علم کو صحیح معنوں میں علم انہی لوگوں نے سمجھا تھا۔ اس کی قدر و حفاظت بھی ایسے ہی لوگ کر سکے جس کی وجہ سے یہ آج ہم تک پہنچا۔

لیکن آج کل علم تجارتی اصولوں پر دنیوی اغراض کے لئے حاصل کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے ہمارے اکثر تعلیم یافتہ نوجوان اخلاق و آداب سے عاری نظر آتے ہیں۔

تصنیف و کتابت

گذشتہ زمانہ میں چھاپہ خانوں کا وجود ہی نہیں تھا۔ اس لئے درسی کتابیں عام کتب خانوں یا یک شالوں سے کسی قیمت پر بھی نہیں ملتی تھیں۔ بلکہ طلبار کو یہ کتابیں خود ہی لکھنی پڑتی تھیں۔ اور اکثر کتابت کا کام انہی سے لیا جاتا تھا۔

علامہ تفتازانی کی تصانیف جب روم میں رائج ہوئیں تو وہ بالکل نایاب تھیں۔ اس کمی کو پورا کرنے کے لئے علامہ شمس الدین نے مدرسہ میں جمعہ اور سہ شنبہ کی تعطیل کے علاوہ دوشنبہ کی تعطیل کا بھی۔ عما فرمایا یہ تمام وقت طلبار کتابت میں صرف کرتے تھے۔

اسی طرح اکثر مصنف اپنی تصنیفات بھی خود ہی تحریر کرتے تھے۔

سبط ابن جوزی کا بیان ہے۔

میں نے اپنے دادا شیخ ابن جوزی کو ممبر پر یہ کہتے ہوئے سنا کہ "میں نے اپنی ان انگلیوں سے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں۔"

یہی شیخ بن جوزی اڑھائی سو کتب کے مصنف اور دو ہزار کتابوں کے کاتب تھے۔ جن قلموں سے وہ کتابتِ حدیث کیا کرتے تھے۔ ان کے تراشے وہ جمع کرتے رہے۔ بالآخر ان کا اتنا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ کہ انکی وفات پر ان کے ایندھن سے ان کے غسلِ میت کا پانی گرم کیا گیا تھا

حضرت یحییٰ بن معین فرماتے ہیں میں نے اپنے ہاتھ سے چھ لاکھ حدیث لکھی ہیں

مفتیِ قسطنطنیہ ابو سعود رومی روزانہ ہزار ہزار خطوط کا جواب خود لکھا کرتے تھے۔ جو خوبیٔ اسلوب اور حسنِ معنی میں ایکدوسرے سے بڑھکر ہوتے تھے

حافظِ حدیث حمیدی میورقی کے شوق کتابت کا یہ حال تھا۔ کہ گرمی کی وجہ سے رات کو پانی میں بیٹھ کر لکھا کرتے تھے۔

حافظ ابن خراث نے جب انتقال کیا تو انہوں نے اٹھارہ صندوق کتابوں کے چھوڑے۔ جن میں اکثر و بیشتر کتب خود انکے ہاتھ کی لکھی ہوئی تھیں

ان لوگوں کی ہمتوں کا ذرا اپنی نازک مزاجیوں سے مقابلہ کیجئے

دورِ حاضرہ میں ہر قسم کا لٹریچر بکثرت ملتا ہے۔ کتابت و طباعت کی آسانیاں موجود ہیں۔ مگر تحقیق و تصنیف کے میدان میں پہلی سی رونق نظر نہیں آتی۔ عافیت پسندی۔ آرام طلبی اور عیش پرستی کی وجہ سے علمی اور عملی معیار روز بروز پست ہوتا چلا جا رہا ہے۔

الوالعزم طالب علم

علامہ سید شریف کو اپنے طالب علمی کے زمانہ میں شوق پیدا ہوا کہ شرح مطالع کو خود اس کے مصنف کے پاس جا کر پڑھا جائے۔ جو ہرات میں مقیم تھے۔

علامہ سید شریف خود خراسان رہتے تھے چنانچہ خراسان سے شرح مطالع کو پڑھنے کے لئے آپ نے ہرات کا سفر اختیار کیا۔

سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے جب آپ ہرات پہنچے۔ تو وہاں جا کر معلوم ہوا کہ شرح مطالع کے مصنف اس قدر ضعیف ہو چکے ہیں کہ ان کے قوائے دماغی صحیح طور پر کام نہیں کرتے۔

بااینہمہ آپ انہیں ملے۔ اور اپنا مطلب ظاہر کیا۔ انہوں نے اس الوالعزم طالب علم کو اپنے شاگرد مبارک شاہ کے پاس جانے کی ہدایت کی۔ جو اُن دنوں قاہرہ میں رہتے تھے۔

سید شریف وہاں سے مصر کے سفر پر پاپیادہ روانہ ہو گئے جب یہ

عالی ہمت ہرات سے مصر پہنچا۔ تو مبارک شاہ نے اِن کے ذوقِ علمی کی قدر کی اور انہیں فوراً اپنی شاگردی میں قبول کر لیا۔ جو وہاں سے علم حاصل کرنے کے بعد اپنے زمانہ کے بلند پایہ عالم ہوئے۔

خراسان سے ہرات اور ہرات سے مصر کی مسافت کا اندازہ لگائیے جبکہ موٹر۔ بس۔ ریل اور ہوائی جہازوں کی سروس نہیں تھی۔ بلکہ یہ سفر پاپیادہ طے کیا گیا تھا۔ جو نا معلوم کتنے عرصہ میں طے ہوا ہو گا۔

کیا آج بھی حصولِ علم کے لئے اس قدر کوشش اور کاوش کہیں نظر آتی ہے؟

قید اور تصنیف

حق تعالیٰ نے جن کو ذوقِ علم و عمل سے نوازا۔ انہیں حکامِ وقت کے ظلم اور جیل کی تنگ و تاریک کوٹھڑیاں بھی قلم کی جولانیاں دکھانے سے نہ روک سکیں۔

حضرت شیخ الرئیس کسی وجہ سے معتوب ہو گئے اور انکی گرفتاری کے احکام صادر کر دیئے گئے۔ یہ خبر سن کر آپ نے ایک عطار کے گھر میں پناہ لی۔ اور تصنیف میں مشغول ہو گئے۔ اس طرح انہوں نے فن طبیعیات اور الٰہیات ختم کر دیئے۔

بالآخر حکام نے ان کو وہاں سے گرفتار کر کے فروجان کے قلعہ میں قید کر دیا۔ وہاں بھی ان کا یہ شغل جاری رہا۔ اور کتاب الہدایات۔ رسالہ حی ابن یقظان اور کتاب قولنج کی مکمل کتب تصنیف کیں۔

اسی طرح شمس الائمہ سرخسی نے علم اصول کی ایک بلند پایہ کتاب تصنیف اپنے زمانہ قید میں خوارزم کے جیل خانہ میں شروع کی۔ اور بعد

رہائی فرغانہ میں اُس کی تکمیل کی۔

ماضی قریب میں بھی اکثر رہنمایانِ قوم نے اپنی بہترین تصانیف قید و بند کے دوران میں ہی تصنیف کیں۔ جن میں ابوالکلام آزاد کی "غبارِ خاطر" اور "کاروانِ خیال"۔ رئیس الاحرار چودھری فضل حق کی "زندگی" اور "آزادیِ ہند" اور شیخ حسام الدین کی انقلاب ۱۸۵۷ء کی تصویر کا دوسرا رخ شامل ہیں۔

اربابِ اقتدار تو اہلِ علم و فضل کو قید و بند میں اس لئے ڈال دیتے ہیں کہ عوام تک ان کی آواز نہ پہنچ سکے۔ مگر یہ نادان اتنا نہیں سمجھتے کہ یہ لوگ ہنگاموں سے دور بیٹھ کر تصنیف و تالیف کے ذریعہ وہ کام کر جاتے ہیں۔ جو ان کی تقریریں بھی نہیں کر سکتیں۔ کیونکہ تقریر کھو جاتی ہے اور اس کا اثر ہنگامی ہوتا ہے۔ تحریر باقی رہتی ہے اور اس کا اثر ان گوشوں تک پہنچا رہتا ہے۔ یہاں تقریر کی آواز کا پہنچنا ناممکن ہوتا ہے۔

شوقِ تحصیلِ علم

نامور شاعر ابوتمام طائی دربارِ خراسان میں حاضری کے لیئے روانہ ہوئے۔ ہمدان پہنچے تو سردی اور برف باری کی وجہ سے تمام راستے مسدود ہو گئے۔ اسلئے آپ کو ایک صاحب کے پاس مجبوراً ٹھیرنا پڑا وہ کوئی صاحب ذوق تھے۔ جن کی ذاتی لائبریری ہزاروں کتابوں پہ مشتمل تھی۔

ابوتمام طائی نے اس وقفہ اور وقت کو غنیمت جان کر انکی لائبریری کا جائزہ لینا شروع کیا۔ اور تمام شعرائے عرب کے دیوانوں سے انتخاب کر کے کتاب "الحماسۃ" تیار کی۔ جو آج کل ادبی دنیا میں ایک مشہور و معروف کتاب مانی جاتی ہے۔

حماسہ کی شرح خطیب تبریزی نے لکھی۔ ایک دفعہ ان کو کہیں سے ابوالمنصور کی تحریر کردہ لغت کی کتابیں دستیاب ہو گئیں۔ بدقسمتی سے یہ شارح ان کے مطالب نہ سمجھ سکے جس کی وجہ سے انہیں بہت پریشانی ہوئی۔

انہوں نے ہماری طرح اس ذخیرۂ کتب کو ردی بنا کر فروخت کرنے کی بجائے ان کے مطالب سمجھنے کی سعی جاری رکھی۔ اور علامہ ابوالعلا معری کا پتہ لگایا۔ جو ان کتابوں کے علم کے ماہر تھے۔ اور ملک شام میں معرّہ کے مقام پر رہتے تھے۔

خطیب نے معرّہ پہنچنے کے لئے کمر ہمت باندھ لی۔ سواری اور باربرداری کا کوئی سامان پاس نہ تھا۔ اسلئے انہوں نے کتابوں کا پشتارہ اپنی پشت پر باندھ لیا اور چل کھڑے ہوئے۔ جب منزلِ مقصود پہ پہنچکر کتابیں اتاریں۔ تو وہ پسینہ سے اس قدر بھیگ چکی تھیں۔ جیسے پانی میں ڈبو کر لائی گئی ہوں۔

مؤلف کا ذوقِ علمی اور شارح کے حصولِ علم کی سعی کی آج کوئی مثال ہے؟

عُسرتِ اِنہماک

امام ابو یوسف حضرت امام اعظمؒ کے سب سے قابل اور سب سے بلند مرتبہ شاگرد تھے جنہوں نے سب سے پہلے امام ابو حنیفہ کے مذہب پر کتابیں لکھ کر ان کی اشاعت کی۔

آپ کا طالب علمی کا زمانہ نہایت افلاس سے گزرا۔ اکثر فقر و فاقہ رہتا۔ بارہا ایسے حالات پیدا ہوئے کہ علمِ دین کے اس مسافر کے قدم طلب علم کی راہ میں ڈگمگا جاتے لیکن افلاس کے مصائب اسکی راہ میں سنگ گراں ثابت نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ ان کے والد انہیں زبردستی ابو حنیفہؒ کے حلقۂ درس سے اٹھا کر لے آئے۔ اسے سمجھایا کہ

"بیٹا ابو حنیفہؒ کو خدا نے رزق کی طرف سے اطمینان دیا ہے۔ تم اس کی ریس کیوں کرتے ہو؟"۔

امام ابو حنیفہ کو جب اس واقعہ کا علم ہوا۔ تو آپ نے ان کی مالی

امداد شروع کردی۔

صاحبِ ہدایہ کے ممتاز شاگرد امام برہان الدین زرنوجی تحریر فرماتے ہیں کہ امام ابو یوسف فقہی مسائل میں ماہرین علم فقہ سے حذاقت اور بشاشت کے ساتھ بحث و مباحثہ کیا کرتے تھے۔ ان کے خسر یہ جان کر کہ یہ پانچ دن سے بھوکے ہیں۔ اور اس پر بھی انکے مباحثہ کی قوت اور نشاط میں کوئی کمی نہیں ہوئی بے حد حیران ہوئے اور تعجب کرتے رہے

اس واقعہ سے اندازہ لگایئے کہ انہوں نے علمِ دین کن مصائب کے عالم میں حاصل کیا۔ ایسے حالات میں آپ کے انہماکِ علم کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ ایک شخص نے آپ سے سوال کیا۔ حضرت آپ علم کے اس بلند مرتبہ پر کس طرح پہنچے۔

آپ نے فرمایا۔ میں نے نہ فائدہ حاصل کرنے میں اعراض کیا اور نہ فائدہ پہنچانے میں بخل کیا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ امراء کے لڑکے علم و عمل میں اس قدر ہمت و کوشش نہیں کرتے جس قدر عام غریب اور بے وسیلہ لڑکے کرتے ہیں۔ کیونکہ امیر زادوں کو والدین کی زر و دولت کاہل و سست بنا دیتی ہے مگر جہد للبقا کے لئے غریبوں کی بے چارگی ہی ان کی چارہ ساز بن کر انہیں آسمانِ شہرت پر پہنچا دیتی ہے۔

تعزیتِ محرومیِ تعلیم

امام ابوالعاس کو تعلیم حاصل کرنے کا از حد شوق تھا۔ جو علم وہ پڑھنا چاہتے تھے۔ اس کے عالم امام قتیبہ بلخ میں رہا کرتے تھے۔ آپ نے اپنی والدہ سے بلخ جا کر تعلیم حاصل کرنے کی اجازت چاہی۔ مگر اوائل عمر۔ طالب علمی کا زمانہ۔ سفر کی مصیبت اور مسافت کی درازی کو پیش نظر رکھتے ہوئے آپ کی والدہ نے آپ کو اپنی آغوشِ شفقت سے دور کرنا پسند نہ کیا۔

وہ یہ زمانہ نہیں تھا۔ کہ اگر والدین کسی کام سے منع کریں۔ تو ان کی پروا کئے بغیر وہ اختیار کر لیا جاتا ہے یا گھر ہی چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مگر امام ابوالعاس اپنی والدہ کے انکار پر چپ ہو گئے اور اطاعت شعاری کی وجہ سے کچھ کہہ نہ سکے۔

آخر فرشتۂ موت نے ابوالعاس سے ان کی والدہ کو چھین کر انہیں اپنی حسرت پوری کرنے کا موقعہ دیا۔ جس کی محبت نے انہیں

پابہ زنجیر کر رکھا تھا۔ وہ دارالبقا کو رخصت ہوئی اور ابو العباس نے بلخ کی راہ پکڑی۔

اتنے دور دراز سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے جب آپ وہاں پہنچے۔ تو

دو چار ہاتھ جبکہ لبِ بام رہ گیا

والا معاملہ پیش آیا۔ والدہ کے انکار کی قدرت نے لاج رکھی اور بیٹے کی نافرمانی کی سزا میں امام قتیبہ کو آغوشِ وقت میں لے لیا۔

اب اس کی محرومِ قسمتی کا اندازہ لگایئے۔ جب تک ماں زندہ رہیں۔ ماں کی محبت اور اطاعت میں گرفتار رہے جب وہاں سے آزاد ہو کر وہاں پہنچے۔ تو قدرت نے محروم رکھا۔ آپ بصد حسرت و ارمان واپس لوٹے۔ اور احباب عرصہ تک اس محرومیٔ علم پر تعزیت کے لئے آتے رہے۔

اُس زمانہ میں تعلیم سے محرومی قابلِ تعزیت سمجھی جاتی تھی۔ مگر آج نہیں۔

علمی سیاحت

عہدِ عثمانی میں سعید بن العاص نے کابل کے بعض سرحدی علاقے فتح کئے۔ اس فتح کے دوران میں جو غلام ان کے حصہ میں آئے ان میں ایک مکحول الدمشقی بھی تھے۔ انہوں نے مکحول کو اپنے پسر عمرو کے حوالے کر دیا۔ عمرو بن سعید بن العاص نے کچھ عرصہ بعد مکحول کو ایک ہذلی شخص کے پاس بیچ دیا۔

اس غلام کو عہدِ غلامی سے ہی تحصیلِ علم کا شوق تھا۔ آزاد ہونے کے بعد اس غرض کے لئے اس نے ساری دنیائے اسلام کا سفر کیا۔ جہاں جہاں بھی انہیں علمی مرکزوں کا پتہ چلا وہاں جا کر تعلیم حاصل کی۔ ان کا اپنا بیان ہے۔

"جب میں آزاد ہوا۔ اس وقت مصر کا سارا علم میں نے سمیٹ لیا۔ اور اس وقت تک میں نے وہاں سے باہر قدم نہیں نکالا جب تک اپنے خیال کے مطابق وہاں کا سارا علم سن نہ لیا۔

مصر کے علمی مخزن کھنگالنے کے بعد مدینہ۔ پھر یہاں سے
عراق آیا۔ ان دونوں مقاموں کے تمام علمی سرچشموں سے
سیراب ہونے کے بعد شام کا سفر کیا۔ اور یہاں علماء اور
اربابِ کمال سے استفادہ کیا۔
غرضیکہ علم کی تلاش وجستجو میں دنیائے اسلام کا چپہ چپہ
چھان مارا اور تمام روئے زمین کا چکر لگایا۔"
مسلمانوں کی غلام نوازی اور فیضِ تربیت کے سبب یہ غلام غلامی
کی پستی سے نکل کر شام کی مسندِ علم پر فائز ہوئے۔ فتویٰ دینے میں
اتنے محتاط تھے کہ اپنی رائے دیتے وقت صاف لکھ دیتے تھے۔
"یہ میری رائے ہے۔ جو صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی"
دید و شنید میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ کیونکہ بسا اوقات راوی
روایت کرتے وقت اپنے خیالات و جذبات کو بھی اس میں شامل
کر دیتا ہے۔ یا ان کے زیرِ اثر حالات بیان کرتا ہے۔ اس لئے
اکثر لوگوں نے حالات کا بچشم خود مطالعہ کرنے کے لئے سیاحت
کی جن میں چوتھی صدی ہجری کے مشہور سیاح مصنف اور جغرافیہ
دان ابن حوقل بھی تھے۔ وہ اپنے شوقِ سیاحت کی نسبت بیان کرتے
ہیں۔

"ابتدائے جوانی سے مجھے اس کا غیر معمولی شوق تھا کہ مختلف ممالک کے حالات کا علم حاصل کروں۔ یہ شوق مجھ میں خود بخود پیدا ہوا۔ اسلئے اُن لوگوں سے جو سیر و سفر میں عموماً رہتے ہیں یا تجارت کے سلسلہ میں ایک ملک سے دوسرے ملک میں ان کی آمد و رفت رہتی ہے۔ ملکوں کے حالات دریافت کیا کرتا تھا۔ جو کچھ کسی سے سن لیتا تھا۔ اسے اچھی طرح ذہن میں محفوظ کر لیتا تھا۔ مگر جب ان روایتوں کو دوسروں کے بیان سے ملاتا۔ تو مجھے ان میں بکثرت تضاد محسوس ہوتا۔ اس لئے میں نے دل ہی دل میں اس عزم کو پختہ کر لیا کہ میں خود ہی سفر کرونگا۔ اور جو خطرات پیش آئیں گے۔ ان کو برداشت کرنے کے لئے اپنے آپ کو تیار کرنے لگا۔ کیونکہ میں کرۂ زمین اور اس کے مختلف حصوں کا ایک صحیح نقشہ تیار کرنا چاہتا تھا۔" ایسے لوگوں کی علمی محنتوں اور کاوشوں سے دنیا آج تک فائدہ اُٹھا رہی ہے۔ اور ان کا نام بھی روشن چلا آتا ہے۔ کیونکہ قربِ علم اوجِ کمال پر پہنچا دیتا ہے۔

---

(۲)

ضبط و نظم

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں

جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا۔ وہ ہنر کیا

ممانعتِ سفارش

عہدِ رسالت میں ایک عورت نے چند گھروں سے انکے دوستوں اور واقفوں کا نام لے کر دھوکا سے زیورات جمع کر کے خورد برد کر لئے۔ پتہ لگنے پر اسے گرفتار کر کے عدالتِ نبوی میں پیش کیا گیا۔ ملزمہ کے رشتہ دار نے آج کل کی طرح سرکارِ دو جہاں کو حضرت اُسامہ بن زید سے سفارش کرائی۔ آپ کے چہرہ مبارک کا رنگ بدل گیا اور فرمایا "تم میرے سامنے حدِ شرعی کے بارے میں سفارش کرتے ہو؟" حضرت اسامہ اس پر نادم ہوئے اور عرض کی "اے رسول اللہ۔ میرے لئے خدا سے معافی مانگ لیجئے۔" اس کے بعد کسی کو سفارش کی جرأت نہ ہوئی اور جرم ثابت ہونے کی وجہ سے اس ملزمہ کے پہونچے کٹوا دئیے گئے۔

اس دور میں سفارش کی وبا انتہا کو پہنچ گئی ہے جس کی وجہ سے جرائم میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ جہاں خود بعض وزرا سفارش کرنے والے ہوں۔ وہاں عدل و انصاف کی کیا توقع ہو سکتی ہے۔

ہاتھ کاٹنے کی سزا

آئینِ اسلام میں چور کے لئے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر ہے جس کے متعلق ایک موقعہ پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"پچھلی امتیں اسلئے بھی ہلاک ہوئیں کہ جب ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کر لیتا۔ تو اسے چھوڑ دیتے اور جب کوئی کمزور آدمی چوری کر لیتا۔ اس پر حد جاری کر دیتے۔ خدا کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ اگر محمدؐ کی بیٹی فاطمہ (خاتونِ جنت) بھی چوری کرے۔ تو اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائیگا"

یہ سزا اس وقت صرف مملکت سعودیہ میں جاری ہے جس کی برکت سے وہاں چوری کا نام و نشان نہیں۔ امن و اماں کا یہ عالم ہے کہ جس کی چیز جہاں گر جائے۔ اسے کوئی ہاتھ تک نہیں لگاتا بعض اوقات خود مالک وہاں سے آکر اٹھاتا ہے یا سپاہی اٹھا کر سرکاری مال خانہ میں داخل کر دیتا ہے۔ جہاں سے اس کا مالک واپس لے جاتا ہے۔

اسی وجہ سے وہاں پولیس اور جیل کا عملہ بہت کم ہے۔ یہاں صرف چوری کی روک تھام کے لئے پولیس کے خاص عملے مقرر ہیں۔ مگر کمی کی بجائے اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ لیکن اس شرعی سزا کو وحشیانہ قرار دے کر نافذ کرنے سے گریز کیا جا رہا ہے۔

ایسی سزاؤں کو بے رحمانہ سفاکانہ اور سنگدلانہ کہنے والوں کے نمائندہ مسز ایلین ہربرٹ سابق ممبر پارلیمنٹ و مشہور اہل قلم نے ماہ فروری ۱۹۵۳ء میں بی۔ بی۔ سی۔ لنڈن سے تقریر کرتے ہوئے اپیل کی کہ سزائے موت دوبارہ رائج کی جاوے اور چوروں نقب زنوں۔ عورتوں کی عصمت پر حملہ کرنے والوں کو سزائے موت دی جاوے اگر انگلستان میں صرف دو سال ان جرائم پر موت کی سزا دی جائے تو ملک سے ان کا نام و نشان مٹ جائے۔

اس سے بڑھ کر حدودِ شرعیہ کی اہمیت کا اعتراف اور کیا ہو سکتا ہے کہ جنہوں نے سزائے موت کو خلاف انسانیت و تہذیب قرار دیکر منسوخ کر دیا تھا۔ آج وہی چوروں اور زانیوں کے لئے یہ سزا چاہ رہے ہیں۔ جن کے لئے اسلام نے صرف سزائے قطع ید اور رجم و تازیانہ مقرر کی ہے۔

سزا اور رعایت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے فرزند عبداللہ اور عبدالرحمٰن مصر میں جہاد کے لئے گئے تھے۔ اسی دوران میں بقول ابن جوزی عبدالرحمٰن بن عمرؓ نے تاڑی پی لی جس سے نشہ ہو گیا۔ نشہ اُترنے کے بعد وہ اپنے اس فعل پر نادم ہوئے۔ اور خود کو امیر مصر عمرو بن عاصؓ کے پاس حد سزا جاری کرنے کیلئے پیش کر دیا۔ انہوں نے ان پر اپنے مکان کے اندر حد جاری کی۔

پرچہ نویسوں (خفیہ پولیس) نے اس واقعہ کی اطلاع حضرت عمرؓ تک پہنچائی کہ ان سے نرمی برتی گئی ہے۔ حد مجمع عام میں جاری نہیں کی گئی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے عمرو بن عاص کی جواب طلبی کی اور اپنے لڑکے کو بھی واپس بلا بھیجا۔ عمرو بن عاص نے ان کے لڑکے کو ان کی خدمت میں روانہ کر دیا اور ایک معذرت نامہ میں جواب طلبی کے متعلق لکھا۔

"میں نے ان کو اپنے صحن کے اندر اسلئے حد ماری کہ خدا کی

قسم جس سے بڑی کوئی قسم نہیں۔ میں اپنے گھر کے صحن میں بھی ہر مسلمان اور ذمی کو حد مارتا ہوں"

جس وقت عبدالرحمٰن آپ کی خدمت میں پہنچے۔ تو آپ نے ان پر مجمع عام میں حد جاری کی۔ جو اولاد کی لغزش پر تادیبًا ماری گئی۔ کیونکہ حد شرعی پہلے جاری ہو چکی تھی۔ حد شرعی کے بعد انہیں قید کر دیا۔ اولین حد شرعی نڈھال طویل اونٹ کے سفر کی کوفت۔ پھر باپ کی بیتر نے عبدالرحمٰن کو بیمار کر دیا۔ وہ چند یوم بعد عالم بقا کو سدھار گئے۔ بعض روایات کی رو سے انہوں نے اسی وقت جان دیدی۔ بہرحال یہ امر متفق ہے کہ ان پر دوبارہ مجمع عام میں حد جاری کی گئی۔ جس کے بعد وہ فوت ہو گئے ان کی فوتیدگی کے بعد حضرت عمرؓ نے اپنے بیٹے کا سر گود میں رکھا اور شفقت پدری سے رو پڑے۔

حضرت عمرؓ سخت گیر بیان کئے جاتے ہیں۔ اُس وقت بھی بعض لوگ انکی انتظامی سختی سے نالاں تھے کہ یہ جرائم کی پاداش میں حد جاری کرتے وقت کسی کی عظمت وشان کی قطعًا پرواہ نہیں کرتے۔ جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اس معاملہ میں وہ اپنے عزیز و اقارب سے بھی رعایت نہیں کرتے تو خاموش ہو گئے۔ جب تک قانون کو شخصیتوں سے بالاتر نہ سمجھا جائے۔ ملک میں اس کا وقار قائم نہیں رہ سکتا۔

انصاف کی بھینٹ

قرطبہ یونیورسٹی کا گریجویٹ محمد ابن ابی عامر شاہی محل کے سامنے بیٹھ کر لوگوں کی عرضیاں لکھا کرتا تھا۔ قاضیٔ شہر نے اس کی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے اپنے محکمہ میں ملازم رکھ دیا۔ کچھ عرصہ بعد خلیفہ الحکم کے نابالغ لڑکے عبدالرحمٰن اور ملکہ سیدہ صبح کی جاگیر کا ناظم مقرر ہوا۔ اور اس دیانت سے کام کیا کہ سات ماہ کے اندر جاگیر کی آمدنی دگنی ہو گئی۔

بادشاہ الحکم اور وزیر اعظم مصحفی اس کی کارکردگی سے اتنے خوش ہوئے کہ اسے شاہی ٹکسال کا مہتمم مقرر کر دیا۔ ٹکسال ہاتھ میں ہونے کے سبب اس نے لوگوں کو اتنا خوش کیا کہ معمولی آدمی سے لے کر بادشاہ تک اس کے گن گانے لگے۔ دشمنوں نے خیانت کا الزام لگا کر اس پر محتسب مقرر کرا دیا۔ مگر حساب میں ایک پائی کی بھی بددیانتی نہ پائی گئی۔ اس پر اسے یہ اعزاز ملا۔ کہ بیک وقت اشبیلیہ اور لبلہ کا قاضی مقرر کر دیا۔ پھر قرطبہ کا گورنر ہوا اور بالآخر منصور کے لقب

سے تختِ شاہی پر جا بیٹھا۔

اس نے قرطبہ کی گورنری کا چارج لیتے ہی پولیس افسران کو چیلنج دیا کہ جس کسی نے مجرموں کی سرپرستی کی اسے عبرت ناک سزا دی جائیگی اس کی اس سخت گیری سے سارا نظام درست ہو گیا اور اتنا امن و امان ہوا کہ لوگ دکانیں کھلی چھوڑ کر سو جاتے مگر کیا مجال کہ کوئی چیز چوری ہو جائے

اسی زمانہ میں اس کے ایک عزیز لڑکے نے اپنے والد کی گورنری کے گھمنڈ میں ایک بچے کو بید مار دیئے۔ ابن ابی عامر تک شکایت پہنچی۔ اس نے بیٹے کو بھری عدالت میں طلب کر کے بید مارنے کی سزا دی اور بید مارنے والے کو حکم دیا کہ خوب زور سے مارنا کہ اسے اور دوسروں کو عبرت ہو۔ ناز و نعم میں پلا ہوا یہ نازک بچہ بیدوں کی سزا کب برداشت کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نے باپ کے سامنے باپ کے حکم کی پاداش میں جان دیدی۔ ابن ابی عامر نے حکم دیا کہ اسکی نعش گھر پہنچا دو عدالت برخواست کر کے جب گھر پہنچا۔ تو اپنے محبوب بچے کی نعش سے لپٹ لپٹ کر رو دیا۔ اور اس کی ماں سے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ بیگم۔ میں باپ بعد میں ہوں اور قاضی پہلے۔ قاضی کی حیثیت سے انصاف کیا۔ باپ کی حیثیت سے رو رہا ہوں۔

اللہ اکبر۔ بچہ قربان کر دیا۔ عدلِ اسلام پر حرف نہ آنے دیا۔

رشوت کی سزا

سلیمان کے وقت اندلس میں کچھ ایسی طوائف الملوکی پھیلی کہ اہلِ قرطبہ نے افریقہ کی حکومت سبتہ کے حاکمِ اعلیٰ علی ابن حمود کو وہاں آنے کی دعوت دی۔

علی ابن حمود سبتہ سے ایک بحری بیڑہ میں منظم فوج لے کر ساحلِ اندلس پر اترا۔ لوگوں نے اس کا بڑا شاندار استقبال کیا۔ بڑھتے بڑھتے جب وہ قرطبہ کے نزدیک پہنچا۔ لوگوں نے اپنے حاکم سلیمان کو اسکے حضور میں اس طرح پیش کیا۔ جیسے کوئی پالتو بھیڑ ہو۔ سلیمان کو فی الواقعہ بھیڑ کی طرح ہی ذبح کر کے علی ابن حمود الناصر الدین اللہ کے لقب سے تخت نشین ہوا

علی ابن حمود نے جس وقت زمامِ اقتدار سنبھالی اس وقت ملک کی حالت بہت خراب تھی۔ ہر طرف بدامنی کا دور دورہ تھا اور رشوت کا بازار گرم تھا۔ علی ابن حمود بڑا ذہین اور اونچے درجہ کا سپہ سالار تھا۔ فوجی مزاج ایسے حالات میں اکثر راس آتا ہے اس نے ملک میں

منادی کرادی کہ جس نے ظلم و زیادتی کی۔ اور دوسروں کا حق مارا۔ اسے خوفناک سزا دی جائے گی۔

ایک مرتبہ ایک فوجی سپاہی گھوڑے پر انگوروں کی ٹوکری لادے جا رہا تھا۔ علی ابن حمود کی اس پر نظر پڑ گئی۔ وہ اسے خوب جانتے تھے اس نے اسے روکا اور پوچھا کہ یہ انگور کہاں سے لئے۔

سپاہی نے بے پروائی سے جواب دیا۔ جہاں سے ایک سپاہی لے سکتا ہے۔ اس جواب نے علی ابن حمود کو آگ بگولا کر دیا۔ اس نے خدام کو حکم دیا۔ اسے گھوڑے سے گھسیٹ کر اس کی گردن اڑا دو۔ اس کا سر اسی انگوروں کی ٹوکری میں رکھ کر سارے شہر میں پھراؤ جبکہ اس کا جسم گھوڑے کی پشت سے بندھا ہو اور لوگوں کو بتا دو کہ یہ اس شخص کی سزا ہے جو رعایا پر ظلم اور زیادتی کریگا۔

گو بظاہر یہ ایک سخت سزا تھی مگر اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پھر کسی کو رشوت لینے اور زیادتی کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں اس ملک کی حالت پر نظر ڈالو کہ انسداد رشوت ستانی کیلئے کس قدر قوانین آرڈیننس وغیرہ نافذ ہیں سپیشل سٹاف مقرر ہیں۔ "پردڈا" تک موجود ہے۔ مگر رشوت اس آزادی سے چل رہی ہے کہ الامان والحفیظ۔

جرأت کا ایک قدم بے جرأتی کی ساری زندگی سے بہتر ہوتا ہے۔

انسدادِ جرائم کا طریق

کسی ملک میں صحیح طور پر امن وامان اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا جب تک کہ امیر سلطنت ذاتی طور پر اس کے لئے اپنے آرام و آسائش کو قربان کر کے دلچسپی نہ لے حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہم کی طرح اور بھی بہت سے شاہان وقت رات کو گشت کر کے عوام کی تکالیف معلوم کرنے اور انہیں رفع کرنے کے عادی تھے۔

ابن عامر جب تک عرضی نویس رہا۔ لوگوں کی شکایتیں دربار شاہی میں تحریر کر کے بھیجتا رہا۔ جب خود تختِ اندلس پر بیٹھا۔ تو اس دور کی یاد اس نے نہ بھلائی۔ اب خود لوگوں کی شکایات معلوم کرنے کے لئے رات کے وقت قرطبہ کی گشت کرتا تھا۔ رات کو اسے سونے کے لئے بہت کم وقت ملتا تھا۔ ایک دن ان کے ایک مصاحب نے ازراہِ ہمدردی کہا۔" اگر لوگوں کے جرائم معلوم کرنے کی یہ عادت اسی طرح جاری رہی تو صحت بگڑ جائیگی۔ رات سونے کیلئے ہے۔ اور دن کام کیلئے "۔

ابن ابی عامر مسکرائے اور جواب دیا جو بادشاہ رات کو سوتا رہتا ہے اس کی رعایا کبھی مطمئن اور محفوظ نہیں رہ سکتی

اسی طرح ابن احمر جب اندلس کی بساطِ سیاست پر جلوہ فگن ہوا تو وہ دوسری مصروفیات کے علاوہ ہر شام اور ہر صبح مختلف ہسپتالوں میں جاتا۔ مریضوں کی تیمارداری کرنے ان کی شکایات معلوم کرنا اور معالجوں کے طریقِ علاج کی جانچ پڑتال کرتا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جونہی کوئی مریض ہسپتال میں داخل ہوتا اس کے معالج فوری توجہ اور پوری دلجمعی سے اس کا علاج اس طرح کرتے جیسے آجکل ڈاکٹر فیس لے کر مکان پر آکر علاج کرتے ہیں جس کی وجہ سے مریض جلد صحتیاب ہو جاتا۔

ہسپتالوں کے علاوہ ابن احمر محتاج خانوں، سرکاری اداروں صنعتی مرکزوں اور درسگاہوں کا معائنہ بھی بڑی پابندی سے خود کرتا۔ تاکہ نظم ونسق کی خرابی کی وجہ سے لوگوں کو تکلیف نہ ہو۔ اس کے وقت ہر شخص کو براہِ راست ان سے شکایت کرنے کا حق حاصل تھا۔

اس خبرگیری کی وجہ سے اُس دور میں ایسا امن وامان قائم ہوا کہ تصوّر میں بھی نہیں لایا جا سکتا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ چور، لٹیرے، بددیانت لوگ وہاں سے ہجرت کر گئے تھے۔ مگر آج کون اپنے آرام کو حرام کر کے دوسروں کے آرام و آسائش کی فکر کرتا ہے۔

رعایا کی خبرگیری

سلطان شہاب الدین غوری نے چھٹی صدی ہجری میں ہندوستان پر چڑھائی کر کے گنگا کے کنارے سے پشاور تک اسلامی سلطنت قائم کی۔ لیکن وہ خود ہندوستان نہ رہا۔ اور اپنے غلام قطب الدین کو نائب السلطنت مقرر کر کے واپس چلا گیا۔ اس غلام بادشاہ نے اس دیانت سے ہندوستان میں اسلامی حکومت کی بنیاد رکھی کہ سات برس تک ہندوستان پر خاندانِ غلاماں کی حکومت رہی۔

خاندان غلاماں سے تین بادشاہ شمس الدین التمش۔ ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن بہت مشہور ہوئے۔ سلطان شمس الدین التمش کی نسبت فوائد السالکین میں لکھا ہے۔

وہ رات کو گدڑی پہن لیتا تھا۔ تاکہ اس کی کسی کو خبر نہ ہو اور کسی شخص کو لے کر باہر نکل جاتا۔ اس کے ہاتھ میں ٹکے کا ایک توشہ ہوتا۔ وہ ہر مسلمان کے دروازہ پر جاتا۔

اس کے حالات پوچھتا۔ اور ان کی مدد کرتا۔ وہاں سے واپس ہوتا۔ تو مسجدوں۔ ویرانوں۔ خانقاہوں اور بازاروں میں گشت کرتا۔ اور ان جگہوں کے رہنے والوں اور درویشوں کو مالی مدد پہنچاتا۔ طرح طرح کی معذرت کر کے کہتا کہ وہ لوگ اس کی مدد کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ دن کو اس کے دربار میں عام اجازت تھی۔ کہ جو مسلمان رات کو فاقہ کرتے ہوں۔ اس کے پاس لائے جائیں جب وہ آتے۔ تو ان میں سے ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دیتا اور ان کو قسمیں دے کر تلقین کرتا۔ کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے۔ یا ان پر کوئی ظلم کرے تو وہ یہاں آ کر عدل و انصاف کی زنجیر کو جو باہر لٹکی ہوئی ہے ہلائیں۔ تاکہ وہ ان کے ساتھ انصاف کر سکے ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی۔"

سبحان اللہ۔ یہ غلام بادشاہ اپنی رعایا کے لئے کتنی برکتوں اور سعادتوں کا موجب تھا۔ اتنی فیاضیوں کے باوجود خزانہ جواہر سے بھرپور تھا۔ رعایا کی خبرگیری کے باوجود روزہ نماز کی فکر ہر وقت دامنگیر

تھی۔ اور ان ہندوؤں کے عہد میں ہر طرح مامون و مصئون تھے۔

اسکے برعکس دورِ حاضرہ کے حکمران ٹیکسوں کے ذریعہ رعایا کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ رہے ہیں۔ مگر بجٹ خسارے میں جا رہے ہیں رعایا بے حال ہے خود خوشحالی سے آرام فرما رہے ہیں۔ سمجھ نہیں آتی کہ بروزِ قیامت جس بوجھ کے اٹھانے سے اسلام کے جلیل القدر دینداد بادشاہ اس قدر گھبراتے تھے۔ اسے اُٹھانے کی ان کو کیسے ہمت ہو رہی ہے۔ اسمبلیوں میں تو ممبروں کے سوالات کی بوچھاڑ سے "مفادِ عامہ" کی آڑ لے کر اکثر جواب دہی سے پہلو تہی کرتے ہیں بخیر نہیں۔ وہاں کیلئے کون سا حربہ تیار کر رکھا ہے۔ ان کی عاقبت کوشیاں ملک میں جرائم کے اضافہ کا موجب ہو رہی ہیں اور کہیں بھی سکون و اطمینان نظر نہیں آتا۔

---

(۳)

سخاوت و خدمت

خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ
نہیں ممکن امیری بے فقیری

خدمتِ ہمسایہ

امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ منصبِ خلافت پر فائز ہونے سے قبل خود اپنی بکریاں چرایا کرتے تھے اور خود ہی دودھ دوہ لیا کرتے تھے۔ آپ صرف اسی پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے۔ بلکہ اہلِ محلہ کی بکریوں کا دودھ بھی ہر ایک کے گھر جا کر مفت دوہ دیتے تھے۔

جس دن آپ کے خلیفۃ المسلمین ہونے کا اعلان ہوا محلہ کی ایک لڑکی نے پریشان ہو کر پوچھا۔

"اب ہماری بکریاں کون دوہا کرے گا"

آپ نے فرمایا

"میں تمہاری بکریوں کا دودھ برابر دوہتا رہوں گا۔ یہاں تک کہ میں مر جاؤں"

چنانچہ آپ اخیر وقت تک یہ خدمت انجام دیتے رہے۔ اب ایسا دورِ بے نیازی آیا ہے کہ ایک ہمسایہ کو دوسرے کی خبر نہیں ہوتی کہ اس پہ کیا گزر رہی ہے۔

امیر کی خبر گیری

مدینہ منورہ کے ایک گوشہ میں ایک نابینا بڑھیا رہتی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ روزانہ صبح سویرے اس کے گھر جاتے تھے۔ اس کے تمام کام کر آتے تھے۔

ایک دفعہ حسب معمول جب آپ وہاں پہنچے۔ تو دیکھا کہ جس کام کے لئے وہ آیا کرتے تھے۔ وہ کام کوئی دوسرا شخص کر گیا ہے۔ آپ واپس چلے آئے۔ مگر روز یہی ایسا ہونے لگا۔ اس خدمتِ خلق سے محرومی کا آپ کو بہت رنج ہوا۔ آپ نے اس شخص کا پتہ لگانے کی کوشش کی۔ مگر کچھ کامیابی نہ ہوئی۔

اس نووارد خادم کا پتہ لگانے کے لئے ایک دن آپ بہت ہی سویرے اُٹھے۔ بڑھیا کے مکان کے قریب پہنچ کر ایک محفوظ جگہ پر چھپ کر کھڑے ہو گئے اور اس کا انتظار کرنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد وہ نیا خدمت گزار آیا۔ اور بڑھیا کے تمام ضروری کام کر کے

واپس چلا گیا۔ حضرت عمرؓ اسے پہچان کر حیران رہ گئے۔ کیونکہ یہ خلیفہ اول حضرت صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ تھے۔ جنہوں نے خلیفہ بننے کے بعد غریبوں اور محتاجوں کی خبر گیری اپنے ذاتی فرائض میں شامل کر لی تھی۔

آج کسی میں بھی ہمدردی و غمخواری کا یہ جذبہ نظر نہیں آتا۔ دورِ حاضر کے امرائے سلطنت اور وزرائے مملکت عوام سے بہت دور محلوں اور بنگلوں میں سنگینوں کے پہروں کے اندر رہتے ہیں۔ جہاں محتاجوں اور مظلوموں کی آہ و فغاں نہیں پہنچ سکتی۔ جو خود اپنی حفاظت کے لئے دوسروں کے محتاج ہوں وہ محتاجوں کی جا کر کیا خبر گیری کر سکتے ہیں حکام اور اہلکاران قانوناً "پبلک سرونٹس" یعنی خادمِ خلق کہلاتے ہیں جس کی باقاعدہ تنخواہ لیتے ہیں مگر وہ بھی "جذبہ خدمت" کے تحت اپنے فرائضِ منصبی ادا نہیں کرتے۔

فیاض مجاہد

عامر بن عبداللہ ان علماء سے تھے جنہوں نے بساطِ علم تہ کرکے عبادت و ریاضت، یادِ الٰہی اور تزکیہ نفس کو مقصودِ حیات بنا لیا تھا اتنے وسیع انقلاب تھے کہ اپنے دشمنوں کے لئے بھی دعائیں کرتے تھے۔ شادی اس لئے نہ کرتے تھے کہ

"مجھ میں نہ نشاط و امنگ ہے اور نہ مال و دولت ایسی حالت میں میں کیوں کسی مسلمان عورت کو دھوکا دوں"

ترکِ دنیا کے باعث اُمتِ محمدیہ کے راہب کہلاتے تھے۔

بہت بڑے مخیر اور فیاض تھے۔ آپ کو دو ہزار وظیفہ ملتا تھا۔ جس وقت وہ یہ وظیفہ لیتے۔ اسی وقت اسے مستحقین میں تقسیم کرنا شروع کر دیتے تھے اور گھر پہنچنے تک وہ تمام ختم کر دیتے تھے۔

گوشہ نشینی کے باوجود آپ اکثر اسلامی مہمات میں فریضہ جہاد ادا کرنے کے لئے بھی شامل ہوتے تھے۔ مگر میدانِ جنگ میں

جانے سے قبل آپ اپنے مزاج کے مطابق رفیق تلاش کرتے تھے جب وہ مل جاتے تو ان کے سامنے مندرجہ ذیل شرائط پیش کرتے۔

۱۔ میں تمہارا مؤذن رہوں گا۔

۲۔ میں ہی تمہاری خدمت گذاری کروں گا۔ اس میں کوئی خلل اندازی نہ کرے۔

۳۔ اپنی حیثیت و استطاعت کے مطابق تمہارا خرچ اپنی جیب خاص سے کرونگا۔

جو آپ کی یہ شرائط قبول کر لیتا۔ اسے اپنے ہمراہ کر لیتے۔ اور جو ذرا بھی حیل و حجت کرتا اسے چھوڑ دیتے۔

شرائط طے ہو جانے کے بعد جب آپ جہاد کے لئے روانہ ہوتے۔ تو اپنی سواری پر دوسرے مجاہدین کو بھی باری باری سوار کرتے ملاحظہ ہو اسلامی "راہب" بھی کتنے ہمہ صفت موصوف تھے۔

سخاوت کے مظاہرے

بدنام حجاج بن یوسف کی جس شخص نے ہندہ بنت اسمار کے ساتھ شادی کرائی تھی۔ اسے حجاج نے تیس غلام اور تیس لونڈیاں بخشش دی تھیں۔ ہر غلام کو دس ہزار فرانک اور ہر کنیز کو کپڑوں اور سامان سے بھرا ہوا صندوق دیا گیا تھا۔

حضرت سعد بن وقاص جس شخص کو کسی غلام کے ہاتھ تحفہ بھیجتے تھے۔ تو تحفہ کے ساتھ تحفہ لانے والا غلام بھی بخش دیا کرتے تھے۔ واضح رہے کہ اس وقت غلام ہزاروں روپوں میں بکا کرتے تھے۔

ہارون رشید کا استاد یحییٰ بن خالد برمکی جو بعد میں وزارت کے منصب تک پہنچا جس وقت سوار ہوا کرتا تھا۔ اس وقت جو کوئی سامنے آجاتا اسے دو سو فرانک عنایت کرتا تھا۔ اس کی لڑکی کی شادی میں ایک سو آدمی شریک ہوئے تھے اس نے ہر ایک کو پانچ سو گنی اور ایک چاندی کی سینی دی تھی۔

ایک دفعہ اس نے منذر ابن مغیرہ دمشقی کو ایک لاکھ درہم۔ پانچ ہزار گنی۔ سازوسامان سے آراستہ پیراستہ مکان۔ اور ایک زرعی ٹکڑہ ہبہ کر دیا تھا۔ اس کے لڑکے جعفر نے چھ تین گنیاں مختلف لوگوں کے انعامات۔ عطیات اور وظائف کے لئے وقف کر رکھی تھیں جن کا نام بھی لکھا ہوا اس تھیلی میں موجود تھا جس میں سے یہ رقم نکلی۔

ولید بن یزید شاعروں کو ہر ایک شعر پر ایک ہزار درہم دیا کرتا تھا خالد بن ولید نے ایک شاعر کو چار اشعار کے عوض چار ہزار درہم انعام دئیے تھے۔

عباسی خلیفہ المتوکل قصیدہ کے ہر شعر پر پانچ سو اشرفیاں انعام دیا کرتا تھا۔ بلکہ عباسی خلفاء میں تو یہ رواج ہو گیا تھا کہ وہ ہر ایک قصیدہ کے عوض ایک لاکھ درہم انعام دیا کرتے تھے۔ ان کے صرف انعامات و عطیات کی تعداد دس تین درہم ہوا کرتی تھی۔

اس طرح بے دریغ دولت لٹانے کے باوجود خزانہ پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ اور نہ ہی رعایا کی خوشحالی میں کوئی فرق آتا تھا۔ اس وقت آج کل کی طرح رعایا پر کوئی ناجائز یا بھاری ٹیکس عائد نہ تھے۔ اب تو انعام و اکرام کی بجائے جودوسخا کی کہانیاں ہی سننے میں آتی ہیں۔

مصرفِ خزانہ

جس وقت الظاہر بامراللہ خلیفہ مقرر ہوئے۔ آپ کی عمر باون سال تھی۔ بقول سبط ابن جوزی اس کا والد الناصرالدین اللہ سربمہر کا غذات کا ایک بنڈل اور بھرا ہوا خزانہ چھوڑ مرا تھا۔ الظاہر بامراللہ نے خلافت سنبھالتے ہی خزانہ کا منہ کھول دیا۔ اور جی بھر کر اسے فی سبیل اللہ خرچ کرنے لگا۔

لوگوں نے کہا۔

"امیرالمومنین جس فراخی سے آپ خرچ کر رہے ہیں۔ ایسا تو پہلے کسی نے نہیں کیا۔ ذرا سوچ سمجھ کر خرچ کیجئے۔ خزانہ خالی ہو رہا ہے۔"

خلیفہ نے جواب دیا۔

"میں نے شام پڑے دکان کھولی ہے۔ خبر نہیں کتنی زندگی باقی ہے۔ مجھے فی سبیل اللہ خرچ کرنا آتا ہے۔ جمع کرنا

سوداگروں کا کام ہے۔ اسلئے مجھے کچھ نیکیاں کر لینے دو۔"

لوگوں نے عرض کی۔

"آپ فتوحات کی طرف قدم بڑھائیں۔"

خلیفہ نے کہا۔

"کھیت سوکھ چکا ہے۔ مجھ میں اب کیا رکھا ہے۔ جو عصر کے بعد دکان کھول کر بیٹھے وہ کیا کمائیگا؟"

پھر ان سے کہا گیا۔

"آپ اس سربمہر دفتر کو کھول کر کیوں نہیں دیکھتے۔ جو آپ کی رہنمائی کے لئے آپ کے والد چھوڑ گئے ہیں۔"

خلیفہ نے جواب دیا۔

"اس کو کھول کر کیا دیکھوں۔ اس میں کسی نہ کسی کی چغلی ہی ہوگی۔"

خزانہ کے اس طرح راہِ خدا میں لٹانے ٹیکسوں کے اضافے منسوخ کرنے۔ مستحقین کو کثیر عطیات دینے کے باوجود کاروبارِ سلطنت میں کوئی مالی بحران پیدا نہ ہوا تھا۔ اور رعایا بھی بہت خوشحال و ممنونِ احسان تھی۔

مہمان نوازیاں

چوتھی صدی ہجری میں ماوراءالنہر کے اکثر علاقوں میں صاحب جائداد لوگوں کو اس بات کا عام شوق تھا۔ کہ مہمانوں کے لئے بڑا کشادہ ہوادار مکان تعمیر کریں۔ وہ مہمان خانہ کو سازوسامان سے درست کرنے اس کے سجانے اور مرتب کرنے کے مشغلے میں لگے رہتے تھے جونہی کہیں سے کوئی مسافر یا مہمان آتا۔ اسے اپنے ہاں ٹھہرانے پر اکثر ایک دوسرے سے الجھ پڑتے تھے۔

جب مسافر پہنچتا۔ خواہ وہ واقف ہو یا ناواقف۔ اس کے کھانے پینے۔ اوڑھنے بچھونے کا اس طور انتظام کر دیا جاتا۔ کہ اسے اپنا سامان کھولنے کی قطعًا ضرورت نہ پڑتی۔ مہمان نوازی کے تمام سازوسامان عمومًا تیار رہتے۔ جس گھر میں کوئی مہمان یا مسافر اترتا۔ اسے ایسا محسوس ہوتا۔ جیسے وہ اپنے گھر میں پہنچا ہے۔

بسا اوقات ایسا بھی ہوتا کہ اچانک بغیر کسی اطلاع کے سو سو

ڈیڑھ ڈیڑھ سو آدمی بلکہ اس سے بھی زیادہ اپنے اپنے جانوروں۔ سواریوں ساز و سامان اور نوکر چاکر سمیت رات کو پہنچتے۔ مگر اہل خانہ گرانی محسوس نہ کرتے۔ نہ صرف مسافروں کے لئے تمام انتظامات ہو جاتے بلکہ ان کے جانوروں تک کے لئے کافی گھاس۔ چارہ۔ دانہ بہم پہنچایا جاتا یہ سارا انتظام اتنی آسانی سے ہو جاتا کہ خود صاحب مکان کو کوئی غیر معمولی دشواری پیش نہ آتی۔ ایسے مسافروں کی مختلف ضروریات کے لئے مختلف خدام مقرر ہوتے تھے جنہیں اپنے فرائض کا بذاتِ خود علم ہوتا تھا۔ اور کسی کو ہدایت دینے کی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

میزبان کا صرف اتنا کام ہوتا تھا کہ مہمان سے خندہ پیشانی سے ملتا جلتا رہے۔ اور کسی کو یہ محسوس نہ ہونے دے۔ کہ میزبان کسی کے ساتھ کوئی خاص ترجیحی سلوک کرتا ہے۔ ہر شخص سے ایک جیسا برتاؤ بلا معاوضہ کیا جاتا۔

آج کل کے لوگ جس طرح روپیہ پیسہ جمع کرنے کی دُھن میں لگے رہتے ہیں۔ وہ اسے خرچ کرنے کے درپے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اُس وقت مہمان کو رحمت سمجھا جاتا تھا۔ اور آج اکثر اسے زحمت سمجھتے ہیں۔

خیرِ مجسم

بدورانِ سیاحت ابن حوقل جب خراسان پہنچے اس کی ملاقات حارث بن افریقیون کے کاتب (سیکرٹری) جعفر بن سہل سے ہوئی۔ وہ بذاتِ خود بھی رئیس تھا۔ اس نے اپنے تمام مواضعات میں جہاں جہاں بھی اسکی جاگیریں تھیں۔ پردیسیوں اور مسافروں کے آرام و آسائش کے لئے بڑی بڑی سرائیں کھول رکھی تھیں جس علاقہ میں سرائے ہوتی اس علاقہ کی آمدنی کا ایک حصہ اس سرائے کے مصارف کے لئے وقف ہوتا۔ اس کے ہر گاؤں اور ہر سرائے کے لئے اسکی ذاتی ضرورتوں کے علاوہ تین یا سو سے اوپر گائیں صرف اس مقصد کے لئے رہتی تھیں۔ کہ ان کے دودھ سے راہگیروں اور آنے جانے والوں کی تواضع کی جائے۔ صرف دودھ ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ دوسرے کھانے بھی موجود ہوتے جو ان مسافروں کی ضرورت کیلئے کافی ہوتے گرمیوں میں اس کی تمام سراؤں میں دہی اور لسی کا انتظام ہوتا۔

اس انتظام کے لیئے قوّام یعنی منیجر یا داروغہ مقرر تھے جنہیں حکم تھا کہ جو شخص بھی اس کی جاگیر سے گذرے۔ اُسکی انتہائی اخلاق اور مہربانی کے ساتھ مذکورہ اشیاء سے تواضع کی جائے۔ ابن حوقل لکھتا ہے:-

"پچاس سال کی مدت میں ایسا شاید کوئی آدمی ہو گا۔ جو خراسان پہنچا ہو۔ اور اس امیر کے بذل و نوال سے مستفید نہ ہوا ہو۔ یا کوئی احسان کسی نہ کسی طریقہ سے اس پر اس امیر کی طرف سے نہ ہوا ہو۔ بلکہ اس شخص نے تو بعض ایسی مخفی تدبیریں بھی اختیار کر رکھی تھیں۔ جن کے ذریعہ سے ان لوگوں کو بھی فائدہ پہنچتا جنھوں نے اس شخص تک پہنچنے اور رسائی حاصل کرنے کی کوشش بھی نہ کی ہو۔ اور اپنی حاجت کسی طریقہ سے بھی اس پر ظاہر نہ کی ہو۔"

یہ کسی بادشاہ یا وزیر کا ذکر نہیں۔ ایک عام شہری امیر کی فیاضی کا حال ہے۔ جس کی مثال اس زمانہ میں چراغ لے کر ڈھونڈنے سے بھی ملنی ناممکن بلکہ محال ہے پھر یہ واحد مثال اس شخص کی نہیں بلکہ بقول ابن حوقل

"صرف ماوراءالنہر میں دس ہزار سے اوپر ایسی سرائیں تھیں"

سٹالن کا مولد

طفلس (روس کے ڈکٹیٹر کا مولد ہے) کے لوگ عموماً سنی المذہب اور قدیم روش کے پابند تھے۔ علم حدیث سے ان کو خاص شغف اور تعلق تھا۔ یہ محدثین کا خصوصاً اور اہلِ علم و ادب کا عموماً بڑا احترام کرتے تھے ان کو بھی پردیسیوں اور مسافروں سے خاص اُنس تھا۔

نوجوان جہاں گشت ابن حوقل جب اس شہر میں پہنچا۔ تو کسی وجہ سے قسم کھالی کہ میں اس شہر میں کسی کا مہمان نہ بنوں گا۔ اس کی قسم کا بعض معززینِ شہر کو علم ہو گیا۔ انہوں نے فوراً اپنے امیر کے گھر پر ایک خاص اجلاس بلایا۔ جس میں قاضیِ شہر نے شرکت کی۔ اور ابن حوقل کو بھی مدعو کیا گیا۔

قاضی نے گفتگو کی ابتدا کرتے ہوئے ابن حوقل سے کہا۔

"ہم نے اپنے بڑے بوڑھوں کو جب سے دیکھا ہے ان کے رسم و رواج کو ہم جانتے ہیں۔ وہ یہی ہے کہ ہمارے شہر

ہیں یہ نہیں ہوسکتا کہ مسافر اور مسافر کے نوکر چاکر اپنے طور پر اتریں۔ جو صورت ہم پیش کر رہے ہیں۔ اگر تم اس پر راضی نہیں ہو۔ تو پھر تمہارا ہمارے ہاں سے کوچ کر جانا بہتر ہے تاکہ تم کو دیکھ دیکھ کر ہم لوگوں کو جو تکلیف ہوتی رہے گی۔ اس سے تو ہم محفوظ ہو جائیں گے۔ باقی قسم کا جو عذر تم پیش کرتے ہو۔ مسلمانوں کے یہاں قسم کا کفارہ بھی تو دیا جا سکتا ہے۔ ہم تمہاری طرف سے کفارہ ادا کریں گے۔"

یہ اس شہر کا حال ہے جو آج "آہنی دیوار" کے اندر بند ہے جہاں کسی مسافر اور پردیسی کا گزر اس کی قید یا موت کا باعث ہوتا ہے۔ پرانے زمانے میں ہوٹلوں۔ ریسٹورانوں کا اسی لئے رواج نہ تھا کہ قریباً ہر مسلمان کا گھر مہمان خانے کا کام دیتا تھا۔ اس مفلس تمدن نے اس ضرب المثل مہمان نوازی کا بھی خاتمہ کر کے چھوڑا۔ آج جس بڑے سے شہر میں چلے جاؤ۔ پرائے تو کیا اپنے واقف بھی اول تو آنکھ بچا کر نکل جاتے ہیں۔ اگر ملتے بھی ہیں۔ تو عملی نہ سہی رسمی دعوت کے بھی روادار نہیں ہوتے۔

سنوسی زاویے

باہمت مسلمانوں نے صرف میدانی علاقہ کو ہی نہیں بلکہ صحرائے افریقہ تک کو باغ و بہار بنا رکھا تھا۔ یہاں ہزاروں میلوں تک سنوسی قبائل نے "زاویئے" قائم کر رکھے تھے۔ جو اس لق ودق صحرا میں مسافروں راہگیروں۔ فقیروں اور محتاجوں کی پناہ گاہوں کا کام دیتے تھے۔ آنے جانے والوں کا یہی زاویئے ٹھکانہ ہوتے۔ جو مسافر۔ راہگیر فقیر یا محتاج ان زاویوں میں اترتے۔ وہ جتنا عرصہ یہاں چاہتے بطور مہمان رہ سکتے تھے۔ اور ان سے کوئی تعرض نہ کیا جاتا تھا۔

جنگ طرابلس کے دوران میں غازی انور پاشا کے رفیق امیر شکیب ارسلان نے بچشم خود ان کا مشاہدہ کیا وہ لکھتے ہیں :-

"تقریباً ہر قبیلہ میں ایک زاویہ ہے۔ زاویہ کے متعلق آس پاس کی زمینیں ہوتی ہیں۔ ان زاویوں کے قیام کیلئے اس علاقہ کا بہترین حصہ منتخب کیا جاتا۔ زمین اس مقام کی

عموماً زرخیز ہوتی ہے۔ اس میں بڑے گہرے عمیق کنوئیں
بنے ہوتے ہیں۔ جن کا پانی ختم نہیں ہو سکتا۔ جہاں جہاں
یہ زاویئے ہیں۔ ان سنوسی درویشوں نے اس مقام کو باغ و
بہار بنا رکھا ہے۔ میں اپنے سفر کے سلسلہ میں شاید کسی زاویہ
سے نہیں گزرا۔ جس کے متعلق میں نے کسی باغ کو نہ دیکھا
ہو۔ بلکہ بعض زاویوں سے اطراف میں تو متعدد باغ اور
بساتین نظر آئیں۔ ان باغوں میں ہر قسم کے فواکہ اور پھل
کو میں نے پایا۔ اور ان ہی کے ساتھ اطراف کی زمینوں
میں طرح طرح کی سبزیاں۔ ترکاریاں لہلہا رہی تھیں صحرا
میں یہ نظارہ بڑا نزہت انگیز اور کیف آور تھا"
مسلمانوں کے عروج و اقبال کا ایک سبب یہ تھا جس کی تعین
کے ہر اس جگہ نشان ملتے ہیں۔ جہاں جہاں مسلمانوں کے قدم پہنچے۔ یہ
سب انتظامات جماعتی نہیں بلکہ انفرادی ہوتے تھے ـــــ آج کل کے
منظّم اداروں کی طرح پہلے کام نہ ہوتا تھا۔ بلکہ ہر امیر و غریب خدمتِ خلق
کا بذاتِ خود دلدادہ تھا۔ اور آج جتنے ادارے ہیں۔ وہ اس لحاظ سے
سب کے سب ہی ناکارہ ہیں۔

رضاکارانہ خدمت

چوتھی صدی ہجری کا ذکر ہے کہ طرابلس کے ساحلی علاقہ میں سخت تیز و تند ہوائیں چلا کرتی تھیں جن کی وجہ سے سمندر میں ہر وقت تلاطم سا برپا رہتا تھا۔ اسلئے جب بھی کوئی جہاز باہر سے آتا۔ اسے یہاں لنگر انداز ہونے میں سخت دقت کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔

اہل شہر نے جہاز رانوں کی اس تکلیف کا کما حقہ احساس کرتے ہوئے اس بات کا محض شوقیہ طور پر انتظام کر رکھا تھا۔ کہ جس وقت کسی جہاز کو بندرگاہ کے قریب آتا دیکھتے فوراً اپنی ذاتی کشتیوں اور جہازوں میں بیٹھ کر اس جہاز کے پاس پہنچ جاتے۔ اسے لنگر انداز ہونے کے لئے جن رسوں کی ضرورت ہوتی۔ یہ اس کی طرف پھینکتے اور اسے اس وقت کے لحاظ سے مناسب جگہ پر لنگر انداز کرا دیتے۔

یہ لوگ اس خدمت کا کوئی معاوضہ نہ لیتے تھے۔ ہر ایک اس

سلسلہ میں سبقت حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا اور اس خدمت کو آج کل کی طرح زحمت نہ سمجھا جاتا تھا۔ پردیسیوں اور مسافروں کی خدمت کا یہ قابل قدر جذبہ ان کا جزوِ زندگی بن چکا تھا۔ وہ یہ خدمت بڑے شوق سے سر انجام دیتے اور اس میں بہت لطف محسوس کرتے۔

مگر آج خدمتِ خلق تو ایک طرف رہی مسافر کو راہ دکھانا بھی کسرِ شان سمجھا جاتا ہے۔

حالانکہ خدمتِ خلق ایک ایسی عبادت ہے جس کے لئے انبیاء اولیاء صدیقین اور صالحین علماء اور فضلا پیش پیش رہتے تھے۔ جس پر حکیم الامت علامہ اقبالؒ ان الفاظ میں اپنی حسرت کا اظہار کر گئے ہیں ؎

خدا کے بندے تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے
میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

مصارفِ خیر

آج کل دولت جمع کرنے کا زیادہ رجحان پایا جاتا ہے۔ مگر ماضی میں لوگوں کو زیادہ دولت خرچ کرنے کا زیادہ شوق تھا۔

امام لیث مصری کی سالانہ آمدنی اسّی ہزار اشرفیاں یعنی آٹھ لاکھ روپیہ تھی۔ مگر ان پر کبھی زکوٰۃ واجب نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ سال کے اختتام سے پہلے پہلے وہ اپنی آمدنی مصارفِ خیر پر خرچ کر دیتے تھے۔

امام ابوالہیثم اپنے زمانہ میں بہت بڑے مالدار تھے۔ آپ نے تین چار دفعہ اپنے ہم وزن چاندی خیرات کی تھی۔

حافظ ابن العربی کی دولت و سخاوت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنی آمدنی کا کل روپیہ نیک کاموں میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔ اندلس کے شہر اشبیلیہ کی تمام شہر پناہ انہوں نے اپنے ذاتی خرچ سے تیار کرائی تھی۔

دارقطنی کے استاد امام دعلج بغدادی عراق اور سجستان کے تمام

علمائے حدیث کو وظائف دیا کرتے تھے۔ مگر اس خرچ کثیر کے باوجود انہوں نے تیس ہزار اشرفی سے مکہ مکرمہ میں ایک مکان خریدا۔ اور تین لاکھ اشرفیاں ترکہ میں چھوڑیں۔

یہ حضرات طبقۂ امراء سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بلکہ بوریا نشین علمائے دین تھے۔ جنہوں نے دولت ایسے سرمایۂ غفلت و غرور کو خیر و برکت میں بدل دیا تھا۔ دولت فی نفسہ بری نہیں اس کا استعمال اسے اچھا یا برا بنا دیتا ہے۔

دولت کو جمع کر کے چھوڑ جانے والا دنیا سے حسرت کے ساتھ جاتا ہے۔ مگر دولت کما کر راہ خدا میں خرچ کرنے والا اگلی دنیا میں اپنا تمام سرمایہ بمع منافع محفوظ پاتا ہے۔

مصارفِ اوقاف

عہدِ اسلامی کے مصارفِ اوقاف نہایت ہی عجیب وغریب ہوتے تھے۔ آٹھویں صدی ہجری کے سیاح ابن بطوطہ کے بیان کے مطابق دمشق میں ایک وقف صرف اس لئے قائم تھا کہ اگر کسی غلام سے کوئی چینی کا برتن ٹوٹ جاتا۔ تو فوراً غلام کی طرف سے اس برتن کا معاوضہ برتن ہی کی شکل میں اس کے مالک کے پیش کر دیا جاتا تھا۔ تاکہ غلام مالک کے عتاب سے محفوظ رہے۔ اس غرض کیلئے ہر سال اس وقف میں چینی کے ظروف کا کافی ذخیرہ محفوظ رکھا جاتا تھا۔

ٹیونس کے ساحلی علاقہ میں ایک خاص موسم میں خاص قسم کی مچھلیاں نمایاں ہوتی تھیں۔ جو اپنی لذت کا جواب نہ رکھتی تھیں۔ اتنی گراں فروخت ہوتی تھیں کہ ہر شخص اسے خرید نہ کر سکتا تھا۔ اس طرح اکثر لوگ اس کی لذت سے محروم وناآشنا رہ جاتے تھے۔ ٹیونس کے ایک امیر نے اپنی جائداد اسلئے وقف کر رکھی تھی کہ اس کی آمدنی سے

یہ موسمی مچھلیاں خرید کر غربا کو بھی مہیا کی جاویں۔

بعض علاقوں میں وقف کا صرف یہ مصرف تھا کہ جب غربا کی لڑکیوں کی شادی ہوتی۔ اس موقعہ پر جہیز وغیرہ یا دوسرا ضروری سامان مہیا کیا جاتا تھا۔

بعضوں نے ایسی مسلمان عورتوں کے لئے جن کے پاس زیور نہ ہوتے تھے۔ ان کو عاریتہً ضرورت کے وقت زیورات مہیا کرنے کے لئے اوقاف قائم کئے ہوئے تھے۔

مراکش میں ایک اور لطیف وقف اس مقصد سے قائم کیا گیا کہ اگر کسی وجہ سے میاں بیوی کے درمیان کوئی تنازعہ پیدا ہو جائے جس کی وجہ سے بیوی روٹھ کر خاوند کے گھر سے چلی جاوے تو اس بیوی کے اس وقت تک کے تمام مصارف اس وقف سے ادا کئے جاتے تھے جب تک کہ باہمی صلح سے بیوی اپنے خاوند کے گھر نہ چلی جاتی تھی بلکہ ان کی رہائش کے لئے مراکش میں ایک مکان بھی بنا ہوا تھا جسے دار الدقہ کہتے تھے۔

یہاں ایک بڑا وقف مجنوں اور دیوانوں کی خبر گیری اور موسم سرما میں غربا میں گرم کپڑے تقسیم کرنے کے لئے بھی موجود تھا۔

ایک دوسرے وقف کی طرف سے ایک بہت بڑا مکان بنا ہوا

تھا جس میں چھ ہزار اندھے پناہ گزین تھے۔ جن کے کھانے پینے پہننے اور دیگر تمام ضرورتوں کا یہی وقف کفیل تھا۔

ٹیونس میں بعض اوقاف صرف بچوں کے ختنوں کیلئے مخصوص تھے

مکہ معظمہ میں ایک وقف اسلئے قائم کیا گیا تھا کہ تقریبات کے موقعہ پر فرش فروش کا انتظام کیا کرتا تھا۔

یہاں ایک اور شخص نے ایک وقف اس لئے قائم کیا ہوا تھا کہ کتوں کو شہر مکہ میں داخل نہ ہونے دیا جائے۔ یہ وسیع انتظام تمام تر وقف کی آمدنی سے ہوتا تھا۔

ان واقعات سے مسلمانوں کی وسعتِ نظر کا اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملی زندگی کا کوئی گوشہ ان کی نظر سے اوجھل نہ تھا۔ جہاں جس قسم کی کمی پاتے۔ اسے فوراً پورا کر دیتے۔ آج کل کے اکثر اوقاف صرف متولیوں کی ذاتی ضروریات اور سامانِ عیش کے ہی کفیل نظر آتے ہیں۔

---

(۴)

خُلق و تواضع

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تو اگر سمجھے۔ تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

اخلاقِ کریمانہ

گورنر مصر عمرو بن عاصؓ کو جب اسکندریہ کی فتح کی خبر پہنچی۔ انہوں نے اسکندریہ جانے کی تیاری کی۔ ضروری سامان سفر تیار ہونے پر آپ نے اپنا خیمہ بھی اکھاڑنے کا حکم دیا۔ سپاہی خیمہ اکھاڑ رہے تھے۔ کہ آپ کی نظر خیمہ کے اندر ایک گھونسلہ پر پڑی جو ایک کبوتر کا آشیانہ تھا۔

آپ نے اس پر نظر پڑتے ہی سپاہیوں کو خیمہ اکھاڑنے سے روک دیا اور فرمایا کہ اس خیمہ کو نہ گراؤ تا کہ ہمارے مہمان کو تکلیف نہ ہو۔ اور صرف ایک کبوتر کے آرام و آسائش کے پیش نظر اسے بے گھر نہ کرنے کیلئے یہ خیمہ وہاں چھوڑ دیا گیا۔ عربی میں خیمہ کو فسطاط کہتے ہیں۔ آپ نے واپسی پر اس جگہ شہر تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ جس کا نام کبوتر کے اس خیمہ کی نسبت سے فسطاط مشہور ہو گیا۔ جو آج تک مسلمانوں کے حسن اخلاق کی گواہی دے رہا ہے۔ آہ! اس زمانہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں پرندے مامون تھے۔ آج مسلمان بھی محفوظ نہیں۔

امیری اور برتری

خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ایک رات رجاء بن حیوۃ سے گفتگو فرما رہے تھے۔ دفعتہً چراغ جھلملانے لگا۔ اس وقت پہلو میں ایک ملازم بھی سو رہا تھا۔ رجاء نے کہا۔

"اس کو جگا دوں؟"

فرمایا۔

"نہیں اسے سوتے رہنے دو۔"

انہوں نے کہا۔

"میں خود اُٹھ کر چراغ کو ٹھیک کر دیتا ہوں۔"

فرمانے لگے۔

"مہمان سے کام لینا مروت کے خلاف ہے۔"

آپ چادر رکھ کر خود ہی اُٹھے۔ برتن سے زیتون کا تیل نکال کر چراغ میں ڈالا۔ اسے ٹھیک کر کے پلٹے تو فرمایا۔

جب میں اُٹھا تھا۔ تب بھی عمر بن عبدالعزیز تھا۔ جب بیٹھا ہوں تب بھی عمر بن عبدالعزیز ہوں"۔

ایک اور موقعہ پر ایک لونڈی آپ کو پنکھا کر رہی تھی کہ اسی حالت میں اس کی آنکھ لگ گئی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اس کے ہاتھ سے آہستہ آہستہ پنکھا لے لیا۔ اور لونڈی کو جھلتے رہے۔ اسے ہوا پہنچنے سے ذرا لطف آ گیا۔ کافی دیر سوئی رہی۔ اور خلیفہ وقت پنکھا کرتے رہے۔ جب وہ جاگی تو اس نے شور کیا۔ حضور یہ کیا۔ مجھے معاف کیجئے۔ فرمایا۔

"تو بھی میری طرح ایک انسان ہے۔ میری طرح تجھے بھی گرمی محسوس ہوتی ہے اسلئے میں نے چاہا کہ جس طرح تو نے مجھے پنکھا جھلا ہے۔ میں بھی تجھے پنکھا جھل دوں"۔

اسی تواضع اور فروتنی کا اثر تھا کہ جو انہیں نہیں جانتے تھے۔ وہ ان کو اس وقت تک نہ پہچان سکتے تھے جب تک کہ ہاتھ لگا کر نہ بتلایا جاتا تھا کہ یہ امیرالمومنین ہیں۔

بادشاہوں کا ملازموں سے روزانہ جو "سلوک" ہوتا ہے۔ اس کو ایک طرف رکھئے۔ کیا تاریخ اقوام عالم کوئی ایک نظیر بھی ایسی پیش کر سکتی ہے؟ ہرگز نہیں یہ اسلام کی شان ہے جسکے امیر السلطنت خود کو اپنے نوکروں سے برتر نہیں سمجھتے تھے۔

احترامِ حقوق

ہشام بن عبد الرحمٰن تختِ اندلس پر تیس سال کی عمر میں رونق افروز ہوا۔ اس نے رعایا کی فارغ البالی اور خوشحالی کو ہی اپنا مقصدِ زندگی بنا لیا تھا۔ وہ اپنی ذات پر بہت کم خرچ کرتا تھا۔ زیادہ تر علماء کی صحبت میں رہتا۔ رات بھر شہر کی گلیوں اور کوچوں میں پھر کر لوگوں کی ضروریات معلوم کر کے ان کی حاجت روائی کرتا۔ جن تک خود نہ پہنچ سکتا۔ ان کو اپنے پاس بلاتا۔ یہ اپنے وقت میں "العادل" کے نام سے مشہور ہوا۔

ہشام پہلا بادشاہ تھا جو ایک ادنیٰ مزدور کی طرح اپنے والد کی بنا کردہ جامع مسجد کی تعمیر میں روزانہ کام کرتا تھا۔ اس نے ایسے آدمی مقرر کر رکھے تھے جو صوبوں میں پھر کر عدالتوں، خزانوں کا محاسبہ کرتے تعلیم گاہوں ہسپتالوں اور دوسرے رفاہِ عام کے اداروں کا جائزہ لیتے رہتے تھے تاکہ ملک میں کہیں ناانصافی اور ظلم و ستم نہ ہو سکے۔

اس کے ملک میں نہ کوئی مفلس رہا۔ اور نہ کوئی محتاج۔ نہ مظلوم رہا اور نہ بیکس۔ جو حاکم خود ظالم نہ ہو وہ دوسروں کو بھی ظلم نہیں کرنے دیتا۔ وہ جب تک خود رعایا کے حقوق کی پاسبانی نہ کرے۔ رعایا ایک دوسرے کے حقوق کی حفاظت نہیں کرسکتی۔ ایک بار خلیفہ کو سرکاری ضرورت کے لئے ایک مکان خریدنے کی ضرورت پڑی۔ اس نے ایک اچھا سا مکان خریدنے کے لئے تلاش کیا۔ کچھ دنوں کے بعد اسے پتہ چلا کہ اس مکان پر اس کے ایک ہمسایہ کا حقِ شفع ہے۔ جسے اس نے خریدنے کی خواہش ترک نہیں کی مگر اس وجہ سے اپنا جائز و شرعی حق حاصل کرنے سے محروم ہے کہ یہ مکان خود شہنشاہِ وقت خریدنا چاہتا ہے ہشام نے یہ مکان خریدنے سے انکار کر دیا جس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کا دورِ حکومت خلافتِ راشدہ کے کس قدر قریب تھا

اس دور میں یہ حالت ہے کہ حکومت بعض اوقات اپنے حکام و اہلکاران کیلئے خود مکانات تعمیر کرنے کی بجائے بعض قوانین کی رو سے رعایا کے مکانات اپنے تصرف میں لے لیتی ہے جس سے بعض لوگوں کو تکلیف پہنچتی ہے

دوسروں کے حقوق کی حفاظت و ادائگی کا احساس بھی ایک عبادت ہے۔ جبکہ اس زمانہ میں دوسروں کے جائز حقوق غصب کرنے میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کی جاتی ہے۔

استاد اور شاگرد

اگلے زمانوں میں استاد اور شاگرد کے باہمی تعلقات اور ادب و آداب اس درجہ پہنچے ہوئے تھے۔ کہ انسان انہیں پڑھ کر انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

استاد شاگردوں کی عزت اپنے درجہ ومقام سے بڑھ کر کرتے تھے اور شاگرد استادوں کے لئے فرشِ راہ بنے رہتے تھے۔

محمد بن فضل کا بیان ہے۔

"ایک دفعہ امام ابو حنیفہؒ ایک حدیث کی تحقیق کے لئے اپنے استاد خضیب کے پاس گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ خضیب نے ان کو آتے دیکھا۔ تو اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اور نہایت تعظیم کے ساتھ لاکر اپنے برابر بٹھایا۔"

اُستاد نے اپنے قابلِ فخر شاگرد کا جس طرح ادب و احترام کیا۔ اس کو زیرِ نظر رکھتے ہوئے اب یہ دیکھئے کہ امام ابو حنیفہ بذاتِ خود اپنے

سے چھوٹوں کے ساتھ کس خلق و تواضع سے پیش آتے تھے۔

امام مالکؒ امام ابو حنیفہؒ سے تیرہ برس عمر میں کم تھے۔ اکثر اوقات انہیں امام ابو حنیفہؒ کے درس میں حاضر ہونے اور احادیث سننے کا اتفاق بھی ہوا۔ لیکن جب یہ ایک دوسرے سے ملتے تھے تو دیکھنے والا دیکھتا تھا۔ کہ

"امام مالک کے سامنے ابو حنیفہؒ اس طرح بیٹھتے تھے جیسے شاگرد اپنے استاد کے سامنے بیٹھتا ہے۔"

اسی طرح امام مالک ان کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے۔

مگر آج سکولوں اور کالجوں کے اندر ادب و احترام کے یہ نظارے نظر نہیں آتے۔ یہاں علم کی قدر کی بجائے بے قدری کی جاتی ہے اور استاد کی عزت پر اس کی بے عزتی کو ترجیح دیکر اس پر فخر کیا جاتا ہے اور اُسے ایک تنخواہ دار مزدور سے زیادہ کچھ نہیں سمجھتے۔

اعترافِ فضیلت

عہدِ گذشتہ میں اربابِ علوم و فنون کے اندر تواضع کا اتنا مادہ پایا جاتا تھا کہ نفس کی خود پسندی ان پر غالب آہی نہیں سکتی تھی۔

جلیل القدر آئمہ اور مشائخ نہ صرف اپنے ہم عصروں کی فضیلت کا اعتراف کشادہ دلی سے کرتے تھے۔ بلکہ بعض اوقات اپنے شاگردوں کی شاگردی کے لئے بھی رشک کرتے تھے۔

امام احمد بن حنبلؒ علم و فضل میں امام ذہلی سے زیادہ مرتبہ رکھتے تھے ایک روز امام ذہلی ان کو ملنے کے لئے تشریف لائے۔ امام احمد بن حنبلؒ ان کی تعظیم کے لئے سروقد کھڑے ہو گئے۔ انہیں نہایت عزت سے اپنے پاس بٹھایا اور ان کے ادب و احترام کا عملی ثبوت یہ دیا کہ اپنے صاحبزادوں اور شاگردوں کو ان کے پاس بھیج دیا کہ وہاں سے سبق لیا کریں۔

اب انہی امام احمد بن حنبلؒ کے متعلق ان کے اُستادِ محترم یحییٰ ابن

معین کی رائے ملاحظہ کیجئے۔ آپ فرماتے ہیں۔

"لوگ یہ چاہتے ہیں کہ میں مثل احمد بن حنبلؒ کے ہو جاؤں۔
لیکن خدا کی قسم میں ان کے رتبہ کو نہیں پا سکتا۔"

یہ رائے ایک استاد کی اپنے شاگرد کی نسبت تھی۔ اب ایک محدثؒ
کی اپنے ہم عصر کے متعلق رائے سنیئے۔ حماد ابن زید اپنے ہمعصر محدث
شعبہ کی نسبت فرماتے ہیں۔

"جب کبھی کسی حدیث میں میری اور شعبہ کی مخالفت ہوتی۔ تو
میں اپنی رائے کو چھوڑ دیتا تھا۔ اور شعبہ کی رائے کو اختیار
کر لیتا ہوں۔ اسلئے کہ وہ اپنے استاد سے ایک حدیث کو
بیس مرتبہ سن کر بھی تسکین نہیں پاتے تھے اور میں صرف
ایک مرتبہ سن کر قناعت کر لیتا تھا۔"

مگر آج تو کسی صاحب علم و فضل کی فضیلت کا اعتراف اپنی شکست
سمجھی جاتی ہے۔

قوم کا سردار

خلیفہ مامون رشید با عظمت بادشاہوں میں شمار ہوتے ہیں۔ آپ حلقۂ احباب میں شاہی جاہ و جلال دکھانے کے عادی نہ تھے۔ دوستوں سے اکثر بے تکلف رہتے تھے۔ یہی وجہ تھی۔ کہ اکثر اہل علم اور ارباب کمال راتوں کو ان کے مہمان ہوتے تھے۔ اور بستر سے بستر لگا کر سوتے تھے۔

ایک رات آپ کے دوست قاضی یحییٰ اکثم آپ کے کمرہ میں سو رہے تھے۔ انہیں پیاس نے ستایا۔ چہرہ سے بے تابی کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ مامون رشید نے ان کو بے چین دیکھ کر وجہ پوچھی۔

قاضی یحییٰ نے کہا

"پیاس لگی ہے"۔

مامون رشید فوراً اُٹھے۔ دوسرے کمرہ سے صراحی اُٹھا لائے اور پیالہ میں پانی لا کر انہیں پلایا۔

قاضی یحییٰ نے کہا۔

"امیرالمومنین۔ نہ آپ نے کسی خادم کو آواز دی۔ نہ غلام کو پکارا"

مامون رشید نے جواب دیا۔

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ

"قوم کا سردار ان کا خادم ہی ہوتا ہے۔"

آج کل تو کسی سردار کو صحیح معنوں میں خدمت کرتے نہیں دیکھا

بلکہ دوسروں سے ہی خدمت لیتے ہیں۔

حقوقِ ہمسایہ

امام اعظم رحمتہ اللہ علیہ کے پڑوس میں ایک یہودی رہتا تھا جس کے گھر کی گندے پانی کی نالی امام صاحب کے مکان کے صحن میں سے ہو کر باہر جاتی تھی۔ اس نالی سے غلاظت اور کوڑا کرکٹ بہتا رہتا تھا جس کی وجہ سے اکثر یہ نالی خراب ہو جاتی اور اَٹ جاتی تھی۔

امام صاحب کو اس نالی کی وجہ سے ازحد تکلیف ہوتی۔ آپ روزانہ اسے جھاڑو سے صاف کراتے رہتے۔ کامل دس سال تک یہی عمل رہا۔ اور امام صاحب کی اس تکلیف کا ہمسایہ کو علم تک نہ ہو سکا۔ اور نہ ہی بوجہ خُلق امام صاحب اپنے ہمسایہ سے اس تکلیف کی شکایت کرنا چاہتے تھے۔

دس سال کے بعد کسی طرح اس یہودی کو امام صاحب کی اس تکلیف کا پتہ چل گیا۔ تو وہ اس قدر شرمندہ ہوا۔ کہ فوراً امام صاحب کی

خدمت میں پہنچ کر طالبِ معافی ہوا۔ امام صاحب نے فرمایا۔
"میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا۔ تم کیوں شرمندہ ہوتے
ہو۔ ہمارے مذہب اسلام میں پڑوسی کے اس سے بھی
زیادہ حقوق ہیں۔ میں نے تو صرف پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم
کے ارشاداتِ پر عمل کیا ہے تمہیں معافی مانگنے کی ضرورت
نہیں۔"

امام صاحب کے ان ارشاداتِ گرامی نے کفر کے تالے کیلئے
ایک چابی کا کام کیا۔ جس سے وہ فوراً کھل گیا۔ اور یہودی امامِ ہمام
کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہو گیا۔

امامِ اعظم کے مقلدوں کو اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیئے کہ
کیا وہ بھی اگر غیر مسلموں سے نہ سہی کم از کم اپنے مسلمان بھائی کے
حقوقِ ہمسائیگی اسی طرح ادا کرتے ہیں؟ ہرگز نہیں بلکہ ہم تو اکثر معمولی
معمولی باتوں پر ان کو دست بگریباں دیکھتے ہیں۔ حالانکہ ہمسایہ کے
حقوق کی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شدت سے تاکید فرمائی
تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ شاید ان کو جائداد وں
اور وراثتوں میں بھی حقدار بنا دیا جائیگا۔

عالمگیر کی معذرت

ملک اور رعایا کے صحیح حالات معلوم کرنے کے لئے واقعہ نگاری اور پرچہ نویسی کے صیغوں کی ابتدا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانہ سے ہوئی۔ ان کے بعد ہر عادل خلیفہ اور بادشاہ نے اس محکمہ کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ وسعت بھی دی۔ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانہ میں بھی یہ محکمہ معتبر و محتاط حکام کے سپرد تھا جس کی وجہ سے برصغیر ہندوستان کے کونے کونے کی خبر عالمگیر کو پہنچتی رہتی تھی اور معمولی سے معمولی واقعہ کا بھی اسے علم ہوتا رہتا تھا وہ اپنے تمام عمال کی کارگزاریوں کی نگرانی انہیں پرچہ نویسوں کے ذریعہ کرتا تھا۔ اس نے شاہی جاہ و جلال شان و شوکت اور ناز و نعم کی بجائے اپنی زندگی رعایا کی خدمت اور راحت رسانی کے لئے وقف کر رکھی تھی۔

۱۰۸۵ھ میں عالمگیر حسن ابدال کے سفر پر روانہ ہوا۔ راستہ میں اسے ایک دن ایک باغ میں قیام کرنا پڑا۔ اس باغ کی دیوار کے نیچے

ایک بڑھیا کا رہائشی مکان اور ایک پن چکی تھی۔ جو باغ کے پانی سے چلتی تھی مغلِ اعظم کے قیام کے دوران میں سرکاری ملازمین نے باغ کا پانی روک لیا جس کی وجہ سے چکی چلنی بند ہوگئی۔

اورنگ زیب کے پرچہ نویس (خفیہ پولیس) نے فوراً اس واقعہ کی اطلاع اورنگ زیب کو پہنچائی۔ انہوں نے اسی وقت پانی کھلوا دیا۔ رات کو جب کھانے پر بیٹھے۔ تو دو قاب کھانے کے اور پانچ اشرفیاں ابوالخیر کو دیں کہ

"یہ اس بڑھیا کو دے آؤ اور میری طرف سے معذرت کرو کہ افسوس ہمارے آنے کی وجہ سے تم کو تکلیف ہوئی تم معاف کر دو۔"

صبح کو پالکی بھیج کر آپ نے بڑھیا کو بلوا کر حرم میں بھیجا۔ عالمگیر کو پتہ چلا کہ بڑھیا کی دو بن بیاہی لڑکیاں اور دو لڑکے ہیں۔ تو دو سو روپے اور عنایت کئے۔ بیگمات نے بھی اسے زر و جواہر سے مالا مال کر دیا۔

دو تین دن کے بعد آپ نے بڑھیا کو پھر بلوایا اور لڑکی کی شادی کے لئے دو ہزار روپے عنایت کئے۔ بیگمات و شہزادوں نے اس بڑھیا پر اشرفیوں کی بارش کی۔ اس طرح چند دنوں میں یہ بڑھیا امیر بن

گئی۔

اورنگ زیب کے ملازموں کے ہاتھوں اس بڑھیا کو جو تکلیف پہنچی۔ اس کی تلافی کے لئے انہوں نے خود معافی بھی مانگی۔ اور نقصان سے کئی گنا زیادہ معاوضہ بھی ادا کیا۔

لیکن اس دور کے اربابِ اختیار سے ایسے حسنِ اخلاق کی توقع محض فریبِ نفس ہوگا۔ اول تو مظلوموں اور ستم رسیدوں کی فریادیں وہاں تک رسائی ہی حاصل نہیں کر سکتیں اگر وہ در و دیوار کو چیرتی ہوئی ان کے گراں گوش تک پہنچ بھی جائیں تو دادرسی کے امکانات مفقود ہوتے ہیں۔ چہ جائیکہ معاوضہ میں انعام و اکرام ملے۔

---

(۵)

محبوبیت و قیمت

ہے زمانہ بھر پہ حاصل حقِ فوقیت تجھے

مالکِ ارض و سما بس اسکی دے ہمت تجھے

ہیبت و عظمت

ولیعہد ہشام بن عبدالملک عمائدینِ شام کے ہمراہ حج پر گیا۔ طواف کے بعد حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لئے کئی بار آگے بڑھا۔ مگر ہجوم کی وجہ سے ہر بار ناکام رہا۔ آخر تھک کر قریب ہی ایک کرسی منگا کر ہجوم کی دھینگا مشتی کا تماشہ کرنے لگا۔

اسی اثنار میں امام زین العابدینؓ طواف سے فارغ ہو کر حجرِ اسود کی طرف بڑھے ان کو دیکھتے ہی لوگ خود بخود ہٹ گئے اور آپ نے اطمینان سے حجرِ اسود کو بوسہ دیا۔ شامی امرا اس واقعہ پر تلملا ئے اور ہشام سے پوچھا یہ کون ہے جس کی لوگوں کے دلوں میں اتنی ہیبت ہے ہشام امام زین العابدینؓ کو جانتا تھا مگر اپنی خفت مٹانے اور ان کی عظمت گھٹانے کے لئے کہا کہ میں انہیں نہیں جانتا۔

عوامی رہنماؤں کی عظمت و وقعت بادشاہوں تک کے لئے باعثِ رشک و حسرت ہوتی ہے۔

مغرور کی بے بسی

حجاج بن یوسف نے بصرہ کے مردِ آہن عبداللہ بن جارود کو حق گوئی کی پاداش میں قتل کرانے کے بعد حکم دیا کہ ان کے اٹھارہ ساتھیوں کے سر کٹوا کر بادشاہِ وقت عبدالملک کے پاس بھیج دیئے جاویں۔

مقتولین میں جلیل القدر صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے ایک صاحبزادے عبداللہ بھی تھے۔ ان کا سر دیکھتے ہی حجاج بن یوسف غصہ سے لال ہو گیا۔ فوراً بصرہ پہنچا۔ حضرتِ انسؓ کا سارا مال لوٹ لیا اور ان کی سخت بے عزتی کی۔

حضرت انسؓ نے اس واقعہ کی اطلاع خلیفہ وقت عبدالملک کو بذریعہ چٹھی بھیجی۔ یہ اطلاع سنتے ہی عبدالملک نے فوراً اس بدسرشت کو خط لکھا۔

"اگر تم نے انسؓ بن مالک سے معافی نہ چاہی تو میں تمہیں معزول

کر کے تمہاری جگہ ایک ایسا آدمی بھیج دونگا۔ جو تمہاری ساری کھیاں نکال دیگا۔"

ابن کثیر کا بیان ہے کہ حجاج اس خط کو پڑھتا جاتا تھا۔ اور اس کا چہرہ متغیر ہوتا جاتا تھا۔ کبھی زرد اور کبھی سرخ۔ مگر اس خط سے اس مغرور انسان کے سر پر بہت بڑی چوٹ لگی۔ اگر اس پر عمل نہ کرتا۔ تو گورنری سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ اسلئے اب حضرت انسؓ سے معافی مانگنے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ مرتا کیا نہ کرتا۔ حضرتِ انسؓ کے درِ دولت پر پہنچا۔ اور انتہائی ذلت کے ساتھ معافی کا خواستگار ہوا۔ جو اس بات کی دلیل تھی کہ صحابہ کی شانِ فوقیت کے مقابلہ میں حکومت کا اقتدار بھی کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

جس پر غرور و غصہ کا اتنا نشہ طاری ہو کہ لاکھوں انسانوں کی گردنیں صرف اسلئے اڑوا دیں کہ ان کا کوئی قول یا فعل اس کی طبع نازک پر گراں گذرا تھا۔ اس کے وقار کے لئے یہ ذلت و رسوائی کوئی معمولی چیز نہ تھی۔ جو اسے اپنی ساری زندگی میں پہلی اور آخری بار اُٹھانی پڑی۔

انسان خواہ کتنے ہی اعلیٰ سے اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے۔ جونہی اسکے سر میں غرور کا سرور سماتا ہے اسے یہ کسی نہ کسی وقت نیچے گرا کے ہی چھوڑتا ہے۔

شہرت و مقبولیت

عبداللہ بن عبدالمبارک عہد رشید یہ میں "امیر المومنین فی الحدیث" کہلاتے تھے۔ انہوں نے چار ہزار شیوخ سے حدیث سیکھی۔ اور ایک ہزار سے روایت کی۔ بقول مشہور محدث امام سفیان ثوریؒ وہ "عالم الشرق والغرب" تھے۔

ان کے فضل و کمال اور زہد و تقویٰ کا شہرہ بہت دور دور تک پھیلا ہوا تھا۔ لوگوں میں ان کی جو مقبولیت تھی۔ بڑے بڑے امراء سلاطین کو بھی حاصل نہ ہو سکی۔

آپ ایک دفعہ رقہ تشریف لے گئے ان کی آمد کی خبر بجلی کی طرح شہر میں دوڑ گئی۔ ہر طرف سے لوگ گروہ در گروہ ان کی خدمت میں پہنچنے لگے۔ کشمکش مسابقت میں لوگوں کی جوتیاں ٹوٹ گئیں۔ ہر طرف گرد چھا گئی۔ اور ہزاروں لوگ ان کے جلو میں نظر آنے لگے۔

اتفاق سے ان دنوں ہارون الرشید بھی رقہ گئے ہوئے تھے

جن کی ایک حرم برج کے غرفہ سے یہ سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔ اس نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا۔

"یہ کیا بات ہے؟"

لوگوں نے کہا۔

"عبداللہ بن المبارک خراسان کا ایک عالم آیا ہوا ہے۔"

بولی

"حقیقت میں سلطنت اسی کا نام ہے۔ ہارون رشید کی حکومت بھی کوئی حکومت ہے کہ پولیس اور سپاہیوں کے بغیر ایک آدمی بھی حاضر نہیں ہو سکتا۔"

وہاں کی حکومت حقیقی حکومت ہے جو کسی کو ہی نصیب ہوتی ہے اور علم کی حکومت تو لازوال ہے۔

حقیقی حکومت

ابوالزناد اُن علمائے کرام سے تھے جو اکابر تابعین کے بعد مسندِ علم پر جلوہ افروز ہوئے تھے۔ گو آپ غلام تھے۔ لیکن اقلیم علم کے تاجدار کہلاتے تھے۔

آپ کا حلقۂ درس و فیض بہت وسیع تھا۔ آپ کے حلقۂ درس میں مختلف علوم و فنون کے ہزاروں طلبار کا ہجوم رہتا تھا۔ مذہبی علوم کے علاوہ علم الحساب کے بھی ماہر تھے۔ اسلئے حکومتِ وقت کے دفاتر کی جانچ پڑتال اکثر ان سے کرائی جاتی تھی۔ بالفاظ دیگر آپ اس وقت کے آڈیٹر جنرل بھی تھے۔

ایک روز آپ مسجد نبوی میں داخل ہوئے تو آپ کے ساتھ صدہا سائلین و طالبین تھے۔ اس اژدہام میں کئی فرائض کے کئی حساب کے۔ کئی حدیث کے۔ کئی معضلات کے۔ کئی فقہ کے اور کئی ادب و انشار کے غرضیکہ مختلف علوم کے سائل موجود تھے۔

عبدیہ بن سعید بھی اس وقت وہاں موجود تھے۔ جنہوں نے اس
جلوس کا نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ ان کا بیان ہے کہ
ابوالزناد طلبا کے ہجوم کے ساتھ شان و شوکت سے مسجد نبوی
میں داخل ہوئے۔ جیسے بادشاہوں کے ساتھ جلوس ہوا
کرتے ہیں"۔
حقیقی حکومت .. صحیح معنوں میں دنیا کے اندر اہل اللہ کی ہوتی ہے
جن کے دروازوں پر فیض علم حاصل کرنے کے لئے بڑے بڑے
بادشاہوں کو سائل کی حیثیت سے آنا پڑتا ہے۔

اقتدار و برتری

مسلمان شروع شروع میں ہندوستان کے ساحلی علاقہ میں آباد ہوئے جو بقول سلیمان تاجر "بلہرا" کے نام سے مشہور تھا۔ یہاں ہندو راجاؤں کی حکمرانی تھیں۔ انہیں اہل عرب یعنی مسلمانوں سے بے حد عقیدت تھی۔ ان کا خیال تھا کہ ان کی حکومت کی مدت اور ان کی عمر کی درازی کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ مسلمانوں سے محبت کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے انہوں نے اپنے عہد حکومت میں مسلمانوں کو بعض ایسے حقوق دے رکھے تھے۔ جو خود اہل ہند کو بھی حاصل نہ تھے۔

بلہرا کی حکومت میں مسلمانوں کا افسر مسلمان ہی ہوتا تھا۔ جسے "ہنرمن" کہتے تھے۔ اسے وہی حیثیت حاصل ہوتی تھی جو اسلامی علاقہ میں قاضی کی ہوتی ہے۔ وہ اسلامی قوانین کی رو سے ان پر حکم لگاتا تھا۔ کیونکہ بقول ابن حوقل :-

"ان تمام علاقوں میں مسلمان کسی حکم اور فیصلہ کو اس وقت تک

تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوتے جب تک ان پر خود مسلمان ہی حاکم نہ ہو۔ ان پر حدود اور سزاؤں کے نفاذ کا یا ان پر شہادت اور گواہی دلانے کا حق مسلمانوں کے سوا کسی دوسرے کو نہیں ہے۔ خواہ اس علاقہ میں مسلمانوں کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو"

عجائب الہند کی ایک روایت کے مطابق اس وقت کے راجوں کے آداب دربار میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ ان کے سامنے ہر ایک کو ایک خاص شکل میں چار زانو ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا۔ اس نشست کا نام انکی اصطلاح میں "برسیلا" تھا۔ اس سے کوئی شخص خواہ وہ کسی رتبہ اور درجہ کا ہو۔ حتیٰ کہ ان کے ملک کے لوگ بھی مستثنیٰ نہ تھے۔ اگر کوئی اس قاعدہ کی خلاف ورزی کرتا۔ تو سزائے جرمانہ کا مستوجب ہوتا۔ مگر ان غیر مسلم راجگان کے سامنے مسلمان جس طرح چاہتے بیٹھ سکتے تھے۔ کیونکہ انہیں اس کی اجازت تھی۔

مسلمانوں کی یہ محبوبیت، یہ اختیار و اقتدار اور یہ فوقیت و برتری محض ان کی خودداری تدبر اور اخلاق کا نتیجہ تھی۔ جو آج مسلمانوں میں عام طور پر مفقود ہے۔

حیرت انگیز شخصیت

سید جمال الدین افغانی حیرت انگیز شخصیت کے مالک تھے وہ اپنے اندر مقناطیسی کشش اور برقی اثر رکھتے تھے۔ حنفی المذہب تھے جہاں جاتے وہیں جبر و استبداد کے خلاف آواز بلند کرتے اور علمائے کرام و مجتہدین عظام کو اسلام کی خاطر اتحاد بین المسلمین کی تلقین کرتے۔ انکے اخلاص کی وجہ سے اپنے تو کیا بیگانے بھی ان کے ارشادات کی تعمیل کو اپنے لئے باعثِ سعادت سمجھتے۔

شاہِ ایران ناصر الدین شاہ نے ایک مرتبہ اپنے ملک کے تمباکو کا اجارہ ایک انگریز کمپنی کو دیدیا۔ سیاسی نکتہ نظر سے سید جمال الدین افغانی نے ملتِ ایران کے لئے یہ معاہدہ نقصان دہ سمجھا کیونکہ یہ قوم اجارہ داری کے راستے سے ہی ملک گیری کی کوششیں شروع کرنے کی عادی ہے۔ اسلئے آپ نے ایران کے مجتہد اعظم حاجی مرزا حسن شیرازی کو اس سلسلہ میں ایک خط لکھا۔

ایران کے اس مجتہدِ اعظم نے ان کے اس خط کی بنا پر فتویٰ صادر کر دیا کہ جب تک شاہِ ایران اس اجارہ کو منسوخ نہ کرے اہل ایران پر تمباکو پینا حرام ہے۔ المنار کے اڈیٹر سید محمد رشید لکھتے ہیں۔

"اس خط نے جناب مجتہدِ اعظم کو جن کا روحانی اثر اہل ایران کے دل پر مستولی ہے ایثارِ نفس اور قومی جوش کی تصویر بنا دیا۔ چنانچہ آپ کا استعمال دکانشت تمباکو کی حرمت کے متعلق فتویٰ جاری فرمانا تھا۔ کہ تمام علمائے ایران نے اپنے اپنے حلقۂ اثر میں اس فتویٰ کو بجلی کی سرعت کے ساتھ نافذ کر دیا۔ لوگوں نے بھی اس کے آگے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ چنانچہ جس شام کو فتویٰ کی اشاعت طہران میں ہوئی۔ اس کی دوسری صبح کو شاہ نے قلیان مانگا۔ تو اُسے یہ جواب ملا۔

محل میں تمباکو کی ایک پتی بھی نہیں ہے۔ سب جلا دیا گیا ہے۔

شاہ نے فرطِ استعجاب سے وجہ دریافت کی تو خدام نے کہا۔

حضرت حجۃ الاسلام حاجی مرزا حسن شیرازی مجتہدِ اعظم نے اس کے استعمال کے خلاف فتویٰ جاری فرمایا ہے۔

شاہ نے کہا۔

اس بارے میں پہلے میری اجازت کیوں نہیں لی گئی

انہوں نے جواب دیا۔

یہ ایک مذہبی معاملہ ہے اس میں اجازت لینے کی ضرورت نہ تھی۔

اس پر شاہ نے طوعاً و کرہاً یہ اجارہ منسوخ کر دیا۔ اور انگریز کمپنی کو پانچ لاکھ پونڈ بطور تاوان ادا کر دیئے"

ایران عرصہ قدیم سے شیعیت کا گھر چلا آرہا ہے۔ وہاں ایک سنی المذہب کے ایک خط کا یہ اثر صاحب خط کی محبوبیت اور اخلاص کا ایک بہت بڑا ثبوت ہے جس سے ہمارے ارباب سیاست کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔ جن کی زندگی اخلاص کے راستہ سے ہٹ کر اغراض کی شاہراہ اختیار کئے ہوئے ہے۔ اسلئے انکی تقریریں سب لے اثر اور تحریریں بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں۔

---

(۶)

جرأت و آزادی

آئینِ جواں مرداں حق گوئی و بیباکی
اللہ کے شیروں کو آتی نہیں روباہی

بیباک تلقین

خلیفہِ وقت مہدی ایک مرتبہ منبر پر کھڑے تقریر کر رہا تھا جب اس نے لوگوں سے یہ کہا کہ اللہ سے ڈرو۔ تو ایک شخص نے اسے ٹوک کر کہا تم خود خدا سے کیوں نہیں ڈرتے سپاہیوں نے اسے گرفتار کر کے مار ڈالنا چاہا۔ مہدی نے انہیں ڈانٹا اور اس شخص کو قریب بلا کر کہا حرامزادے تو ہمیں ٹوکتا ہے۔ اس نے جواب دیا اگر کوئی اور گالی دیتا تو میں اس کے خلاف دعویٰ کر دیتا۔

مہدی نے اس پر طنز کرتے ہوئے کہا تم منبطی معلوم ہوتے ہو اس شخص نے کڑک کر کہا ایسی حالت میں تمہیں زیادہ شرم آنی چاہیئے کہ ایک منبطی خلیفہِ وقت کو خدا سے ڈرنے کی تلقین کرتا ہے۔ مہدی نے شرما کر اسے چھوڑ دیا۔ اگر آج کہیں ایسا واقعہ ہو جائے۔ اسے فوراً گولی مار دی جائے گی یا طویل عرصہ کے لئے جیل میں ڈال دیا جائیگا۔ کیونکہ اب ایسے عالی ظرف کہیں بھی نظر نہیں آتے۔

بے خوف جرأت

حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ اپنے بچپن کے زمانہ میں ایک دن اپنے ہم عمر لڑکوں کے ساتھ کھیل رہے تھے ادھر سے حضرت عمر فاروقؓ کا گذر ہوا۔ ان کو دیکھتے ہی اور تو سب لڑکے ڈر کے مارے بھاگ گئے۔ مگر ابن زبیرؓ اپنی جگہ سے نہ ہلے۔

حضرت عمرؓ نے ابن زبیر کی یہ جرأت دیکھ کر اس سے پوچھا۔

"تم ہمیں دیکھ کر کیوں نہیں بھاگے؟"

ابن زبیر نے بغیر کسی ڈر یا خوف کے فی البدیہہ جواب دیا۔

"میں نے کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ جو بھاگتا۔ نہ راستہ اتنا تنگ تھا کہ آپ کے لئے جگہ چھوڑ دیتا۔"

حضرت عمرؓ یہ جواب سن کر بہت ہی خوش ہوئے۔ ابن زبیر کو سینہ سے لگایا اور اس کی اس بہادری کی بہت تعریف فرمائی۔

بچپن میں یہ دلیری! اور اس کے سامنے جس کی ہیبت سے

قیصر و کسریٰ کانپتے تھے تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔

جس کی لڑکپن میں فاروقِ اعظم عمر بن خطابؓ سے اس طرح باتیں ہوئیں۔ وہ بڑھاپے میں بھی سفاکِ اعظم حجاج بن یوسف سے دو دو ہاتھ ہو گئے۔ ۷۳ برس کی عمر میں اکیلے تن تنہا دس ہزار فوج سے دو دن تک مقابلہ کرتے رہے جس کا خود حجاج کو اعتراف کرنا پڑا۔

حق گوئی کی جرأت اس وقت ہی پیدا ہو سکتی ہے جب انسان کا اپنا دامن ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہو۔

— آج کل تو یہ حالت ہے کہ امیرِ سلطنت تو کیا ضلع کا حاکم بھی اگر کسی عدالت میں چلا جائے۔ تو اکثر افسر صاحبان بھی [illegible] عدالت چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

حُریتِ فکر

حضرت معاویہ بن سفیان مسندِ خلافت پر جلوہ افروز تھے۔ کہ ابو مسلم خولانی تشریف لائے اور ان سے یوں مخاطب ہوئے :-

"السلام علیکم۔ اے مزدور!

حاضرینِ دربار نے اس طرزِ تخاطب کو بُرا محسوس کرتے ہوئے ان سے کہا۔ یہ کیا بے ادبی ہے؟ آپ کو یوں کہنا چاہیئے تھا :-

"السلام علیکم۔ اے امیر المومنین!!"

لیکن ابو مسلم نے اپنے وہی الفاظ دہرائے اور کہا۔

السلام علیکم۔ اے مزدور!!!

حضرت معاویہ حقیقت سمجھ گئے۔ لوگوں کو مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ اور فرمایا۔

"تم ابو مسلم کی بات کو جانے دو۔ یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ خوب سوچ سمجھ کر کہہ رہے ہیں۔"

ابومسلم نے فرمایا۔

"کیا تم اس سے زیادہ کچھ اور ہو کہ خداوند تعالیٰ نے تم کو اجرت پر رعایا کی نگہبانی کیلئے اسی طرح مقرر کیا ہے جس طرح بکریوں کی نگہبانی کے لئے چرواہا۔ مزدور نہ کہوں تو اور کیا کہوں"!

یہ الفاظ کس نے کہلوائے؟ قرآن کے اس اصول واعتقاد نے کہ حکومت اللہ کی امانت ہے اور ہم صرف امین و نگہبان! مگر اس دور کے ارباب حکومت ہیں کہ مختار مطلق بنے ہوئے ہیں جن کی طبع نازک پر معمولی سی راست گفتاری بھی گراں گزرتی ہے۔

کھری کھری باتیں

خلیفہ سلیمان بن عبدالملک اپنے بیٹے ولیعہد ایوب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ عمر بن عبدالعزیز ملنے کے لئے آئے۔ اس اثنا میں ایک شخص نے آکر خلیفہ سے بعض خلفاء کی بیویوں کی وراثت کا مطالبہ کیا۔
سلیمان نے کہا جائیداد میں عورتیں ورثہ نہیں پاتیں۔

خلیفہ کے اس جواب پر عمر بن عبدالعزیز نے حیران ہو کر کہا سبحان اللہ قرآن مجید کہاں ہے؟

سلیمان نے غلام کو بلا کر کہا کہ عبدالملک نے اسکے متعلق جو تحریر لکھی تھی۔ وہ اٹھا لاؤ۔ عمر بن عبدالعزیز نے طنزاً کہا تو گویا آپ قرآن منگوا رہے ہیں ـــــــ؟

ایوب یہ طعنہ سن کر آگ بگولا ہو کر کہنے لگا۔ امیرالمومنین کی خدمت میں اگر کوئی شخص اس قسم کی باتیں کرے گا۔ تو چشم زدن میں گردن اڑا دی جا دے گی۔ عمر بن عبدالعزیز بولے اگر تم خلیفہ ہوئے تو دنیا کو اس

سے بھی زیادہ صدمہ پہنچے گا۔

خلیفہ نے یہ گفتگو سن کر ایوب کو ڈانٹا کہ عمر سے اس قسم کی باتیں کرتے ہو۔ عمر نے کہا ہم نے بھی تو کھری کھری باتیں سنا دی ہیں۔

ایک مرتبہ خلیفہ سلیمان عمر بن عبدالعزیز کے ہمراہ کسی سفر پر جا رہے تھے کہ ایک صحرا میں اس قافلہ کو بادلوں نے گھیر لیا۔ بجلی زور سے چمکنے لگی سلیمان نے گھبرا کر ایک لاکھ درہم عمر بن عبدالعزیز کو خیرات کرنے کیلئے دئے تاکہ اس کی برکت سے رعد و برق کی آفت ٹل جائے۔

عمر بن عبدالعزیز نے کہا اس سے بہتر تو یہ تھا کہ جن لوگوں کی جائدادیں آپ نے غصب کر رکھی ہیں۔ وہ ان کو واپس کر دیتے۔ اس ماحول کی ہیبت نے عمر بن عبدالعزیز کی اس نصیحت کو زیادہ مؤثر بنا دیا۔ اور سلیمان نے ایسے مال مغصوبہ کی واپسی کا عہد کیا اور واپس جا کر مستحقین کو واپس کر دیا۔

سبحان اللہ۔ کیا جرأت و آزادی کا زمانہ تھا۔ کہ امیر سلطنت کو صاف صاف سُنا دی جاتی تھیں اور سننے والے بھی کتنے سلیم الفطرت تھے کہ فوراً اثر پذیر ہوتے تھے۔ آج ایسا کہنے اور سننے کی کس میں ہمت ہے۔

دو سلام

حضرت سعید بن مسیبؒ تابعین میں سب سے بڑا درجہ رکھتے تھے ایک دن آپ مدینہ منورہ کی مسجد میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خبر آئی کہ بادشاہ ولید اموی آرہا ہے۔ خدام نے ان کی آمد کی وجہ سے لوگوں کو مسجد سے نکالنا شروع کر دیا لیکن حضرت سعید بن مسیب نے مسجد سے باہر نکلنے سے یہ کہتے ہوئے صاف انکار کر دیا کہ

"یہ عجیب خلیفہ آیا ہے۔ جو خانۂ خدا میں بھی لوگوں کو نہیں بیٹھنے دیتا اور ان کو باہر نکلوا رہا ہے"۔

اتنے میں خلیفہ مسجد کے دروازہ پر پہنچ گیا۔ پہرہ داروں نے حضرتؓ سعید سے کہا۔

"خلیفہ آتے ہیں۔ سلام کو اُٹھیئے"۔

حضرت سعید چپ کر بولے۔

"خدا کے گھر میں دو کا سلام نہیں ہو سکتا اور نہ مسجد میں امتیاز

کی ضرورت ہے۔ مسجد میں بادشاہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مسلمان کی حیثیت سے آنا چاہیئے"۔

خلیفہ یہ الفاظ سُن کر سنبھلا اور پوچھا۔

"یہ کون ہے"؟

گورنر مدینہ عمر بن عبدالعزیز اس وقت ساتھ تھے جو حضرت سعید کے زہد و ورع کی وجہ سے ان کا بہت احترام کرتے تھے۔ آپ نے کہا۔

"یہ سعید ہیں بصارت میں فرق آگیا ہے۔ حضور کو دیکھتے تو کھڑے ہو جاتے۔ اور سلام کرتے"۔

خلیفہ نے کہا۔

"میں خود ان کے پاس جاتا ہوں"۔

چنانچہ خلیفہ ان کے پاس گیا اور خیریت دریافت کی۔ آپ نے فرمایا۔

"الحمدللہ بخیریت ہوں"۔

جس زمانہ کو بھی چھان ڈالئے۔ اسے حق گو حضرات سے خالی نہ پاؤ گے۔

عمل کی کسوٹی

گورنر بصرہ زیاد بن سفیان نے اپنا پہلا خطبہ ختم کرتے ہوئے اعلان کیا۔

"اگر تم راہِ راست پر آ گئے۔ تو میں تمہارا خادم ہوں۔ میرے دروازے ہر سائل ہر حاجت مند اور ہر شکایت کرنے والے پر کھلے ہیں جس وقت چاہو۔ میرے پاس آؤ میں تمہاری شکایت سنونگا اور تمہارے ساتھ انصاف کروں گا۔"

اس وقت عبداللہ بن اتم جو مصر کے ممتاز لوگوں میں سے تھے۔ بھی موجود تھے انہوں نے یہ اعلان سن کر کہا:

"امیر! میں خدا کو شاہد مان کر کہتا ہوں کہ آپ کو حکمت اور خطابت کے پورے پورے جوہر عطا ہوئے ہیں"۔

زیاد نے جواب دیا۔

"تم جھوٹ بولتے ہو۔ خدا نے یہ خوبیاں حضرت داؤد علیہ السلام

کو بخشش کیجیے۔ میں تو ایک عاجز بندہ ہوں"۔

یہی تقریر احنف نے بھی سنی۔ اس نے خوشامد کرنے کی بجائے صاف کہہ دیا۔

"سردار! آپ نے جتنی باتیں کیں ٹھیک ہیں۔ مگر ہم ابھی ان باتوں کے بارہ میں کچھ نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ابھی ہم نے آپ کی ان باتوں کو عمل کی کسوٹی پر نہیں پرکھا"۔

زیاد اس کی صاف گوئی پر بہت خوش ہوئے اور اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے۔

"میرے دوست! تم نے کتنی سچی بات کہی"۔

مگر آج یہ اسلامی کیرکٹر ناپید ہو چکا ہے۔ ہر جگہ خوشامدیوں کی ہی کثرت نظر آتی ہے۔ جو حکام کا مزاج بگاڑنے کا سبب ہوتے ہیں۔

حق گوئی

۷۵ھ ہجری میں حجاج بن یوسف جب بصرہ و کوفہ کا گورنر مقرر ہو کر وہاں گیا۔ تو اس نے اپنا تعارف ان الفاظ میں کرایا :-

"میں لکڑی کی طرح تمہیں چھیل دونگا۔ اور پھول کی پتیوں کی طرح جھاڑ دوں گا۔ تمہارے جسموں کی بوٹیاں اُڑا دوں گا۔ تمہاری عورتوں کے سہاگ لوٹ لونگا اور تمہارے بچوں کو یتیم کر دونگا"

اس نے وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے یہ کام کیا کہ مصعب کے زمانہ سے ہر سپاہی کو تنخواہ کے ہمراہ جو سو روپیہ زائد ملا کرتا تھا۔ اور جسے عبدالملک نے بھی قائم رکھا تھا۔ اس اضافہ کو ختم کر دیا اور اعلان کیا کہ ہر سپاہی کو وہی تنخواہ دی جائے گی۔ جو مصعب کے زمانہ سے پہلے دی جاتی تھی۔

عبداللہ بن جارود بصرہ کا ایک با اثر آدمی تھا۔ جو اس کی زندگی سے بخوبی واقف تھا۔ مگر اس کے باوجود اس سے رہا نہ گیا۔ اور اس نے حجاج کے اس فعل پر بڑا احتجاج کیا اور حجاج نے اسے جھڑک دیا۔

کئی ماہ بعد حجاج نے پھر تنخواہوں میں اضافہ کی کمی کا ارادہ ظاہر کیا۔ تو اب پھر عبداللہ بن جارود نے اسے ٹوکا جس سے بات بڑھ گئی۔ اور بالآخر اس حق گوئی کی پاداش میں اسے حجاج کی محافظ فوج کے ایک تیر کا نشانہ بننا پڑا جس نے اس کا خاتمہ کر دیا۔

عبداللہ بن جارود اس کی بدطینتی سے بے خبر نہ تھا۔ مگر اس نے اپنی زندگی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اُس ظالم کے فرمان کو جھٹلایا جس نے بیس سال کے اندر محض غصہ کی بنا پر ایک لاکھ بیس ہزار انسانوں کا خون بہایا اور جن پر ہاتھ اُٹھایا وہ لاکھوں تھے مگر آج یہ جرأت کسے؟

کوفیوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو بے وفائی اور دغابازی کی تھی۔ قدرت نے اس کی سزا عراق پر حجاج بن یوسف کے تسلط کی صورت میں دی۔ جس نے ان کو ایسی ایسی سزائیں دیں۔ کہ ان کی فطرت تک کو مسخ کر ڈالا کسی نے سچ کہا ہے جیسی کرنی ویسی بھرنی۔

امیر المومنین اور جنت

ہارون رشید علماء و فقہا کا بہت قدر دان تھا جب کبھی مدینۃ السلام یا دقہ میں کوئی فقیہہ یا محدث آتا۔ اسے پند و نصیحت سننے کے لئے اپنے پاس بلاتے۔

طبری کا بیان ہے کہ ایک دفعہ مشہور عالم ابنِ سماک ان سے ملنے کے لئے آئے بحسب عادت آپ نے ان سے بھی نصیحت کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا۔

"ہارون! سو بات کی ایک بات ہے۔ ہر کام کرتے وقت خدا سے ڈرتے رہو۔ اور یہ بات ہر لحظہ ذہن میں رکھو کہ کل تم کو خدا کے ہاں جواب دینا ہوگا۔ پھر یا تو جنت تمہارا ٹھکانا ہوگا یا دوزخ"۔

فضل بن ربیع پاس کھڑا تھا۔ کہنے لگا۔

جناب والا۔ یہ بات آپ نے عجیب کہی۔ بھلا امیر المومنین کے

کہ یہ جنت جانے میں بھی کوئی شک و شبہ ہو سکتا ہے۔

ابن سماک نے فرمایا۔

"ہارون! یہ فضل قیامت کے دن تمہارے ساتھ نہیں ہوگا۔ اور نہ تمہارا بوجھ اُٹھائے گا۔ تم اس کی کسی بات کا خیال نہ کرو۔ اور اپنی ذات کے لئے خدا سے ڈرتے رہو"

ہارون رشید پر اس بات کا اتنا اثر ہوا کہ روتے روتے داڑھی آنسوؤں سے تر ہو گئی۔ اور دربار پر اس درجہ حسرت طاری ہوئی۔ جیسے یہ کوئی ماتمی مجلس ہو۔

علمائے حق کی یہی نشانی ہے کہ حق گوئی میں وہ شخصیتوں کو خاطر میں نہیں لایا کرتے۔ خواہ سننے والا کوئی ہی کیوں نہ ہو۔

مسجد میں تخت

ایک مرتبہ والیٔ خراسان سلطان خوارزم شاہ نے اپنے لئے جامع مسجد میں ایک تخت بچھوایا جس پہ بیٹھ کر وہ خطبہ دیا کرتا تھا اور نماز پڑھا کرتا تھا۔ تاکہ اس کا شاہانہ وقار و جلال ظاہر ہو۔

امام فخرالدین رازی ؒ نے جو چھٹی صدی ہجری کے ایک مایۂ ناز خطیب۔ ادیب مفسر اور محدث تھے۔ اس مظاہرۂ عظمت و شوکت کو برا محسوس کیا۔

چنانچہ جس وقت شاہ نماز سے فارغ ہوا تو امام رازی ؒ نے بھری مجلس میں اس کو یوں ڈانٹا۔

"جلالتہ الملک۔ یہ دربارِ الٰہی ہے۔ عظمت و شوکت کے مظاہرہ کی جگہ نہیں ہے۔ یہاں پہنچنے کے بعد سب ادنیٰ و اعلیٰ اور بلند و پست برابر و یکساں ہو جاتے ہیں۔ خدا کے نزدیک زیادہ لائقِ احترام وہی ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔"

سلطان اس اندازِ بیان پر سخت برافروختہ ہوا۔ مگر چاروں طرف ایک نظر دوڑائی تو دیکھا کہ تمام نمازی امام رازی کی تائید کر رہے ہیں۔ سلطان کو ان کے مقابلہ کی ہمت نہ ہوئی تخت وہاں سے اٹھوا لیا۔ اور پھر سب نمازیوں کے پہلو بہ پہلو نماز پڑھتے رہے۔ جابر و قاہر حکمرانوں کے سامنے حق گوئی کا لطف و ثواب کچھ اور ہی ہوتا ہے۔

بہترین ظالم

سلطان الپ ارسلان کے وزیر نظام الملک طوسی نے خدا کو دھوکا دینے یا رعایا کا امتحان لینے کی ایک عجیب تجویز نکالی۔

اُس نے ایک محضر نامہ بدیں مضمون تیار کرایا کہ اس کے عہد میں جتنے بھی ظلم و ستم ہوئے ہیں۔ وہ وزیر کی طرف سے نہیں تھے۔ بلکہ ان کا ذمہ دار سلطان تھا۔ تاکہ قیامت کے دن یہ رہائی کا پروانہ ثابت ہو۔

محضر نامہ مرتب کرانے کے بعد اس نے اس پر علماء۔ امراء اور رعایا کے دستخط حاصل کرنے کی مہم شروع کی۔ چونکہ وزیر سلطنت کا حکم تھا اس لیے سب نے اس پر دستخط کر دیئے۔ اور شعراء نے قصیدے شامل کیے مکمل ہو جانے پر جب یہ محضر نامہ آخری دستخطوں کے لیے شیخ ابو اسحٰق فیروز آبادی کے سامنے پیش ہوا۔ کہ وہ بھی ساری رعایا کی تائید مزید کر دیں تو آپ نے اس پر یہ لطیف و مختصر تصدیق کر دی۔

"خیر الظلمۃ حسن"۔

یعنی سب ظالموں میں حسن اچھا ہے۔ حسن دراصل نظام الملک طوسی کا نام تھا۔ جب تمام مراحل طے کر کے یہ محضر نامہ نظام الملک طوسی کے حوالے کیا گیا۔ تو اس نے شروع سے آخر تک اسے پڑھا۔ مگر جب وہ اس آخری فقرہ پر پہنچا۔ تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور کہا۔

"ابو اسحٰق کے سوا کسی نے سچ نہیں لکھا"

واقعی سچ کہنے والا ہزاروں میں کوئی ہوتا ہے۔

جوش اور ہوش

سلطان سکندر بن سلطان لودھی اپنے وقت کا دین دار بادشاہ تھا جب وہ اپنے دورہ پر تھانیسر آیا۔ تو چند تنگ نظر مولویوں نے اس سے شکایت کی کہ ہندوؤں کے پوجا پاٹ سے ہم کو بے حد تکلیف اور پریشانی ہوتی ہے۔ آپ خود اس بات کا جائزہ لے کر ان کے مندروں کو مسمار کرتے جائیں۔

سلطان سکندر بھی وقتی طور پر مذہبی جوش میں آکر ان مندروں کو گرانے پر آمادہ ہو گئے۔ کسی طرح اس واقعہ کی اطلاع اس وقت کے مورخ مولانا عبداللہ تھانیسری کو ہو گئی۔ فوراً سلطان کو جوش سے ہوش میں لانے کے لئے پہنچے اور کہا۔

"اے سلطان! اسلام نے کسی مذہب و ملت کی عبادت گاہوں کو مسمار کرنے کی اجازت نہیں دی"۔

سلطان بولے۔

"تم کافروں کی حمایت کرنے آئے ہو۔"

مولانا نے جواب دیا۔

"میں حق کی حمایت کرتا ہوں۔ مجھے آپ ہی بتا دیجیے کہ صحابہ کرام نے کتنے گرجے اور مندر گروائے تھے؟ جب انہوں نے ایسا نہیں کیا تو تو ایسا کرنے والا کون ہے۔"

سلطان مولانا کی حق گوئی کا قائل ہو گیا اور اس نے مندروں کے گرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

مسلمانوں نے ہمیشہ اس سانپ کو دودھ پلانے کی کوشش کی ہے۔ مگر اس نے موقعہ پاتے ہی مسلمانوں کو کاٹ کھانے سے کبھی گریز نہیں کیا۔

دربار میں سناٹا

شاہجہاں نے تخت و تاج حاصل کرنے کے لئے اپنے بھائیوں اور بھتیجوں کو قتل کرایا تھا۔ جو کچھ اس نے دوسروں کے ساتھ کیا وہی اسے خود پیش آیا۔ حبس بول کے مرض نے جب شاہجہاں کو کاروبارِ سلطنت سنبھالنے سے معذور کر دیا۔ تو اس کے سرکش، خود پسند اور خود رائے سب سے بڑے چہیتے بیٹے دارا شکوہ نے عنانِ حکومت سنبھال کر اپنے والد کو آگرہ کی ناموافق آب و ہوا میں اس کی مرضی کے خلاف رہنے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنا راستہ صاف کرنے کے لئے اورنگ زیب عالمگیر کو ہٹانے کے درپے ہوا۔ مگر ناکام رہا۔ شاہجہاں کہ جو اپنے لاڈلے بیٹے دارا شکوہ کے پنجۂ سرکشی میں بُری طرح پھنسا ہوا تھا۔ عالمگیر نے اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر صرف اتنا لکھ بھیجا۔

"حضور اب قلعہ سے باہر آئیں۔"

یہی حکم شاہجہان کی قید اور اس نیک نام کی بدنامی کا باعث ہوا۔ دارا شکوہ عالمگیر کو ختم کرنا چاہتا تھا۔ مگر خود اس کے ہاتھوں ختم ہو گیا۔ مراد نے اپنے بھائی عالمگیر کے دست و بازو ہونے کے باوجود غلط مشوروں کی بنا پر اس سے تاج و تخت چھیننا چاہا۔ مگر خود اس کے ہاتھوں اپنی زندگی کھو بیٹھا۔ اس طرح قدرت نے ہر ایک کو اس کی نیت کا پھل اسی دنیا میں چکھا دیا۔

عالمگیر اپنے باپ کی طرح اپنے بھائیوں کے خون سے اپنی عبائے زہد و تقویٰ کی رنگین کر کے جب تختِ ہند پر خاندان مغلیہ کی شان و شوکت کا آخری نظارہ دنیا کو دکھلانے کے لئے جلوہ افروز ہوا۔ تو اس وقت حالات کچھ خوش گوار نہ تھے۔ مگر فضا کو سازگار بنانے کے لئے عالمگیر نے ایک دربارِ خاص منعقد کیا جس میں ملک کے امراء۔ فضلا اور علماء مدعو تھے۔ اس دربار میں مولانا علی النقی بھی آئے ہوئے تھے۔ جو اس وقت کے مشاہیر سے تھے۔

شاہنشاہِ ہند نے اپنے والد کی دارا شکوہ کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بننے۔ اپنے بھائیوں کی سازشوں اور تخریبی کارناموں کے مقابلہ میں اپنی حفاظتِ خود اختیاری کے جواز میں تقریر کرتے ہوئے کہا "ہر اس طرح حکومت حاصل کرنا کسی دنیوی مفاد کیلئے

نہ تھا۔ بلکہ محض خلقِ خدا کے فائدہ کیلئے ایسا کیا گیا ہے"

تمام حاضرینِ دربار نے اورنگ زیب کے اس اقدام کی تائید کی۔ فاضلِ وقت ملا نظام وغیرہ نے سکوت اختیار کیا مگر مولانا علاؤالدین سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے اسی وقت کھڑے ہو کر دربارِ خاص میں اس باجبروت بادشاہ سے کہا۔

"جو بادشاہ اپنے باپ کو جیل خانہ میں بند کر سکتا ہے اس سے خلقِ خدا کو اگر فائدہ پہنچ جائے۔ تو تعجب ہے"

آپ کی اس صاف گوئی سے دربار میں سنسنی پھیل گئی۔ اہلِ دربار حیرت میں آ گئے۔ اور بادشاہ علاؤالدین کا منہ تکتا رہ گیا۔ مگر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اکثر اوقات کلمۃ الحق جابر حکمرانوں کے لبوں پہ مہرِ سکوت ثبت کر دیتا ہے۔ اور ان کا سکوت ان کی غلطی کا عملی اعتراف ہوتا ہے۔

مگر اورنگ زیب نے جو کچھ کہا اسے سچ کر دکھایا۔ پچاس سال تک بے نظیر خدمتِ خلق کی۔ اور خود کتابتِ قرآن کی اجرت پر گزارہ کرتا رہا۔

---

(۷)

تدبیر و سیاست

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے ساز بدلے گئے

اعتدالِ سیاست

خالد بن ولید کے مسلمان ہوتے ہی نبی کریمؐ نے ان کی جرأت و دلیری کے پیش نظر صاحبِ صدق و مقال۔ نرم دل و نرم خو ابو ذر غفاریؓ پر ترجیح دیتے ہوئے انہیں فوج میں عہدہ دار بنا دیا اور ابو ذر کو فوجی خدمات کا اہل نہ سمجھا۔ ابو بکر صدیقؓ نے خلیفہ ہوتے ہی خالد بن ولید کو سپہ سالار بنا دیا۔ جب سخت دل عمرؓ کا دورِ خلافت آیا۔ انہوں نے اس جری کو معزول کر کے سپہ سالاری نرم دل ابو عبیدہؓ کے سپرد کر دی مگر کسی نے اپنی حق تلفی یا تنزلی پر رنج و ملال نہ منایا کیونکہ سب ایک ہی شمع کے پروانے اور ایک ہی مقصد کے دیوانے تھے اور سمجھتے تھے کہ سیاست میں اعتدال پیدا کرنے کے لئے لازمی ہے کہ امیر سلطنت نرم دل ہو تو اس کا نائب سخت گیر ہونا چاہیئے۔ اگر امیر سخت گیر ہو تو اس کا نائب نرم دل ہونا ضروری ہے

ہماری سیاست نہ اعتدال کے رخ چل رہی ہے نہ قابلیت کا راستہ اختیار کرتی ہے اس کا تمام تر دارومدار کورٹ سسٹم اور اقربا نوازی پر ہے

کرفیو کا اثر

ماہ ربیع الاول ۴۵ھ ہجری میں زیاد ابن سفیان بصرہ کے گورنر مقرر ہوئے انہوں نے وہاں پہنچ کر ایک زوردار خطبہ دیا۔ اہل شہر سے کہا۔

"خدا کی کتاب تم میں موجود ہے۔ رسول اللہ تمہارے لئے شمع ہدایت چھوڑ گئے ہیں مگر تم اندھیرے میں چل رہے ہو بے عقلی اور گناہ کی باتیں کرتے وقت شرم تک محسوس نہیں کرتے۔ تم نے اسلام میں ایسی ایسی چیزیں روا رکھی ہیں۔ جو پہلے کسی نے روا نہیں رکھیں۔ تم شراب پیتے ہو اور فسق و فجور کرتے ہو۔ قحبہ خانے کھول رکھے ہیں اور وہاں جا کر بدکاریاں کرتے ہو۔ خدا کی قسم میں یہ تمام جگہیں مسمار کردونگا۔ تمہارا رات کو نکلنا بند کردونگا۔ اور جس نے میرے احکام کی مخالفت کی اس کا خون بہا دونگا"

آپ نے جیسا کہا ویسا کر دکھایا۔ آپ نے کرفیو لگا دیا۔ اور بعد نماز عشاء جو کوئی باہر نکلا اس کی گردن اڑا دی گئی۔ گو بظاہر یہ حکم سخت تھا مگر اس وقت کے حالات اسی کے متقضی تھے۔ چنانچہ ایک ماہ کے اندر اندر بصرہ سے بدمعاشی۔ آوارگی کے اڈے اُٹھ گئے۔ چوریاں بند ہو گئیں۔ ڈکیتیوں کا خاتمہ ہو گیا۔ شہر کی حالت ایسی سدھری کہ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لینا شروع کیا۔ اور گھروں کے دروازے کھول کر سونے لگے۔ اگر رات کو کوئی قیمتی چیز باہر رہ جاتی۔ تو اسے صبح کو وہ خود ہی اُٹھاتا۔ اور کسی کو اُٹھانے کی ہمت نہ ہوتی۔ یہاں تک کہ لوگ دکانیں اکیلی چھوڑ جاتے۔ اور ایک تنکا تک ضائع نہ ہوتا۔

زیاد بن سفیان نے اُس وقت کا جو نقشہ کھینچا تھا۔ بعینہٖ آج وہی حالت ہے۔ عزت۔ دولت محفوظ نہیں۔ اور امن وامان برائے نام ہے۔ ان باتوں کا انحصار حاکم وقت کی امانت و دیانت پر ہوتا ہے۔ اگر اسے رعایا کی بہتری اور خدا کے سامنے اپنی جوابدہی کا احساس ہوگا۔ تو وہ اس سے بھی زیادہ سخت قدم اُٹھانے میں باک نہیں کریگا۔

سیاسی بدھ چھ

خلیفہ ولید اموی کو اپنے تمام عمال میں سے حجاج بن یوسف زیادہ محبوب تھا۔ جسے عمر بن عبدالعزیز بدترین خلائق سمجھتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے۔

"اگر قیامت کے دن دنیا کی تمام قومیں خباثت میں مقابلہ کریں۔ اور ہر قوم اپنے خبیث کو مقابلہ میں لائے تو ہم حجاج کو پیش کر کے ساری دنیا پر غالب آجائیں گے"

ولید کے بعد ۹۶ھ ہجری میں اس کے بھائی سلیمان بن عبدالملک نے خلافت سنبھالی۔ اس نے حجاج کے جابرانہ اقتدار کو ہمیشہ کیلئے ختم کرنے اور ظلم کی بیخ کنی کرنے کی خاطر حجاج کے تمام مقرر کردہ عمال کو معزول کر دیا۔

سلیمان کے بعد عمر بن عبدالعزیز مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے انہوں نے حجاج بن یوسف کے ظلم و ستم کی باقیماندہ یادگاروں کو مٹانے

کے لئے حجاج کے خاندان کو جمع کرکے یمن روانہ کردیا۔ اور وہاں کے عمّال کو لکھا۔

تمہارے پاس آل ابو عقیل کو بھیجتا ہوں۔ عرب میں یہ بدترین خاندان ہے۔ ان کو اپنی حکومت میں ادھر اُدھر منتشر کردو جو لوگ حجاج کے ہم قبیلہ تھے یا ان کے ماتحت کارکن تھے۔ ان کو ہر قسم کی ملکی خدمات سے محروم کردیا جاتے:

گو حکومت اور سیاست بدل چکی تھی۔ مگر یہ امر سیاست کے خلاف سمجھا گیا کہ ایک تمام حکومت کے عمال کو عوام پر مسلط رکھا جائے کیونکہ اس امر کا اندیشہ تھا کہ وہ ممکن ہے تبدیل شدہ ماحول کے اثرات قبول نہ کریں۔ اور عادۃً رعایا پر زیادتی کرتے رہیں۔ اسلئے ان کو ہمیشہ کے لئے نیست و نابود کردیا۔

اس دور کی سیاست کے رنگ ڈھنگ کچھ اور ہیں۔ یہاں ترقی ہی اسے دی جاتی ہے جو عوام کو کچلنے کی اہلیت و مہارت رکھتا ہوتا کہ حکومت کا اقتدار و وقار بحال رہے۔

ڈاڑھی کی ہیبت

تسخیرِ سپین کے دوران میں مجاہدِ اسلام موسےٰ ابن نصیر نے "مریدہ" کے پُرفضا اور خوشنما شہر پہ حملہ کیا۔ فصیلِ شہر توڑنے کی کوشش بے کار ثابت ہوئی۔ اس مردِ مجاہد نے ایک عجیب چال چلی۔ حاکمِ شہر کو کہلا بھیجا کہ خواہ کتنے سال گزر جائیں۔ ہم اس شہر پر قبضہ کئے بغیر واپس نہیں ہوں گے۔ بخوشی خود شہر کا دروازہ کھول دو۔ ہماری گرفت سے نہ پہلے کوئی بچا ہے۔ اور نہ تم بچ سکو گے۔

حاکمِ شہر اسلامی فتوحات کی خبریں سُن چکا تھا۔ وہ اس دھمکی سے سخت مرعوب ہوا۔ ایک وفد اس پیکرِ استقلال کے پاس بات چیت کے لئے بھیجا۔ موسےٰ ابن نصیر اس وقت ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ یہ وفد جب ان کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس جرنیل کی سفید نورانی ڈاڑھی سے بہت متاثر ہوا۔ اس روز کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ گفتگو دوسرے روز پہ ملتوی ہو گئی۔

وفد کی واپسی کے بعد موسےٰ ابن نصیر نے اپنی ڈاڑھی حنا کے خضاب سے سرخ کر لی۔ دوسرے روز جب وہی وفد آیا۔ تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ اس بوڑھے جرنیل کی سفید نورانی ڈاڑھی سرخ ہو چکی ہے۔ آج کی گفتگو بھی کسی فیصلہ کن مرحلہ پر نہ پہنچ سکی۔ اور وفد حیرانگی کے عالم میں واپس چلا گیا۔

وفد کے واپس چلے جانے پر موسےٰ ابن نصیر نے سرخ ڈاڑھی کو سیاہ خضاب لگا کر نوجوان کی سی شکل بنا لی۔ تیسرے روز بھی وہی وفد گفتگو کے لئے آیا۔ جب موسےٰ ابن نصیر کے خیمہ میں داخل ہوا۔ تو یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ پرسوں جس شخص کی ڈاڑھی سفید دیکھی تھی۔ کل وہی ڈاڑھی سرخ تھی اور آج بالکل سیاہ!!۔

اُس روز کی گفتگو سے اپنے حاکم کو مطلع کرنے کے لئے جب وفد واپس گیا۔ اس نے حاکم شہر اور درباریوں کو اس حیرت انگیز واقعہ کی تفصیل بتائی۔ سب حیران رہ گئے۔ اور کہا۔ اسلامی فوج کا قائد یقیناً کوئی فرشتہ یا جن معلوم ہوتا ہے۔ اسلئے اس پر ہم کبھی فتح حاصل نہیں کر سکتے۔ اس سے مقابلہ کرنے کی بجائے صلح کر لینی بہتر ہے چنانچہ شرائط صلح طے کر کے عیسائیوں نے شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔ تدبیر انسان کے لئے کامیابی کی کیسی کیسی راہیں کھولتا ہے۔

خفیہ نویس

مامون رشید نے نظام حکومت کی اصلاح کے سلسلہ میں ایک اہم قدم یہ اٹھایا تھا کہ ہر محکمہ میں نہایت معتبر اور محتاط مرد اور عورتیں وقائع نگاری اور خفیہ نویسی پر مامور کر دی تھیں۔ جن کا علم مامون رشید کے سوا کسی کو نہ ہوتا تھا۔

یہ محکمہ کسی خوف و خطر کو دور کرنے کے لئے قائم نہ کیا گیا تھا۔ بلکہ اس کے ذریعہ رعایا کی تکالیف سے آگاہی حاصل کر کے ان کے ازالہ کی کوشش کی جاتی تھی۔

ایک دن مامون رشید کے پاس خفیہ نویس نے رپورٹ بھیجی کہ فلاں سپاہی نے ایک شخص کو بیگار لینے کے لئے پکڑا۔ اس نے دردناک لہجہ میں چلا کر کہا۔

"واعمراہ یعنی ہائے عمرؓ۔ تم کہاں ہو؟"

مامون رشید نے دونوں کو طلب کیا اور اس شخص سے پوچھا۔

"کیا تمہیں حضرت عمرؓ کا عدل یاد آیا تھا؟"
اس نے کہا۔
ہاں!
مامون رشید نے کہا۔
"خدا کی قسم۔ اگر میری رعایا حضرت عمرؓ کی سی رعایا ہوتی تو میں ان سے بھی زیادہ عادل ہوتا۔"
مامون رشید نے اس ستم رسیدہ کو انعام دے کر رخصت کیا اور سپاہی کو موقوف کر دیا۔

دورِ حاضرہ میں ہر حکومت اپنی رعایا سے بدگمان رہتی ہے اسے رعایا کی تکالیف دور کرنے کی بجائے اپنی حکومت کے استحکام کا زیادہ خیال رہتا ہے۔ اسلئے موجودہ خفیہ پولیس کے فرائض اُس وقت کے خفیہ نویسوں سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ اپنی تمام تر توجہ اربابِ حکومت کے اقتدار کی حفاظت پر مرکوز رکھتی ہے اور عوام کی شکایات و تکالیف سے بے تعلق رہتی ہے۔

اقلیت و اکثریت کا مقابلہ

سپین میں عیسائیوں کو جنرل طارق کے ہاتھوں جب پے در پے شکستیں ہوئیں۔ تو عیسائی سپہ سالار نے راڈرک شاہ سپین کو خط لکھا کہ

"میں بذاتِ خود عربوں کے حملوں کی تاب نہیں لا سکا اسلئے میدان چھوڑ کر چلا آیا ہوں۔ اگر آپ بنفسِ نفیس اس جنگ کا قصد فرما دیں۔ تو ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔"

اس وحشت ناک خبر کے سنتے ہی شاہ سپین پریشان ہو گیا۔ اور قریباً ایک لاکھ عیسائیوں کا ٹڈی دل مسلمانوں کے مقابلہ میں لے آیا۔

جنرل طارق بھی پانچ ہزار کی مزید کمک منگا چکے تھے۔ اس وقت بقول "لین پول" طارق کے پاس کل فوج بارہ ہزار سے کسی صورت میں زیادہ نہ تھی۔ حالانکہ شاہ راڈرک کے پاس اس سے چھ گنا مسلح فوج تیار تھی۔

رمضان المبارک کے ختم ہونے میں ابھی دو روز باقی تھے کہ بروز

یکشنبہ طارق اپنی فوج کی صفیں جما کر دشمن کے مقابلہ میں آئے۔ عیسائی بھی پورے جوش و خروش کے ساتھ آہنی دیوار کی مانند سامنے کھڑے تھے۔ طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی جنگ شروع ہو گئی۔ مسلمانوں نے اس بے جگری سے مقابلہ کیا کہ شاہِ راڈرک کے منہ سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے۔

"یہ انسان نہیں ہیں۔ بلکہ دیو یا فرشتے ہیں۔"

آٹھ روز کی مسلسل خونریز جنگ کے بعد ۵ شوال ۹۲ھ ہجری کو بارہ ہزار کی قلیل فوج نے قریباً ایک لاکھ کی کثیر فوج کو ایسی شکست فاش دی کہ شاہ راڈرک کو میدان سے جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ جب کچھ اطمینان کی فضا قائم ہوئی۔ تو شاہ اسپین کی جوتی اور گھوڑا وادیِ لکہ کے کنارے سے ملے۔ لیکن لاش دستیاب نہ ہو سکی۔ کیونکہ وہ شرم کے مارے دریا میں ڈوب مرا تھا۔ اور موجوں نے کہیں دور لے جا کر اسے انسانی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا۔

اُس وقت کی صاحبِ ایمان اقلیت کا آج کی بےعمل اقلیت سے کیا مقابلہ! جو کروڑوں کی تعداد میں ہونے کے باوجود خائف و ہراساں ہے۔

اقلیت کے حوصلے

چوتھی صدی ہجری میں ملتان مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا۔ جہاں سے انہیں سونے کا بہت بڑا ذخیرہ ہاتھ آیا۔ جس کی وجہ سے ان کی تنگدستی فارغ البالی میں بدل گئی۔

اس زمانہ میں ملتان کا امیر ایک قریشی تھا۔ جو سامہ بن لوی کی اولاد سے تھا۔ جس کے بزرگ اس شہر پر قابض ہو گئے تھے۔

اس کے عہد میں یہاں ایک بہت بڑا بت خانہ تھا جس میں اہل ہند کی ایک دیوہیکل مورتی نصب تھی۔ امیر ملتان اپنی آمدنی میں سے اس بت خانہ کے پجاریوں پر بھی خرچ کیا کرتا تھا۔ گنتی کی آبادی اور مختصر سی سلطنت تھی۔ امیر ملتان کے پاس کوئی ایسی فوجی طاقت بھی نہ تھی جس سے وہ حملہ آوروں کو روک سکتا۔ اسلئے جب بھی اہل ہند اس مورتی کو حاصل کرنے کے لئے ملتان پر حملہ آور ہوتے مسلمانان ملتان اس مورتی کے آس پاس جمع ہو کر کچھ ایسی حرکتیں شروع کر دیتے جن

سے حملہ آوران یہ سمجھتے کہ اگر ہم قریب گئے۔ تو مسلمان اس بت کو توڑ پھوڑ دیں گے یا جلا دیں گے۔ اس لئے وہ واپس چلے جاتے۔ مدتوں یہی سلسلہ جاری رہا۔ جس کی وجہ سے ملتان اہل ہند کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونے سے بچا رہا۔

خطہ ملتان کو برصغیر ہند سے کیا نسبت۔ گنتی کے نفوس، کا جم غفیر سے کیا مقابلہ۔ جبکہ مدافعت کا سامان بھی پاس نہ ہو۔ مگر یہ عددی قلیت ہندوستان کی لا محدود مخلوق سے خائف نہیں ہوئی۔ بلکہ بے سروسامانی کے عالم میں ایسی ایسی حرکات کرتی تھی۔ کہ کثیر التعداد حملہ آوران کو مجبوراً واپس جانا پڑتا تھا۔

مسلمان اگر قوتِ ایمان، ہمت اور حوصلہ رکھتا ہو۔ تو اسے عددی اکثریت کبھی خائف و ہراساں نہیں کر سکتی۔

بانکے بہادر

۹۶ھ ہجری کے آخر میں مسلمان وسط ایشیا کو فتح کرکے چین کی سرحد پر جا پہنچے۔ اس کی اطلاع جب شاہِ چین کو پہنچی۔ اس نے مقدمۃ الجیش کے سردار کبیر کو کہلا بھیجا کہ وہ اپنا کوئی آدمی اس کے پاس بھیجے تاکہ ان کے عقائد و مقاصد سے آگاہی ہو۔

کبیر نے اس مقصد کے لئے دس آدمیوں کا ایک وفد مرتب کیا جو سب کے سب لسّان اور دانا تھے۔

دربارِ شاہی میں حاضری کے لئے انہوں نے زرہیں پہنیں۔ سفید لباس زیب تن کیا جو خوشبو سے مہک رہا تھا۔ اور کاندھے پر چادریں ڈال لیں۔

جونہی یہ دربار میں پہنچے دربار خوشبو سے مہک اُٹھا۔ بادشاہ نے انہیں بیٹھنے کو کہا۔ وہ کافی دیر بیٹھے رہے۔ مگر کسی نے ان سے گفتگو نہ کی۔ یہ تنگ آکر واپس آ گئے۔

ان کے چلے جانے کے بعد بادشاہ نے درباریوں سے ان کے متعلق رائے طلب کی سب نے کہا یہ تو زنانے معلوم ہوتے ہیں دوسرے روز یہ نہایت ہی زرق برق۔ بھڑکیلے اور چمکیلے کپڑے پہن کر دربار میں پہنچے بادشاہ نے ان کو دیکھتے ہی واپس کر دیا۔ آج مصاحبوں نے ان کے متعلق یہ رائے دی کہ یہ بانکے ہیں۔

تیسرے روز یہ فوجی لباس میں سجے سجائے حاضر ہوئے۔ سروں پر خود۔ ہاتھوں میں نیزے۔ گلوں میں ترکش۔ دیو ہیکل گھوڑوں پر سوار تھے۔ ان کی یہ حالت دیکھ کر بادشاہ اور اس کے وزرا وغیرہ بہت مرعوب اور حیران ہوئے۔ کہ یہ بانکے آج بہادر بنے ہوئے ہیں۔

اسی شام کو شاہ چین نے اس جماعت کے سردار کو اس مسخرہ پن کی وضاحت کے لئے بلایا۔

ہبیرہ نے وہاں پہنچ کر شاہ کو بتلایا کہ ہم نے ان مختلف لباسوں سے تو صرف یہ ظاہر کیا ہے کہ ہمارے گھر کا۔ دربار کا اور میدان جنگ کا کیا لباس ہوتا ہے۔ تاکہ آپ پر واضح ہو جائے کہ آپ کے دروازہ پر کون سی قوم دستک دے رہی ہے۔

شاہ نے ان باتوں کو کمال استغنا سے سنا۔ مسلمانوں کے سردار کو اپنی فوج اور سامانِ حرب کی کثرت سے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔

مگر با تدبیر سردار ہبیرہ کب مرعوب ہونے والے تھے۔ انہوں نے نہایت رعب و وقار کے ساتھ کہا۔

آپ بھی عجیب آدمی ہیں۔ آپ کو اتنا پتہ نہیں کہ کاشغر سے لے کر عرب کی آخری سرحد تک ہماری فوج پھیلی ہوئی ہے دنیا کا چوتھائی حصہ ہمارے پاؤں روند چکے ہیں۔ اب صرف یہ چین باقی ہے۔ ہمارا سردار اسے روندنے اور اس کے شہزادوں کو غلامی کی زنجیریں پہنانے کی قسم کھا چکا ہے۔

اس انداز بیان نے شاہ چین کو صلح پر مجبور کر دیا۔ اس نے صلح کر کے چین کی مٹی اور کئی شہزادے ان کی سردار کی قسم پوری کرنے کے لئے ہمراہ بھیجے۔ اس تدبیر نے چین کی تقدیر بدل دی اور وہاں اسلامی پرچم لہرانے لگا۔

ہمارے سیاستدان صرف جنگ اقتدار لڑنا جانتے ہیں۔ ان کا تدبر غیر ملکی ڈپلومیسیوں کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

---

(۸)

عفو و کرم

نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی
مرے جرمِ خانہ خراب کو ترے عفوِ بندہ نواز میں

رحمدلی

دوسری صدی ہجری میں بار برداری کے اونٹوں پر ہزار رطل وزن کا بوجھ لادنے کا رواج تھا۔ ڈاک کے گھوڑوں یا خچروں کو بھاری لگام دے کر نوکدار کوڑوں سے پیٹا جاتا تھا۔ اس امر کی اطلاع جب خلیفہ وقت کو پہنچی تو انہوں نے تمام مملکت میں یہ احکام صادر کر دئے کہ کسی اونٹ پر چھ سو رطل سے زیادہ وزنی بوجھ نہ لادا جائے۔ ڈاک کے جانوروں کے کوڑوں کی نوک میں چبھنے والا لوہا نہ لگایا جائے۔ ان کے منہ میں بھاری لگام نہ دی جائے۔ اور نہ ان سے معمول سے زائد کام لیا جائے۔ اس پر ان کا اپنا بھی عمل تھا۔ ان کا اپنا خچر روز کرایہ پر چلا کرتا تھا۔ اور ایک درہم کما لاتا تھا۔ ایک روز غلام ڈیڑھ درہم لایا۔ خلیفہ نے وجہ پوچھی۔ غلام نے بتلایا کہ آج بازار تیز تھا۔ انہوں نے کہا نہیں تم نے جانور سے زیادہ کام لیا ہے۔ اس کو اب تین دن آرام لینے دو۔ مسلمانوں میں رحم و کرم کا اب یہ جذبہ کہاں۔ جانور تو کیا انسان بھی ان کے ہاتھ سے مامون نہیں۔

خدا ترسی

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہیں اندر تشریف فرما تھے۔ آپ کا غلام باہر دروازہ پر بیٹھا تھا۔ آپ نے کسی ضرورت کی وجہ سے اسے آواز دی۔ اس نے کوئی جواب نہ دیا۔

تھوڑی دیر بعد آپ نے اسے دوبارہ بلایا۔ اس دفعہ بھی اس نے سنی ان سنی کر دی اور خاموش بیٹھا رہا۔ یہاں تک کہ اسے کچھ دیر بعد آپ نے تیسری بار آواز دی۔ یہ بھی صدا بصحرا ثابت ہوئی مگر حضرت علیؓ نے اس پر کسی غصہ یا رنج کا اظہار نہ کیا اور خاموش رہے۔

ایک اور شخص باہر حضرت کی یہ آوازیں سن رہا تھا۔ اس نے اندر جا کر عرض کی کہ آپ کا غلام تو دروازہ پر بیٹھا آپ کی آوازیں سن رہا ہے۔ مگر جواب نہیں دیتا۔ آپ بدستور خاموش رہے۔

کچھ وقفہ بعد وہ غلام کسی کام کے سلسلہ میں اندر گیا۔ آپ نے پوچھا تم نے میری آواز نہیں سنی تھی۔ غلام نے عرض کی حضور بیشک

سنی تھی۔ اس جواب پر پوچھا کہ

"تمہیں کس نے روکا تھا؟"

غلام نے شرمندہ ہو کر باندازِ معذرت عرض کی۔

"آمنت عقوبتك یعنی آپ کی خدا ترسی کی وجہ سے میں سزا سے مامون ہوں۔"

غلام کی غفلت اور بے پروائی پر ناراض ہونے کی بجائے آپ نے فرمایا۔

"خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے مجھے اپنی مخلوق میں ایسا بنایا جس سے خدا کی مخلوق مامون و محفوظ ہے۔"

امیرِ سلطنت کی طرف سے ایک ادنیٰ غلام سے یہ سلوک اربابِ اقتدار کے لئے سرمایہ بصیرت ہے جو اپنے ملازموں، چپڑاسیوں نوکروں چاکروں کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ ان کے فرائض منصبی سے زائد کام لیتے ہیں۔ معمولی لغزش، غلطی یا عدول حکمی پر ان کے لئے قیامت برپا کر دیتے ہیں۔ مگر اتنا نہیں سوچتے کہ اگر حق تعالےٰ بھی ان کی کوتاہیوں پر اس طرح فوراً دارو گیر شروع کر دے تو ان کا کیا حشر ہو۔

عفو کی تلقین

ایک خارجی نے خلیفۃ المسلمین سلیمان بن عبدالملک کو فاسق اور فاسق زادہ کہا۔ خلیفہ نے عمر بن عبدالعزیز سے رائے طلب کی۔ کہ اسے کیا سزا دینی چاہیئے۔ آپ نے کہا جس طرح اس نے آپ کو بُرا بھلا کہا ہے۔ آپ بھی کہہ لیجیئے۔ اہل دربار آپ کی اس رائے سے بہت متاثر ہوئے۔

خلیفہ بننے کے بعد بھی آپ کا مزاج نہ بدلا۔ ریاح بن عبید نے ان کے سامنے حجاج بن یوسف کو گالی دی۔ حالانکہ وہ ان کی رائے میں "خبیث الامت" تھا۔ مگر آپ نے ریاح کو ایسا کہنے سے منع کرتے ہوئے کہا۔

"اے ریاح جب مظلوم ظالم کو خوب بُرا کہہ کر اپنا بدلہ لے لیتا ہے تو ظالم کو اس پر فضیلت حاصل ہو جاتی ہے۔"

آپ کے عامل کوفہ عبدالحمید بن عبدالرحمن نے انہیں لکھا۔

"میرے اجلاس میں ایک شخص اس جرم میں پیش کیا گیا ہی کہ وہ آپ کو گالیاں دیتا ہے۔ میں نے اس کی گردن اُڑا دینی چاہی۔ لیکن اس خیال سے قید کر دیا۔ کہ اس بارے میں آپ کی رائے لے لوں"۔

آپ نے جواب بھیجا۔

"اگر تم اس کو قتل کر دیتے۔ میں تم سے قصاص لیتا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اور کو گالی دینے پر کوئی شخص واجب القتل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے اگر تمہارا دل چاہے۔ تو اس کو گالی دیدو۔ ورنہ رہا کر دو"۔

آج کل نہ تو حکام کو ایسے مشیر نصیب ہیں۔ نہ ان میں اس قدر صبر تحمل پایا جاتا ہے۔ اس دور میں گالی کے جواب میں دھپڑ اور اینٹ کے جواب میں تپھر مارنے کی پالیسی ہی بہتر سمجھی جاتی ہے جس کی وجہ سے فضا ساز گار ہونے کی بجائے زیادہ مکدر ہو جاتی ہے۔

ضبط و تحمل

سلطان صلاح الدین ایک دفعہ بیمار ہو گئے بیماری نے طول کھینچا اور ایسا شدید حملہ کیا۔ کہ سلطان شفا یابی کے بعد بھی کافی عرصہ تک نہ سنبھل سکے۔ کمزوری و ناتوانی نے یہ حالت کر دی کہ سلطان کیلئے بولنا مشکل ہو گیا۔

اسی حالت میں آپ کو نہانے کی ضرورت پڑی۔ حمام میں تشریف لے گئے اور ملازم کو گرم پانی لانے کا حکم دیا۔

خادم گرم پانی لے کر حاضر ہوا۔ جب سلطان کے قریب پہنچا۔ تو سلطان کی ہیبت سے اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ جس کی وجہ سے برتن ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ اور سخت گرم پانی اچھل کر سلطان کے بدن پر جا پڑا۔ جس سے جسم جل گیا۔

سلطان نے فوراً سرد پانی لانے کے لئے کہا۔ خادم جلدی سے ٹھنڈا پانی لایا۔ لیکن بد قسمتی سے اس مرتبہ بھی وہ جونہی سلطان کے

تڑپ گیا۔ رعبِ سلطانی سے پھر ہاتھ کانپنے لگے۔ پانی والا برتن گر پڑا۔ یہ ٹھنڈا پانی بھی سلطان کے جسم پر جا پڑا۔

اس گرم و سرد حادثہ نے کمزور و نحیف سلطان کو قریب المرگ کر دیا سلطان بے ہوش ہو گئے۔ آپ کو باہر لایا گیا۔

جب آپ کی طبیعت سنبھلی۔ تو آپ نوکر کو صرف اتنا کہہ کر چپ ہو رہے۔

"اگر مجھے مار ڈالنے کا ہی ارادہ تھا۔ تو صاف کہہ دیتے"

اپنی نوعیت کا یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں چھوٹی چھوٹی خطاؤں پر نوکروں سے نہایت برا سلوک کیا جاتا ہے۔ چہ جائیکہ ایک سلطان اپنے نوکر سے اس قدر عفو و کرم سے پیش آئے۔ اہلِ ثروت کو اس سے سبق لینا چاہیئے۔

شانِ حلم

مامون رشید ایک روز اپنے مصاحبوں کے ساتھ دریا کی سیر کو نکلے دجلہ کے کنارے پہنچ کر ایک کشتی میں سوار ہو گئے۔

حسن اتفاق ایسا کہ اس کشتی کے ملاح کا بھائی مامون رشید نے قتل کرایا ہوا تھا۔ اسلئے وہ مامون رشید سے سخت نالاں تھا۔

کشتی کے درمیان میں ایک پردہ لگا ہوا تھا جس کے ایک طرف ملاح بیٹھے باہم باتیں کر رہے تھے اور دوسری طرف مامون رشید نہر سیر کا لطف اُٹھا رہے تھے۔

بدوران گفتگو ایک ملاح نے دوسرے سے کہا۔

"تم سمجھتے ہو کہ میرے دل میں مامون کی کچھ قدر ہے۔ مگر تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ یہ شخص میری آنکھ میں کانٹا سا کھٹکتا ہے"۔

دوسرے ملاح نے پوچھا۔

کیوں؟

اس نے جواب دیا۔

"مامون میرے بھائی کا قاتل ہے"۔

یہ گفتگو کسی رازدارانہ انداز سے نہیں ہو رہی تھی۔ بلکہ مامون رشید اسے بخوبی سن رہے تھے۔ آپ اس پر کسی خفگی کا اظہار کرنے کی بجائے ہنس پڑے۔ اور کہنے لگے۔

"دوستو۔ کوئی ایسی تجویز بتاؤ۔ کہ کسی طرح میں اس جلیل القدر شخص کی نظر میں منفتر ہو جاؤں"۔

آپ نازک مزاج خلفا سے نہیں تھے۔ بلکہ حلم و بردباری میں بہت مشہور تھے۔ یہاں تک کہ باغیوں کو معاف کر دیتے تھے۔ اور فرمایا کرتے تھے۔

"کسی صاحب قدرت کی طرف سے انتقامی کاروائی اس کی عظمت میں اضافہ نہیں کر سکتی"۔

آج کوئی سچ سننے کے لئے تیار نہیں چہ جائیکہ اپنی برائیاں سن کر نادم ہو۔

طارق و موسےٰ

سرزمین اندلس پر طارق فتح کے شادیانے بجاتا آگے بڑھ رہا تھا۔ بعض وجوہات کی بنا پر گورنر افریقہ موسےٰ بن نصیر نے اسے حکم بھیجا کہ پیش قدمی روک کر ہمارا انتظار کرو۔ طارق نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا۔ سب نے یہی رائے دی کہ دشمن کو سنبھلنے کا موقعہ دینا قرینِ دانش نہیں ہے۔ طارق نے اس پر عمل کرتے ہوئے پیش قدمی جاری رکھی اور قرطبہ، ملاغہ، طلیطلہ اور غرناطہ کی طرف پھیل گیا۔

موسےٰ بن نصیر کو جب اس واقعہ کی اطلاع پہنچی۔ تو بہت جز بز ہوئے مگر انہوں نے آج کل کے حکام کی طرح اس عدولِ حکمی کو اپنی توہین تصور نہ کیا۔ نہ ہی انتقام لینا چاہا۔ کیونکہ یہاں ذاتی مفاد سامنے نہ تھا بلکہ قوم کی عزت و سربلندی کی مہم درپیش تھی۔ اس لئے موسےٰ بن نصیر نے طارق کو نہ معزول کیا نہ۔ اسے واپس آنے کا حکم دیا۔ اور نہ ہی اس کی پیش قدمی میں کسی قسم کی روکاوٹ ڈالی۔

ایک سال بعد موسےٰ ابن نصیر طارق کے پیچھے گئے بعض علاقے فتح کرتے ہوئے جب طلیطلہ کے قریب پہنچے تو طارق کو بھی خبر مل گئی۔ اس علم کے باوجود کہ موسےٰ نافرمانی کو برداشت نہیں کرتا۔ یہ "نافرمان" طارق اپنی پوری فوج اور سامان غنیمت کے ساتھ اپنے حاکم اعلیٰ کو ملنے کے لئے روانہ ہوا۔ دونو طلیطلہ کے قریب کسی مقام پر ایک دوسرے سے ملے۔

طارق عدول حکمی کی وجہ سے نادم تھے۔ مگر جب اپنے مربی اور اُستاد کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تو تعظیماً گھوڑے سے اتر پڑے اور آگے بڑھ کر آداب بجالائے۔ موسےٰ کے ہاتھ میں اس وقت ایک چابک تھا جس سے وہ گھوڑا ہنکاتے تھے۔ موسےٰ نے اظہار ناراضی کے طور پر طارق کو رسید کیا۔ طارق نے اس پر کسی قسم کا ملال ظاہر نہ کیا موسےٰ نے عدول حکمی کی سزا میں یہ چابک صرف "تنبیہ" مارا تھا کہ آئندہ وہ محتاط رہے۔ طارق نے جب اپنی صفائی پیش کی تو موسےٰ نے اسے معاف کر دیا۔ اور اسے اپنے ساتھ لے کر ارغون کی طرف یلغار شروع کر دی اور اکٹھے فتوحات کرتے رہے۔

جہاں بہیمیت ذاتیات پر غالب ہو۔ وہاں انتقام کی آگ ہمیشہ سرد اور عفو و کرم کا دریا موجزن رہتا ہے۔

معافی کا اثر

قادسیہ کے میدانِ جنگ میں حضرت سعدؓ اور رستم کی فوجیں دن بھر کی لڑائی سے تھک کر دامنِ شب میں آرام کر رہی تھیں۔ رات کی تاریکی لوگوں کے عیب و ثواب پر پردہ پوشی کی کوشش میں تھی۔ اور سالارِ لشکرِ اسلام بہ نفسِ نفیس اپنے لشکر میں بھیس بدل کر گشت لگا رہے تھے۔ آپ کی نظر مشہور شاعر اور بہادر سپاہی ابو محجن ثقفیؓ پر پڑی جو شراب پی رہا تھا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔

"اپنی جان کے دشمن۔ تو نے اپنے جہاد اور عبادت کا ثواب بھی کھو دیا۔ خدا کی قسم میں تم سے ضرور حق اللہ کا مواخذہ کروں گا اور تجھ پر حدِ شرعی جاری کروں گا۔"

چنانچہ آپ نے اسے درے لگا کر قید کر دیا۔ دوسرے روز جب لڑائی کا میدان گرم ہوا تو رستم نے بذاتِ خود میدان میں نکل کر ابن نجیبہؓ، حضرت زبیرؓ ایسے بہادروں کو جامِ شہادت پلا دیا۔ ابو محجن لڑائی کا

یہ حال قید خانہ کے دریچہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس بہادر سے یہ حالت نہ دیکھی گئی۔ اس نے حضرت سعد کی بیوی سلمیٰ جو اس پر نگران مقرر تھیں سے درخواست کی۔

"خدا کے لئے اس وقت مجھ کو چھوڑ دو۔ لڑائی سے جیتا بچا تو خود آکر بیڑیاں پہن لوں گا۔"

سلمیٰ نے انکار کر دیا۔ اس نے بصد حسرت و ارمان اس مطلب کے دو شعر کہے کہ

"اس سے بڑھ کر کیا غم ہوگا کہ سوار نیزہ بازیاں کر رہے ہیں۔ اور میں زنجیروں میں بندھا پڑا ہوں جب کھڑا ہونا چاہتا ہوں تو زنجیر اُٹھنے نہیں دیتی۔ اور دروازے بند کر دئے جاتے ہیں اور پکارنے والا پکارتے پکارتے تھک جاتا ہے"

سلمیٰ پر ان اشعار نے کچھ ایسا اثر کیا کہ انہوں نے خود اسکی بیڑیاں کاٹ دیں۔ تاکہ یہ اپنے دل کی حسرت پوری کرے۔ ابو محجن نے حضرت سعد کے گھوڑے پر زین کسا بھالا سنبھالے میدان جنگ میں بجلی کی طرح پہنچا۔ میمنہ سے میسرہ تک چکر لگا کر رستم کے سامنے آیا۔ جسکی ہیبت میدانِ جنگ پر چھا رہی تھی۔ اس نے آتے ہی رستم کو اس زور سے جھڑکا کہ وہ سہم سا گیا اور اس زور سے نیزہ مارا کہ اس کی زرک ......

اسے چیرتی ہوئی دوسری طرف نکل گئی۔

حضرت سعدؓ اس شہسوار کی بہادری دیکھ کر حیران ہو کر کہنے لگے

"حملہ کا انداز تو ابومحجن کا ہی ہو سکتا ہے مگر وہ تو قید میں تھے"

شام ہوئی تو ابومحجن نے قید خانہ میں واپس آکر خود بیڑیاں پہن لیں۔ رات کو سلمٰی نے حضرت سعدؓ سے اس واقعہ کا ذکر کیا۔ انہوں نے اسی وقت اسے معاف کر کے رہا کر دیا کہ

"خدا کی قسم مسلمانوں پر جو شخص یوں نثار ہو۔ اس کو میں سزا نہیں دے سکتا"

یہ سُن کر ابومحجن نے بھی اقرار کیا۔

"بخدا میں بھی آج سے پھر کبھی شراب کو ہاتھ نہ لگاؤں گا"

مسلمانوں کا عفو و کرم بھی اکثر گمراہوں کو راہ راست پر لانے کا موجب ہوا ہے۔

---

(۹)

امانت و دیانت

دیکھ تو اپنا عمل تجھ کو نظر آتی ہے کیا
وہ صداقت جس کی بیباکی تھی حیرت آفریں

دیانتِ خلیفہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنے غلام مزاحم کو ایک رحل لانے کا حکم دیا۔ وہ سرکاری مال خانہ سے ایک لکڑی پسند کر کے بنوا لایا خلیفہ کو پتہ چلا کہ یہ سرکاری لکڑی سے بنوایا گیا ہے اس نے اسکی بازار سے قیمت لگوائی جو نصف دینار بتائی گئی۔ خلیفہ نے احتیاطاً دو دینار بیت المال میں داخل کرا دیئے۔ آپ اپنے وضو اور غسل کا پانی سرکاری مہمان خانہ کے مطبخ خانہ سے گرم نہ کراتے تھے گھر سے گرم ہو کر آتا تھا۔ ایک مرتبہ غلام غلطی سے سرکاری مطبخ خانہ سے وضو کا پانی گرم کر آیا۔ آپ نے لکڑی کی قیمت داخل خزانہ کر دی۔ ایک اور موقعہ پر فرات بن مسلم سرکاری کاغذ پیش کرنے آئے آپ نے ایک بالشت بھر سادہ کاغذ ذاتی استعمال کے لئے لے لیا۔ مگر دوسرے روز اسی قدر کاغذ واپس کر دیا۔ آپ سرکاری شمع پر ذاتی کام کبھی نہ کرتے تھے۔ خلیفہ کی اس دیانت کا رعایا پر یہ اثر ہوا کہ وہ بھی خلیفہ کے نقشِ قدم پر چلنے لگی۔ مگر اس زمانہ میں اکثر ملازمین سرکاری اثیار کو ذاتی مال تصور کر کے نہایت بیدردی سے بیجا استعمال میں لاتے ہیں۔

سلطانی خیانت

محمد بن سیرین عین التمر کے مشہور گو مختاط تاجر تھے۔ لوگوں کو رزقِ حلال کی تلاش کے لیئے ہمیشہ تلقین کرتے ہوئے کہا کرتے تھے

"خدا کی طرف سے تمہارے لیئے حلال روزی مقدر ہو چکی ہے۔ تم حلال کماؤ۔ اگر تم نے حرام کے ذریعہ اُسے حاصل کیا۔ تو بھی وہ اس سے زیادہ نہیں ملے گی۔ جو تمہارے لیئے مقدر ہو چکی ہے۔"

ایک مرتبہ اُن پر ایک شخص نے دو درہم کا جھوٹا دعویٰ کر دیا۔ اُنھوں نے عدالت میں اسکے دعویٰ سے انکار کیا۔ مدعی چالاک واقع ہوا تھا اس نے ان کو حلف اٹھانے کے لیئے کہا۔ یہ تیار ہو گئے۔ مدعی کا خیال تھا کہ یہ حلف نہیں اُٹھائینگے اور دو درہم ادا کر دیں گے۔ لوگوں نے انہیں کہا کہ دو درہم کے لیئے قسم کھاتے ہو۔ آپ نے جواب دیا "مَیں جان بوجھ کر اس شخص کو حرام نہیں کھلا سکتا۔"

ایک موقعہ پر انہوں نے چالیس ہزار کا تیل خریدا۔ اس سے مرا ہوا چوہا نکلا۔ انہوں نے مسلمانوں کو حرام کھلانا مناسب نہ سمجھا۔ تیل ضائع کر دیا۔ مگر رقم ادا نہ کر سکے جس کے لیئے جیل جانا پڑا جب قید ہو کر جیل پہنچے۔ تو اتفاق سے جیل کا محافظ ان کا مرتبہ شناس نکلا۔ اس نے ..... دیکھا کہ یہ شخص اپنی دیانت کی سزا بھگتنے کے لئے آئے ہیں۔ اسلیئے از راہِ ہمدردی و تواضع اس نے انہیں کہا۔

"آپ رات کو گھر چلے جایا کریں۔ اور صبح ہوتے ہی واپس آجایا کریں"

آپ نے فرمایا۔

"میں سلطانی خیانت میں تمہاری مدد نہیں کر سکتا"

ان لوگوں کی دیانت کا اندازہ لگایئے کہ اپنی جان کو خوشی خوشی عذاب میں ڈال دیتے تھے اور حقوق المسلمین کی ادائیگی میں فرق نہیں لاتے تھے۔ مگر اس زمانہ میں حرام کو حلال بنا کر کھلانے میں بھی لوگ دریغ نہیں کرتے۔

آتشِ سوزاں

مظہرِ عبدیت ہرم بن حیانِ عبدی ظاہری علوم سے بے گانہ تھے زہد و عبادت کی وجہ سے فنا فی اللہ کا مقام رکھتے تھے۔ علم پر ہمیشہ عمل کو ترجیح دیتے تھے۔ عالم بے عمل کو اس وجہ سے فاسق کہتے تھے کہ وہ باتیں تو علمی کرتے ہیں مگر عمل فسق کا کرتے ہیں۔ اسلئے لوگ شبہ میں پڑ کر گمراہ ہو جاتے ہیں۔ جہاد کے بڑے مشتاق تھے اور زرہ و گھوڑا ہر وقت تیار رکھتے تھے۔

اس صداقت شعار کو خلیفۂ وقت نے ایک عہدہ پر فائز کیا۔ ان کے عزیز و اقارب نے اس اعزاز پر بہت خوشی کا اظہار کیا۔ ہرم بن حیان ان کی عادات سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں اندیشہ ہوا کہ کہ اس منصب سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کے لئے یہ تنگ کرینگے اس لئے ان کو ایسی حرکات سے روکنے کے لئے انہوں نے یہ تدبیر نکالی کہ اپنی تقرری کی اطلاع ملنے پر اپنے مسکن کی گزرگاہ پر آگ

جلا دی۔ جس سے ان تک پہنچنے کا راستہ بن ہو گیا۔

ان کے دوست اور رشتہ دار اس خوشی میں مبارک بادی کے بہانے ان کے پاس گئے مگر ان کے اور اپنے درمیان آگ حائل دیکھ کر رک گئے۔ دور سے کھڑے ہوتے مبارک باد عرض کی۔ ہرم نے نہایت خوش اخلاقی سے ان کا خیر مقدم کیا۔ اور خوش آمدید کہہ کر اپنے پاس بلایا۔ انہوں نے کہا۔

"ہمارے اور آپ کے درمیان تو آگ حائل ہے۔ ہم کیسے آئیں"؟

انہوں نے یہ سبق آموز جواب دیا۔

"تم لوگ خود تو اتنی آگ کو عبور نہیں کر سکتے۔ اور مجھ کو اس سے زیادہ آتش سوزاں میں جھونکنا چاہتے ہو۔"

یہ جواب سن کر وہ واپس چلے گئے اور پھر کسی کو ان کے پاس جانے کی ہمت نہ ہوئی۔

دور حاضرہ میں اقربا نوازی بعض فرائض میں داخل سمجھتے ہیں اور اس غرض کے لئے دوسروں کی حق تلفی سے بھی گریز نہیں کرتے۔

دستورِ اسلامی کا نفاذ

سلطان صلاح الدین نے جس وقت ملک شام فتح کیا۔ تو اس کے وزرا نے وہاں کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد سلطان کی خدمت میں عرض کی۔

"یہ نصرانیوں کا ملک ہے نیا مفتوحہ ہے۔ اس ملک کے لوگ نہایت سرکش اور سخت جان واقع ہوئے ہیں جن کیلئے سخت گیری کی ضرورت ہے مگر اسلامی سیاسیات نرم ہیں اس لئے ضرورت ہے کہ علاوہ احکامِ اسلام کے اگر کچھ اور قوانین بھی ان پر قابو رکھنے کے لئے نافذ کر دئے جائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

اس مردِ مجاہد نے جو جواب دیا وہ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہے فرمایا۔

"کیا تمہارا خیال یہ ہے کہ میں نے جو ملک فتح کیا ہے وہ

خود حکومت و سلطنت کرنے کے لئے کیا ہے۔ ہرگز نہیں
بلکہ میں نے محض اللہ کو خوش کرنے کے لئے یہ سب کوششیں
کی ہیں۔ احکام اسلام ہی کو نافذ کروں گا۔ ملک رہے یا
جائے۔ مجھے اس کی پروا نہیں۔ مگر ایک حکم بھی اسلام کے
خلاف صادر نہیں کرونگا۔"

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ وہاں آپ نے احکام اسلامی اس خوبی
سے نافذ کئے کہ اہل ملک کی سرکشی، سخت گیری اطاعت و نرمی سے
بدل گئی۔

اس واقعہ کے پیش نظر اپنے حالات پر بھی ایک نظر ڈالیں حصول
پاکستان کیلئے یہ نعرہ لگایا تھا۔ پاکستان کا مطلب کیا لا الٰہ الا اللہ
یعنی جب یہ خطہ پاکستان قائم ہو جائیگا۔ اس پر احکام خداوندی کے
مطابق حکومت قائم کی جائیگی چھوٹے سے لے کر چوٹی کے لیڈر کی
زبان پر یہی چیز تھی۔ بلکہ اب تک بھی یہ لوگ عوام کو دھوکا دینے کے لئے
ہر تقریر اسلام کے نام سے شروع کر کے اسلام کے نام پر ہی ختم کرتے ہیں
مگر خود پابندی آئین اسلام سے گھبراتے ہیں اور دستور اسلامی کے نفاذ
کیلئے کوئی سرگرمی نہیں دکھلاتے بلکہ جو نعرہ انہوں نے خود لگا کر مسند اقتدار
سنبھالی آج وہی نعرہ لگانے والے زیر عتاب آئے ہوئے ہیں اور غدار سمجھے
جاتے ہیں۔

صنعتی دیانت

قدیم مسلمان صنعت کار مضبوط اور پائیدار چیزیں بنانے کے عادی تھے۔ ان کا آج کل کی طرح ناپائیدار چیزیں بنانے کی طرف کبھی دھیان بھی نہ گیا تھا۔

چوتھی صدی ہجری میں بقول ابن حوقل:۔

"عدن۔ یمن اور ایران کے مختلف شہروں میں ایسے کپڑے بُنے جاتے تھے۔ جن کی بقا کی مدت پانچ برس سے بیس برس تک ہوتی تھی۔

سمرقند میں جو ایسا کپڑا تیار ہوتا تھا۔ وہ ویذاری کہلاتا تھا اس کی خوبی یہ تھی کہ کارخانے سے نکلنے کے بعد دھوئے بغیر لوگ اسے پہنتے تھے۔

خراسان میں نہ کوئی امیر ہے۔ نہ وزیر ہے۔ نہ قاضی ہے نہ دفتری کارندہ۔ نہ عامی ہے۔ نہ فوجی آدمی جو ان ویذاری

کپڑوں کو استعمال نہ کرتا ہو۔

میں نے خود اس کے ایک سے زائد کپڑے پانچ پانچ سال تک استعمال کئے ہیں۔ بیس بیس سال تک کام دینے والے کپڑے ان سے ذرا اچھی قسم کے تھے۔"

عمدہ و نفیس ہونے کی وجہ سے یہ کپڑے امرا و وزرا کے زیر استعمال تھے سستے اور پائیدار ہونے کے سبب غربا بھی استعمال کرتے تھے ایک ساٹھ سالہ انسان کے لئے عمر بھر میں تین جوڑے کافی ہو جاتے تھے متوسط نرخ پر اس قدر پائیدار کپڑے تیار کرنے کے لئے اس وقت سب پارچہ باف خوشحال تھے۔

آج کل جاپانیوں کی طرح پاکستانی صنعت کاروں میں بھی یہ رجحان عام پایا جاتا ہے کہ ناپائیدار چیز تیار کر دو تاکہ اس کے ناکارہ ہونے پر خریدار کو جلد بازار واپس آنا پڑے۔ اور سلسلہ روزگار بڑھتا رہے۔

بالفاظ دیگر یہ خدا کو رزاق سمجھنے کی بجائے اپنی عقل و تدبیر کو رزاق سمجھتے ہیں یہ دیانتی سے ناپائیدار چیزیں تیار کر کے عوام کو دھوکا دینے اور لوٹنے کی فکر میں رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ سیالکوٹ کی مشہور دساور جانے والی صنعتوں میں بھی اب بددیانتی ہونے لگی ہے جس کی وجہ سے گورنمنٹ پاکستان کو ان کی رجسٹریشن کرنی پڑی۔

دیانت کا نشہ

خسروِ دربارِ اشرفیہ خواجہ عزیز الحسن مجذوبؒ ڈپٹی کلکٹری کے عہدہ پر فائز تھے۔ اس میں دیانتداری سے کام کرنے کے امکانات بہت کم پاکر آپ نے استعفیٰ دے دیا۔ مگر حکومت انگلشیہ نے ایسے دیانتدار کو ہاتھ سے نہ جانے دیا۔ اور انسپکٹر آف سکولز بنا دیا۔

ایک مرتبہ آپ کو دورہ پر کسی جگہ جانا تھا۔ وقت تنگ تھا۔ اسٹیشن پر پہنچے گاڑی چلنے والی تھی۔ ٹکٹ لیتے تو گاڑی نکل جاتی۔ اسلئے دوڑ کر گاڑی میں سوار ہو گئے۔

منزلِ مقصود پر گاڑی سے اترنے کے بعد آپ نے ریلوے گارڈ سے بعجلت گاڑی میں سوار ہونے اور ٹکٹ نہ خرید سکنے کا عذر پیش کر کے کرایہ ادا کرنا چاہا۔ گارڈ نے ایک اپ ٹو ڈیٹ آدمی کی اس پیشکش پر اپنی طرف سے مروت دکھائی اور کہا۔

"چلو جی۔ معمولی بات ہے۔ آپ تشریف لے جائیں۔"

خواجہ صاحب بولے۔

"آپ ریلوے کے مالک نہیں اس کے صرف تنخواہ دار ملازم ہیں۔ آپ کو مالک کی طرف سے ایسی رعایت کا کوئی اختیار نہیں۔ میں دوسروں کا حق نہیں کھا سکتا۔ آپ اپنا کرایہ وصول کیجیے۔"

گارڈ نے پرواہ نہ کی آپ دوڑے ہوئے اسٹیشن ماسٹر کے پاس پہنچے۔ انہیں تمام واقعہ بتلا کر کرایہ وصول کرنے کے لئے کہا۔ اسٹیشن ماسٹر بھی معاملہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے پیچھے سے گارڈ بھی پہنچ گیا اور اس نے اسٹیشن ماسٹر سے کہا۔

"انہوں نے پی رکھی ہے"۔

خواجہ صاحب نے فرمایا۔

"واقعی میں نے وہ مے پی ہوئی ہے جو آپ کو نصیب نہیں"

یہ کہہ کر آپ نے اسی قیمت کا ٹکٹ خرید کر ان کے روبرو پھاڑ دیا۔ تاکہ حق العباد ان کے ذمہ نہ رہے۔

آج کل بددیانت کو لائق اور دیانتدار کو "ان فٹ" یعنی نالائق تصور کیا جاتا ہے جس ادارہ سے بھی جو منسلک ہے وہ اسے ذاتی ملکیت تصور کرتا ہے اور ذاتی منفعت کے لئے استعمال کرتا ہے۔

بے مثال دیانت

دورِ حاضرہ کے مجدد حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے مکان کے پاس ایک سب انسپکٹر پولیس کا مکان تھا۔ وہاں اکثر رنگ رلیاں منائی جاتی تھیں۔ ان سے نہ صرف حضرت تھانویؒ کے آرام و سکون میں خلل پڑتا تھا بلکہ دوسرے ہمسائے بھی ان سے تنگ آئے ہوئے تھے۔

جب یہ معاملہ حد سے بڑھنے لگا۔ تو حضرت تھانویؒ نے یہ مکان ہی خرید کر لینے کا فیصلہ فرمایا۔ جو اس سب انسپکٹر کی ذاتی ملکیت تھا تاکہ ہمیشہ کی کوفت سے نجات مل جائے۔

آپ نے ایک دلال کو بلا کر اس سے اپنے اس ارادہ کا اظہار فرمایا اور اسے تاکید کی کہ جس بھاؤ بھی ہو۔ اس مکان کا سودا کرا دے۔
دلال نے اپنے طور و طریقہ سے سب انسپکٹر مذکور کو مکان فروخت کرنے کی ترغیب دی معقول قیمت ملنے کی امید دلائی سب انسپکٹر

رضامند ہوگیا۔ مگر کسی آخری فیصلہ پر پہنچنے سے قبل اس نے اپنے نیک ہمسایہ سے مشورہ لینا ضروری سمجھا۔

سب انسپکٹر حضرت تھانویؒ کی خدمت میں حاضر ہوا تمام واقعہ بیان کیا اور مشورہ پوچھا کہ اس مکان کو فروخت کرنا میرے لئے بہتر رہے گا یا نہ۔

سب انسپکٹر کو اس بات کا علم نہ تھا۔ کہ جن سے وہ مشورہ طلب کر رہا ہے وہی اس مکان کے خریدار ہیں۔ اور بظاہر حضرت تھانویؒ کے لئے بھی یہ آزمائشی مسئلہ بن گیا۔ کیونکہ ایک طرف ذاتی تکلیف اور خواہش۔ دوسری طرف مشورہ کرنے والے کے حقوق کا معاملہ تھا۔

حضرت تھانویؒ نے مکان کی تنگی۔ جائے وقوع کی موزونیت شرفا کے پڑوس وغیرہ امور کے پیش نظر اپنی ذاتی خواہش کو قربان کرتے ہوئے سب انسپکٹر کو مکان فروخت نہ کرنے کا مشورہ دیا کیونکہ نیا مکان اس جیسا اور ایسے ماحول میں اس وقت ملنا ممکن نہ تھا۔

سب انسپکٹر نے واپس آکر دلال کو بتلا دیا۔ کہ

حضرت تھانویؒ نے اس مکان کو فروخت نہ کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ جو ہر طرح سے معقول ہے۔ اسلئے میں نے ان کے مشورہ کے پیش نظر اسے فروخت کرنے کا ارادہ بدل دیا ہے۔"

دلال اپنا سر پیٹ کر رہ گیا کہ مجھے تو مکان خریدنے کرانے کیلئے مامور کیا اور مالک مکان کو مکان نہ بیچنے کا مشورہ دیا۔ اسی حیرانی کے عالم میں وہ حضرت تھانوی کی خدمت میں پہنچا۔ اور اس کی وجہ پوچھی حضرت نے فرمایا۔

"تکلیف اور ضرورت بدستور ہے۔ مگر مشورہ جو صحیح تھا۔ وہی دیا ہے"

اس امانت و دیانت کے قربان جائیے۔ آج کون ہے جو اپنے ذاتی مفاد کو اس طرح قربان کر کے اپنے خلاف فیصلہ دے۔ بفضل تعالیٰ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے دامن فیض سے وابستگان کا بھی اکثر اس پر عمل دیکھا ہے۔ اور اس دربار کے تربیت یافتہ ہر جگہ احکام دین کی پابندی کی وجہ سے بہ آسانی پہچانے جاتے ہیں۔

---

(۱۰)

اثر و تاثیر

جلوۂ ایمان مستحکم اگر ہو بے نقاب

تیرے دروازے پہ جھک جائے جبینِ آفتاب

اثرِ اعمال

ملک شام میں اجنادین کے مقام پر جب رومیوں اور مسلمانوں کی فوجیں ایک دوسرے سے برسرِ پیکار ہوئیں۔ تو ہرقل کے بھائی لشکرِ روم کے سپہ سالار نے ایک عربی کو بطور جاسوس اسلامی فوج میں مسلمانوں کے اخلاق و عادات کا پتہ لگانے کے لئے بھیجا۔ اس نے واپس آ کر بتلایا کہ "یہ لوگ رات کو راہب اور عابد ہیں۔ اور دن میں بہادر شہسوار اگر ان کے بادشاہ کا بیٹا بھی چوری کرلے تو ہاتھ کاٹ ڈالیں اور اگر زنا کرے تو رجم کردیں۔ حق کے جاری کرنے میں کسی کی رعایت نہیں کرتے۔" سپہ سالار نے سن کر کہا "اگر تو نے سچ کہا ہے۔ تو زمین کے اندر اتر جانا اس سے بہتر ہے کہ ان لوگوں کا مقابلہ کیا جائے۔"

یہی وہ حالات تھے جن کو دیکھ کر ہر مخالف متاثر اور حقانیت اسلام کا قائل ہو جاتا تھا۔ مگر ہمارے اعمالِ سوء دیکھ کر نفرت کرنے لگتا ہے۔

دریائے نیل کے نام

گورنر مصر حضرت عمرو بن عاص نے خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ قبطیوں کے دستور کے مطابق جب تک ہر سال دریائے نیل میں ایک نہایت ہی خوبصورت لڑکی بناؤ سنگھار کے ساتھ نہ پھینکی جائے اس وقت تک اس میں پانی نہیں آتا۔ اب وہ وقت قریب ہے جیسا حکم ہو۔ ویسا کیا جاوے۔

آپ نے اسی وقت دریائے نیل کے نام ایک تہدید نامہ تحریر فرمایا کہ

"تیری پیدائش اس قسم کی ہے کہ تو بذاتہ کسی قسم کا نفع و نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ اگر تو اپنے اختیار و مرضی سے جاری ہوتا ہے تو ہمیں جاری ہونے کی کوئی ضرورت نہیں بند پڑا رہ۔ اور اگر تو اللہ تبارک و تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے۔ تو جس طرح جاری ہوا کرتا ہے اسی طرح جاری ہو جا والسلام"

اور عمر بن عاص کی طرف روانہ کیا کہ وہ ان کی طرف سے یہ خط دریائے نیل میں ڈال دیں حضرت علم بن سایہؓ یہ حکم نامہ لے کر اونٹنی پر سوار ہو کر سو سواروں کے جو خمس کا مال لائے تھے۔ مصر کی طرف روانہ ہو گئے شب و روز کی لگاتار کوشش کے بعد انہوں نے مصر پہنچ کر یہ خط حضرت عمر بن عاص کے سپرد کر دیا۔

اس وقت تک دریائے نیل جاری نہیں ہوا تھا بلکہ اسکے جاری ہونے کی میعاد ختم ہو چکی تھی لوگ زراعت سے قطعاً مایوس ہو گئے تھے اور ہر کس و ناکس کی نظریں پانی کی آمد کی تلاش میں بے تابانہ دریائے نیل کی طرف دوڑتی رہتی تھیں حضرت عمر بن عاص نے لوگوں کو صبر و حوصلہ کی تلقین کی امیر المومنین کے خط بنام دریائے نیل کا ذکر فرمایا اور خود دریائے نیل پر پہنچ کر وہ خط اس میں ڈال دیا۔

حضرت علم بن سایہؓ کا بیان ہے۔

"خدا کی قسم۔ ابھی پوری طرح صبح بھی نہیں ہونے پائی تھی کہ نیل ایک بحرِ ذخار کی طرح موجیں مارتا ہوا دکھلائی دینے لگا۔ اس حد سے کہ جہاں تک ہمیشہ چڑھا کرتا تھا کہیں دور نکل گیا اور اس طرح اس سال حضرت عمرؓ کے خط کی برکت سے مصر قحط کی وبا سے بچ گیا۔ اس کے بعد پھر کبھی یہ دقت پیش نہ آئی"

ایک ساحب بے شعور یا نعوذ دل کے مقابلہ میں کتنا مطیع و فرماں بردار نکلا۔

بارش کی دعاء

مقوقس شاہ مصر کی طرف سے تینس کی گورنری ابو ثوب کے سپرد تھی مقوقس اپنے بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا۔ یہ خود کو اس جزیرہ کا حکمران سمجھنے لگا۔ اسی دوران میں مسلمانوں نے مصر پر قبضہ کر لیا۔ اور حضرت یزید بن عامرؓ بطور ایلچی ابو ثوب سے خراج وصول کرنے گئے۔

ابو ثوب کی اس حکمرانی میں کاشت تمام تر بارش کے پانی سے ہوا کرتی تھی۔ اس نے کچھ تالاب بنوا رکھے تھے جن میں بارش کے موقعہ پر اس قدر پانی جمع ہو جاتا تھا کہ دوسرے سال تک کافی ہو جاتا۔ گرمی کے موسم میں جب بارشوں کا سلسلہ موقوف ہو جاتا تو انہی تالابوں کے پانی سے لوگ اپنی زراعتوں کو سیراب اور باغوں کو شاداب رکھتے تھے

جس سال حضرت یزید بن عامر کی سفارت کا یہاں ورود ہوا۔ وہ خشکی کا سال تھا۔ سردیوں میں بارش نہیں ہوئی تھی۔ تالاب اور حوضوں کا پانی خرچ ہو چکا تھا۔ کھیتیاں پژمردہ ہو گئی تھیں۔ قریب تھا کہ خشکی

اور گرمی کی وجہ سے بالکل سوکھ کر قحط کی صورت پیدا ہو جاتی۔

الثوب بہت مغرور تھا جب یہ وفد اس کے پاس پہنچا۔ وہ سونے کے تخت پر بیٹھا تھا۔ اس نے بلکتے بے شکن ڈال لئے عجب و غرور سے سر تک نہ اٹھایا۔ نہ ہی کسی درباری کو انہیں بٹھانے یا بیٹھنے کا اشارہ کرنے کی جرأت ہوئی۔ یزید بن عامر نے خود سلسلۂ گفتگو چلایا اور اس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ خوب مکالمہ ہوا۔ الثوب نے لاجواب ہو کر کہا۔

"اگر آپ کے دعوئی میں صداقت ہے اور آپ کی یہ تمام گفتگو سچی اور مبنی بر حق ہے تو اپنے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وسیلہ سے خدا سے بارش کی دعا کرو۔ اگر پانی برس گیا تو ہم سمجھیں گے کہ واقعی تمہارا کلام بالکل سچ ہے اور اس میں کوئی شک نہیں۔"

یزید بن عامر ان اللہ یفعل ما یشاء و ھو علیٰ کل شیئ قدیر کہتے ہوئے وہاں سے اُٹھے وضو فرمایا۔ دو رکعت نماز ادا کر کے دونوں ہاتھ اُٹھا کر اللہ سے بارش کیلئے دعا کرنے لگے۔ وقاص بن جبیر کہتے ہیں "دعا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی کہ گھنگھور گھٹا اُٹھی۔ بادل گرجنے لگے۔ بجلی کوندنے لگی۔ رعد و برق کی ہیبت و ہولناک آواز سے ہیبت پیدا ہونے لگی۔ اور بارش شروع ہو گئی جس سے ہر طرف جل تھل ہو گیا" مومن کے ہاتھ اُٹھتے ہی قبولیت پیش قدمی کرتی ہے۔

تیروں کی بارش

مدائن کا قصرِ ابیض فتح کر کے مسلمان آگے نکل گئے۔ فارس کے چند نوجوان موقعہ پا کر اس میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے عہد کیا کہ قیامت تک اسے کسی کے حوالے نہیں کرینگے۔

مسلمانوں کو جب اس کی اطلاع ملی تو حضرت قعقاعؓ کے آدمیوں نے جا کر اس کا محاصرہ کر لیا۔

محاصرہ نے طول کھینچا۔ محاصرین نے حضرت سعدؓ کے پاس شکایت بھیجی کہ ان سب لے دینوں کے محاصرہ کی وجہ سے ہم جہاد سے محروم ہو گئے ہیں۔

انہوں نے حضرت سلمانؓ کو بھیجا کہ وہ جا کر کوئی تدبیر کریں۔ آپ کے وہاں پہنچنے پر محصورین نے تیر اندازی بند کر دی پوچھا کہ تم کون ہو آپ نے فرمایا۔

"میں مسلمانوں کا قاصد ہوں۔ انسان اپنے نفس اپنی اولاد اور اپنے مال کی خاطر اس وقت تک لڑا کرتا ہے جب تک اسے بچنے کی امید ہوتی ہے لیکن میں تمہارے بچنے کی

کوئی صورت نہیں دیکھتا کیونکہ تمہارا بادشاہ بھاگ گیا ہے
اسکی بادشاہت پر ہم قابض ہو چکے ہیں۔ خزانہ ہمارے قبضہ
میں ہے۔ یہاں سوائے تمہارے کوئی آدمی نہیں بچا
تم قلعہ سے ڈرو خود کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہ قلعہ ہمارے سپرد
کردو۔ تمہیں امان ہے جس طرف چاہو چلے جاؤ۔ تمہیں کوئی
شخص نہیں ٹوک سکتا۔

محصورین نے جب آپ کی یہ تقریر سنی۔ تو کہنے لگے کہ
جب تک ہم میں سے ایک شخص بھی زندہ ہے اس وقت تک
یہ قلعہ تمہارے سپرد نہیں ہو سکتا۔

یہ کہہ کر انہوں نے حضرت سلمان پر تیروں کی بوچھاڑ شروع کر دی
انہوں نے ان تیروں کو جو ان کی طرف بڑھتے تھے۔ ادھر ادھر منتشر
ہونے کا اشارہ کیا وہ انہیں لگنے کی بجائے دائیں بائیں گرنے
لگے۔ اور کسی تیر نے بھی حضرت سلمان کو نہ چھوا۔ جو اس وقت قلعہ میں
کھیلتے اور ہنستے تھے۔

محصورین ان کی قوتِ ایمانی کا یہ مظاہرہ دیکھ کر مشرف بہ اسلام
ہو گئے اور قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔ یہ اعجاز ایمانی تھا کہ غیر ذی روح بھی
تابع فرمان ہو جاتے تھے جس سے ذی روح کو سبق حاصل کرنا چاہیئے

حیوانات کی اطاعت

حضرت عقبہؓ کو افریقہ کا گورنر مقرر کر کے بھیجا گیا۔ آپ صرف بارہ ہزار سپاہیوں کی جمعیت سے ہر طرف چھا گئے۔ وہاں ایک بدسرشت قوم بربر رہتی تھی۔ جو بظاہر تابع فرمان ہو جاتی ہے۔ مگر جب عقبہ آگے گزر جاتے۔ تو پیچھے سے بغاوت کر دیتی۔ اسلئے عقبہ نے ان کے علاقہ میں ہی اپنا مستقر بنانے کا فیصلہ کیا۔

عقبہؓ نے اس غرض کے لئے وہاں ایک ٹکڑہ زمین منتخب کیا یہ جگہ نشیب میں واقعہ تھی۔ ہر طرف گھنے درخت اُگے ہوئے تھے اور جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ جن میں درندے۔ سانپ بچھو وغیرہ ایسے وحشی اور زہریلے جانور بکثرت رہتے تھے۔

اس جگہ کو ان سے فارغ کرانے کے لئے اس بندۂ مومن نے بارگاہِ رب العزۃ میں درخواست کی کہ

"خداوندا۔ ان سب چیزوں کو یہاں سے کہیں دور بھیج دے۔"

اس کے بعد آپ نے ہر جانور کا نام لے کر اسے پکارا اور اس سے کہا۔

"میں محمد رسول اللہ کا ساتھی ہوں اور یہاں مستقر بنانا چاہتا ہوں۔ اسلئے یہ مقام مجھے فارغ کر دو۔"

آپ کا یہ فرمانا تھا کہ درندے اور اژدھے وغیرہ اپنے بچوں کو منہ میں پکڑ کر یہاں سے نکلنا شروع ہوئے مسلمانوں اور بربروں کے سامنے سے گزر کر کسی اور مقام پر چلے گئے اور مسلمانوں نے بے فکر ہو کر اس جنگل کو صاف کر کے یہاں قیروان کا شہر آباد کیا اس واقعہ کا بربریوں پر ایسا اثر ہوا کہ انہیں پھر سرکشی کی ہمت نہ ہوئی

صرف جمادات ہی نہیں حیوانات بھی سرورِ دوجہاں کے رفقاء کا کس درجہ احترام کرتے تھے اور کس طرح ان کا حکم بجا لاتے تھے مگر ہمارے دلوں میں ان کے احکام کا احترام نہیں ورنہ ان کی نافرمانی کے مرتکب نہ ہوتے۔

پتھروں کی بارش

عبدالملک کے حکم سے حجاج بن یوسف نے حضرت ابن زبیرؓ کے مقابلہ کے لئے فوج بھیجی۔ وہ فرائضِ حج کی ادائیگی میں مشغول تھے۔ فوج نے کعبۃ اللہ کو گھیر لیا۔ ابوقبیس کے پہاڑ پر منجنیق نصب کر دی۔ اور اس سے کعبۃ اللہ پر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔

ادھر کعبۃ اللہ پر پتھر برس رہے تھے اُدھر آسمان پر بادل چھا گئے۔ اور بجلی زور سے چمکنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد شامی فوج پر بجلی گری جس سے ان کے بارہ آدمی ہلاک ہو گئے۔ اس سے شامی فوج کچھ سہم گئی۔ اور گولہ باری بند کر دی۔

دوسرے دن بھی آسمان ابر آلود رہا بجلی برابر چمکتی رہی اور حسب سابق بجلی گری اس کی زد میں ابن زبیرؓ کے بھی کچھ آدمی آ گئے۔ شامیوں نے اسے محض اتفاق سمجھا اور کسی قدرتی تنبیہ پر محمول کرتے ہوئے منجنیق سے پھر کعبۃ اللہ پر پتھر برسانے شروع کر دیئے۔

حضرت ابن زبیر عین منجنیق کے نشانہ کی زد میں تھے۔ سجدہ میں گرے ہوئے رب کعبہ سے محو راز و نیاز تھے۔ جو کچھ ہو رہا تھا۔ اس سے بے خبر تھے۔ مگر اس کا آپ پر کوئی خوف یا اثر بھی نہ تھا۔ جیسے کوئی واقعہ فی الواقعہ ہوا ہی نہیں رہا۔

ابن کثیر کا بیان ہے

"پتھر ہوا کے دوش پر اڑتے آتے اور ابن زبیر کے دائیں بائیں گرتے جاتے مگر ان کو ذرا برابر بھی پرواہ نہ تھی اور وہ سجدہ میں مست پڑے رہتے تھے"

شانِ صحابہ کا اندازہ لگائیے مسلمان فوج کعبۃ اللہ کے ادب و احترام کو بالائے طاق رکھ کر حضرت ابن زبیر پر پتھر پر پتھر برسا رہی ہے۔ مسلمان کا ہاتھ مسلمان کو ہلاک کرنے سے نہیں رکتا۔ مگر پتھر رک جاتا ہے۔

بے اثر آگ

سفاکِ اعظم حجاج بن یوسف کی ستم رانی کو عراق میں بیس سال ہی گزرے تھے کہ اس کی زندگی کا آفتاب غروب ہونے لگا۔ دکھوں بے گناہوں کو شدائد و مصائب میں مبتلا کرنے والے کو مرض الموت نے مصیبتوں کا مزہ چکھانا شروع کیا کہ ابو منذر یعلیٰ بن مخلد عیادت کو آئے اور پوچھا۔

”حجاج۔ موت کی سکرات اور سختیوں میں تیرا کیا حال ہے؟“

اُمتِ مسلمہ کے اس فرعون نے ٹھنڈی سانس بھری اور کہا

”کیا پوچھتے ہو۔ شدید مصیبت سخت تکلیف۔ ناقابل بیان الم۔ ناقابل برداشت درد۔ سفر دراز توشہ قلیل۔ آہ میری ہلاکت۔ آہ میری ہلاکت۔ اگر اس جبار و قہار نے مجھ پر رحم نہ کیا تو ———“

ابو منذر نے کہا۔

"اے حجاج! خدا اپنے انہیں بندوں پر رحم کھاتا ہے جو رحم دل اور نیک نفس رہتے ہیں۔ اس کی مخلوق سے بھلائی کرتے ہیں محبت کرتے ہیں۔ تو فرعون ہامان کا ساتھی تھا۔ تیری سیرت بگڑی ہوئی تھی تو نے اپنی ملت ترک کر دی تھی۔ راہِ حق سے ہٹ گیا تھا۔ صالحین کے طور طریقہ سے دور ہو گیا تھا۔ تو نے نیک انسان قتل کر کے ان کی جماعت فنا کر ڈالی۔ تابعین کی جڑیں کاٹ کر ان کا پاک درخت اُکھاڑ پھینکا۔ تو نے خالق کی نافرمانی میں مخلوق کی اطاعت کی۔ تو نے خون کی ندیاں بہا دیں۔ جانیں لیں۔ آبروئیں برباد کیں۔ کبر و جبر کی روش اختیار کی۔ تو نے نہ اپنا دین ہی بچایا نہ دنیا ہی پائی۔ تو نے خاندانِ مروان کو عزت دی مگر اپنا نفس ذلیل کیا۔ ان کا گھر آباد کیا مگر اپنا گھر ویران کر لیا۔ تو آج کے دن اور اس کے بعد سے غافل تھا۔ تو اس اُمت کے لئے قہر تھا۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے تیری موت کے سامان سے امت کو راحت بخشنے کا انتظام کیا ہے۔"

حجاج یہ بے لاگ تقریر سن کر مبہوت ہو گیا۔ دیر تک سناٹے میں رہا۔ آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ جو دوسروں کو مبتلائے مصیبت دیکھ کر ہنسا کرتا تھا۔ آج اس کی مصیبت پر موت ہنس رہی تھی۔

حجاج کے معدے میں کیڑے پڑ گئے۔ جسم کو ایسی سخت سردی

گئی کہ اسے دور کرنے کے تمام ذرائع و وسائل ناکام ہو گئے۔ اطبا نے لاچار ہو کر یہ تجویز کی کہ آگ کی ایسی انگیٹھیاں تیار کی جائیں۔ جو بدن کے ساتھ پیوست ہو سکیں۔

فوراً ایسی انگیٹھیاں تیار کرائی گئیں اور دہکتی ہوئی انگیٹھیاں اس کے جسم کے ساتھ لگا دی گئیں۔ مگر اس بے مثال ظالم کی سردی بھی بے نظیر تھی۔ اس نے آگ کا بھی اثر قبول نہ کیا۔ نہ آگ نے اس پر رحم کھایا۔ اور سردی کسی طرح کم نہ ہوئی۔

حجاج اپنی بے بسی پر یہ کہتے ہوئے رو دیا کہ

"میرے گناہ آسمان اور زمین کے برابر بھاری ہیں"

سردی یا گرمی بلحاظ خاصیت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور جہاں یہ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہو جائیں۔ تو ان کی حدت و شدت درجۂ اعتدال پر آجاتی ہے۔ مگر یہاں ان کا باہمی اتحاد بھی اعتدال پیدا نہ کر سکا۔ بلکہ ان مخالف قوتوں کے اتحاد نے دنیا پر یہ ثابت کر دیا کہ "جو دوسروں پر رحم نہیں کر سکتا۔ وہ خود بھی کسی رحم و کرم کا مستحق نہیں ہوتا۔"

(۱۱)

شجاعت و مردانگی

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی

اعترافِ دشمن

حجاج نے دس ہزار فوج کے ساتھ عبداللہ ابن زبیر پر حملہ کیا تھا۔ ساتھی انہیں اکیلا چھوڑ گئے۔ وہ تن تنہا مسجد میں آکر مقابلہ کرنے لگے سارا دن مقابلہ کرتے رہے۔ باوجود ۷۳ سالہ شجاع پر قابو نہ پا سکے دوسرے روز بھی ہزاروں پر ایک کا پلڑا بھاری دیکھ کر حجاج پکارا کہ او بزدلو۔ شرم کرو۔ وہ اکیلا تم ہزار در ہزار، خود پتھر مار کر ان کی پیشانی زخمی کر دی۔ ان کی تلوار نے بھی تیزی سے سروں کی فصل کاٹنی شروع کی۔ حجاج گھبرایا۔ اور یکبارگی حملہ کا حکم دیا شامیوں نے نیزوں اور تیروں کی بوچھاڑ سے اس شیر کو گھیر کر شہید کر دیا۔ سر کاٹ کر امام حسینؑ کی طرح نیزے پر چڑھایا۔ حجاج نے انہیں یوں خراج تحسین ادا کیا کہ "تم اکیلے ایک ہزار سے لڑ کر جیت سکتے تھے مگر یہاں دس ہزار آدمی تھے"۔ مومن عددی اکثریت کو کبھی خاطر میں نہیں لاتا۔ اور ہزاروں پہ بھاری نکلتا ہے۔

شیدائے پرچم اسلام

جنگِ احد کے موقعہ پر پرچم اسلام کی علمبرداری جوانِ رعنا عالم و فاضل مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے سپرد تھی جو بقول سرکارِ دوجہاں مکہ میں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش لباس تھے۔

جنگ جیت لی گئی مگر مسلمانوں کی ذرا سی غلطی سے یہ فتح شکست میں بدل گئی۔ لیکن پرچم اسلام بدستور لہراتا رہا۔

شکست کے بعد پرچم اسلام کی سربلندی نے کفار کو سخت برانگیختہ کر دیا۔ حضرت مصعبؓ کے ہاتھ سے جھنڈا چھین لینے کی غرض سے ایک شخص "قمہ" آگے بڑھا۔ اس نے علمبردار سے مقابلہ کیا اور اس زور سے تلوار چلائی کہ حضرت مصعبؓ کا ایک ہاتھ کٹ کر دور جا پڑا۔ اس نے بڑی پھرتی سے جھنڈا دوسرے ہاتھ میں تھام لیا۔ اور سرنگوں نہ ہونے دیا۔ ایسے کاری زخم لگنے پر نہ زبان سے اُف کی اور نہ قدم پیچھے ہٹایا۔ حضرت مصعبؓ کے اس شجاعانہ کارنامے

مشرکین کو نہ یارد و منتقل کر دیا۔ انہوں نے دوبارہ حملہ کیا۔ جس سے اس فدائے اسلام کا دوسرا ہاتھ بھی کٹ گیا۔

اس شیدائے حق نے جھنڈا اب بھی سرنگوں نہ ہونے دیا اور دونوں دست بریدہ بازوؤں سے پرچم اسلام کو سینے سے چمٹا لیا۔ بہ الفاظ دیگر خود اسلام سے ہی چمٹ گیا۔ سردار مشرکین "قمۂ" یہ دیکھ کر آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے تلوار پھینک دی، ترکش سے تیر نکال کر اسے ایسا مارا کہ حضرت مصعبؓ ٹھنڈے ہو گئے۔ مصعبؓ کے بھائی نے بڑھ کر جھنڈا پکڑ لیا اور اس طرح کفار کے منصوبہ کو خاک میں ملا دیا۔

اسلام ایسی جاں نثاروں کی قربانیوں سے چمکا۔ ورنہ آج ایسا کون ہے جو حسن و جمال، جوانی و رعنائی اور علم و فضل کے ساتھ مرد میدان بھی ہو۔

قوتِ ایمان کا مظاہرہ

ایران میں حضرت سعد اور یزدجرد کا جس وقت میدان جنگ میں آمنا سامنا ہوا۔ اس وقت تیس ہزار مجاہدین دشمن کی تین لاکھ فوج سے مقابلہ کرنے کے لیے بیتاب کھڑے تھے۔ دشمن کے پاس بہترین سامانِ حرب موجود تھا۔ مسلمانوں کے پاس چرخے کے تکلے برابر صرف نیزے تھے۔ ایرانی سپاہیوں کے نیچے بڑے بڑے قدآور گھوڑے زرق برق ہتھیاروں سے لیس تھے۔ عرب گدھوں کے برابر گھوڑوں کی ننگی پیٹھوں پر سوار تھے۔

جنگ شروع ہونے سے قبل رستم و سعد کے درمیان نامہ و پیام شروع ہوا۔ مسلمانوں کی طرف سے نمائندگی کے فرائض ادا کرنے کے لئے ربعی کو بطور قاصد رستم کے دربار میں بھیجا گیا۔ اس وقت رستم کے دربار کے جاہ وجلال کی یہ حالت تھی۔

"رستم سونے کے تخت پر جلوہ افروز تھا سنہری تاروں سے بنے

ہوئے زرق برق تکیئے تخت کی زینت بڑھا رہے تھے
سنہری فرش بچھا ہؤا تھا۔ رستم تاج پہنے ہوئے تھے۔
درباری اطراف میں بہترین قسم کے لباس پہنے ہوئے
باقاعدہ ایستادہ تھے۔ دربار کے اطراف میں گرد پھیلی تھی
زرق برق جھولوں سے دربار کے رعب کو بڑھا رہے تھے"
کہ ربعی گردن میں تلوار ڈالے ایک ہاتھ میں نیزہ اور دوسرے میں
کمان سنبھالے ہوئے گھوڑے پر سوار نیزے سے قیمتی فرش کو کچوکے
دیتا ہؤا اور درباری ہیبت سے بے پرواہ ہو کر تخت کے قریب آکر
گھوڑے سے اترا اور وہیں گھوڑا باندھ دیا۔ ادھر نیزے کی نوک سے
فرش کٹتا جاتا تھا۔ اُدھر اس کی ہر حرکت درباریوں کا سینہ چاک کر
رہی تھی۔ قوت و شوکت کے اس دہشتناک سامان کو خاطر میں نہ لانے
والے قاصد کے انداز آمد سے درباری چیخ اُٹھے کہ اس بے ادب کو
روک لو۔ رستم نے ایسا کرنے سے منع کیا۔ یہ بے خوف بہادر عین تخت
کے سامنے جا کر رکا۔ اور نیزے پر زور دیکر کہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم نے فرمایا تھا کہ اسلام اس تخت تک پہنچیگا۔ رستم کی ہر بات کا اس نے
حکیمانہ جواب دیا جس سے رستم کا دل لرز گیا اور درباریوں پر ہیبت چھا گئی
شاہی فرش کی یہ کاٹ نیزہ کی نہ تھی بلکہ اس قوت ایمانی کی تھی جو ہم میں نہیں

مسلمانوں کی خصوصیات

مقوقس شاہِ مصر نے عمر بن عاص کا مقابلہ کرنے کے لئے جو فوج بھیجی تھی جب اس کے سپاہی واپس ہوئے تو اس نے ان سے پوچھا "تم نے مسلمانوں کو کیسا پایا؟"

سپاہیوں نے اپنے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر جواب دیا۔

"اے بادشاہ ہم نے ایک ایسی قوم کو دیکھا ہے۔ جو موت کو زندگی سے زیادہ عزیز و محبوب رکھتی ہے۔ کبر و نخوت سے زیادہ تواضع کو پسند کرتی ہے۔ اس قوم کا کوئی فرد بھی دنیا کو مرغوب نہیں رکھتا۔ اور نہ دنیا سے لگاؤ رغبتی انہیں طول اور رنجیدہ رکھتی ہے۔ زمین پر بیٹھتی ہے اور سواریوں پر کھانا ان کے لئے دشوار نہیں ہے ان کے امیر و غریب اس طرح مساوات سے زندگی بسر کرتے ہیں کہ کوئی چھوٹا بڑا معلوم ہی نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ

غلام اور آقا میں فرق محسوس نہیں ہوتا جب ان کی نماز
کا وقت آتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی ایسا باقی نہیں
رہتا، جو عبادت میں حاضر نہ ہو۔ یہ لوگ عبادت سے
پہلے ہاتھ منہ دھو (وضو کر) لیتے ہیں۔ اور نماز انتہائی
خشوع و خضوع سے پڑھتے ہیں۔"

مقوقس مسلمانوں کی یہ خصوصیات سن کر انگشت بدنداں رہ گیا۔
کچھ سکوت اختیار کرنے کے بعد اس نے اپنی قوم کو یقین دلایا کہ
"اگر یہ قوم پہاڑ کو اکھیڑنے کا ارادہ کرے گی۔ تو یقیناً
اس میں کامیاب ہوگی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ دنیا میں کوئی بھی اس
قوم سے لڑ کر فتح حاصل نہیں کر سکتا۔"

دشمنوں کی طرف سے ایسی سند کسی دوسری قوم کو کہاں نصیب۔
مسلمان جب تک ان خصوصیات کے حامل رہے دنیا ان سے خائف
رہی لیکن جونہی انہوں نے ان خصائل کو چھوڑ دیا۔ محکوم و مغلوب اور
مرعوب ہو کر رہ گئے۔ اس "ماضی" کا یہ "حال" کتنا عبرت ناک ہے مگر
پھر بھی عبرت حاصل نہیں کی جاتی۔

حسرتِ شہادت

حضرت خالدؓ بن ولید قرونِ اولیٰ کے وہ جانباز اور سرفروش مجاہدِ اسلام تھے جنہوں نے شجرِ اسلام کو اپنے خون سے سینچا۔ اور دینِ کامل کی ترویج و اشاعت میں دم واپسیں تک مصروف رہے۔ حق تعالیٰ نے اس مردِ مجاہد کو وہ جرأت شجاعت اور قوت عطا فرمائی تھی کہ جب بھی شمشیر آبدار نیام سے باہر نکالتے تھے تو سو پچاس مشرکین اس کی دھار کا اندازہ کرتے ہیں کام آجاتے تھے۔ بھوک پیاس اور دیگر معاشرتی مجبوریوں کے باوجود انہوں نے کبھی میدانِ جہاد سے قدم نہیں ہٹایا تھا۔ اسلام قبول کرنے کی وجہ سے اپنے عزیز واقارب کی نظروں سے گر گئے تھے مخلص احباب نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ خانہ بربادی اور غربتِ وطن کی بے پناہ صعوبتیں صرف بلندیِ اسلام کی خاطر خندہ پیشانی سے برداشت کیں۔ مگر کسی موقعہ پر بھی اس شجاع کے پائے ثبات میں لغزش نہ آئی۔

انہیں قریباً ایک سو خونریز معرکوں میں شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھانے کا موقعہ ملا جن کے میدان میں نکلتے ہی دشمنوں پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی۔ بدن پر بالشت بھر بھی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں تلوار یا تیر کا زخم نہ ہو۔ مگر دل میں ایک بہت بڑی حسرت باقی تھی۔ اسکے پورا ہونے کی جب تمام امیدیں ختم ہو گئیں اور آپ اس عالم بست و بود سے رخصت ہونے لگے تو نہایت بھرائی ہوئی آواز میں بادیدۂ تر اپنی آخری تمنا کا یوں انکشاف کیا۔

"یہ آرزو مدت ہائے دراز سے میرے گوشۂ قلب میں پرورش پا رہی تھی۔ کہ میں کسی میدان کارزار میں جہاد فی سبیل اللہ کرتا ہوا جام شہادت کے مرتبہ بلند پر فائز ہو کر ملک العزیز العلام کے الطاف و افضال سے ہمکنار ہوں۔ واحسرتا! کہ میری اس آرزو کو پورا ہونے کا موقع نہ ملا۔ اور آج میں بستر علالت پر پڑا دم توڑ رہا ہوں"۔

اب تو جہاد اور موت کے نام سے مسلمان گھبراتے ہیں اور اُس وقت اس کی تلاش اور یافت میں مسلمان اس طرح پھرا کرتے تھے۔ جیسے آج کل سینما کے شوقین۔

پاؤں کی تلاش

یرموک کے میدانِ جنگ میں دو لاکھ عیسائیوں کا صرف ۲۰۔۲۵ ہزار عربوں نے مقابلہ کیا تھا جن میں عورتیں بھی شامل تھیں۔ رومیوں کے جوش کا یہ عالم تھا کہ تیس ہزار عیسائیوں نے پیچھے نہ ہٹنے کی قسم کھا کر پاؤں میں بیڑیاں ڈال لی تھیں اور مسلمانوں کو پیچھے ہٹنے سے روکنے کے لئے عورتوں کو خیموں کی چوبیں سنبھالنی پڑی تھیں۔ یہ بڑے معرکے کی جنگ تھی جسے جیتنے کے لئے فریقین نے اپنی قوت و طاقت کا آخری داؤ لگا رکھا تھا۔ ایک ایک سپاہی شجاعت و مردانگی کے جوہر دکھا رہا تھا۔ دو لاکھ سے ۲۰۔۲۵ ہزار کا مقابلہ ایک بہت بڑی جسارت تھی۔ رومیوں نے کئی مرتبہ مسلمانوں کے پاؤں اکھاڑ دیئے۔ مگر انہوں نے ہر مرتبہ اپنی پوزیشن سنبھالنے میں حیرت انگیز جرأت کا ثبوت دیا۔ بالآخر فتح و نصرت نے مسلمانوں کے قدم چومے رومیوں کو شکست فاش ہوئی۔ اس جنگ میں طبری کے بیان کے

مطابق ایک لاکھ کے قریب رومی مارے گئے اور مسلمانوں کا صرف تین ہزار جانوں کا نقصان ہوا۔

مسلمانوں کے جم کر لڑنے اور "فنا فی الجنگ" ہونے کا صحیح اندازہ اس واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے کہ جس وقت گھمسان کی لڑائی ہو رہی تھی۔ تو کسی نے اسلام کے بہادر اور جانباز سپاہی حباش بن قیس کے پاؤں پر اس زور سے تلوار ماری کہ اس کا پاؤں کٹ کر دور جا پڑا۔ لیکن ایسے مقابلہ کے جوش اور محویت کے عالم میں اس کا احساس تک نہ ہوا کچھ دیر بعد جب لڑائی کا زور کم ہوا اور یہ جانباز ہوش میں آیا۔ تو پکارا کہ میرا پاؤں کہاں ہے۔

یہ کہہ کر وہ اپنے پاؤں کی تلاش میں ادھر اُدھر ایسے پھرنے لگا جیسے کوئی گرے ہوئے روپے پیسے کی تلاش کرتا ہے دوران تلاش بھی اسے پاؤں کے کٹنے کی تکلیف کا ذرہ بھر احساس نہ تھا۔ جیسے وہ فی الواقعہ کٹا ہی نہ ہو۔ ان کے قبیلہ کے لوگ اس واقعہ پر ہمیشہ فخر کرتے تھے۔

مگر اس زمانہ میں تو ہمارے نوجوان اس قدر نازک واقع ہوئے ہیں کہ کوئی کانٹا چبھ جائے تو دراز ہو جاتے ہیں۔

ہمتِ مرداں

اموی خلیفہ الحکم نے فرانس کا کچھ حصہ فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا تھا۔ جس میں بہ شلونہ بھی شامل تھا۔ بعد ازاں اس نے نہ صرف اپنے دامنِ حکومت کو زیادہ پھیلانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ بلکہ مفتوحہ علاقہ کی طرف پوری توجہ بھی نہ دی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اہل فرانس نے اپنے کھوئے ہوئے علاقہ کی واپسی کے لئے مسلح جد و جہد شروع کر دی۔ اسی جد و جہد میں فرانسیسیوں نے بہ شلونہ کا محاصرہ کر لیا۔ جس کا حاکم زبیر نامی ایک بہادر اور پکا مسلمان تھا۔ جو مسلمانانِ اندلس کی نیابت کے فرائض انجام دیتا تھا۔ مگر الحاکم کی عدم توجہی کی وجہ سے یہ خود مختار سا ہو گیا تھا۔

فرانسیسیوں نے بہت بڑے لشکر سے اس شہر پر حملہ کیا۔ زبیر اور اس کی مسلم و غیر مسلم رعایا نے اس بے جگری کے ساتھ فرانسیسیوں کا مقابلہ کیا۔ جس کی مثال نہیں ملتی۔ ان کی جرأت و بہادری نے بالآخر دشمن کو

شہر کے محاصرہ کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس محاصرہ نے طول کھینچا۔ اہل شہر
اس امید میں تھے کہ الحکم ان کی امداد کے لئے فوج بھیجے گا۔ مگر اس
نے ملکی مصالح کی بنا پر ان کی کوئی امداد نہ کی۔ اپنے بازوؤں میں جس
قدر قوت تھی۔ اس سے انہوں نے دشمن کو شہر میں داخل ہونے سے
روک رکھا تھا۔ محاصرے کی شدت نے انہیں پریشان کرنے کی
بڑی کوشش کی۔ لیکن یہ مسلمان بھی کوئی سخت جان واقعہ ہوئے تھے۔
انہوں نے محاصرہ کی تکالیف کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا۔
جو کچھ اپنے پاس ذخیرہ تھا۔ وہ جب ختم کر بیٹھے۔ تو حرام جانور ذبح
کرکے کھانے شروع کر دیئے۔ جب وہ بھی ختم ہو گئے۔ تو سوکھے چمڑے
بھگو بھگو کر کھائے۔ مگر اسلامی غیرت پر آنچ نہ آنے دی اور دشمن
کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر رضامند نہ ہوئے۔ یہاں تک کہ بھوک
نے ان کی ساری قوتیں چھین لیں۔ اور جب یہ مشتِ استخواں بن کر
رہ گئے تو سات ماہ کے محاصرہ کے بعد فرانسیسی شہر میں داخل ہو سکے۔
صاحب ایمان مسلمان نقدِ جاں پیش کر سکتا ہے مگر دشمن کے
سامنے سرنگوں نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب وہ زمانہ نہیں رہا۔ روٹی کے
کے چند ٹکڑوں کے عوض ایمان تک فروخت کر دیا جاتا ہے۔

شہادت کے شوقین

مسلمان اپنی فتوحات کی جہاں آخری سرحد قائم کرتے تھے۔ وہاں حفاظتی اور مدافعتی اغراض کے لئے فوجی چوکیاں اور چھاؤنیاں قائم کر دیتے تھے۔ جو "رباط" کہلاتی تھیں۔ ان میں حسب ضرورت باضابطہ فوج رکھی جاتی تھی۔

چونکہ اس زمانہ میں مسلمانوں میں ولولہ جہاد اور شوق شہادت عام تھا۔ اسلئے مسلمان ان رباطوں میں خود بخود رضا کارانہ طور پر اکثر پہنچ جاتے تھے۔ وہیں فوجی تربیت حاصل کرتے تھے اور اس انتظار میں کئی کئی مہینے وہاں گزار دیتے تھے کہ جب دشمن کوئی چھیڑ چھاڑ کرے۔ تو یہ فضیلت جہاد و شہادت حاصل کر سکیں۔

ایسے لوگوں کے لئے ان چوکیوں اور چھاؤنیوں کے قرب و جوار میں بڑے بڑے مکان اور عمارتیں بنی ہوئی تھیں۔ جن میں اس علاقہ کے مجاہدین آ کر فروکش ہوتے تھے۔

ابن حوقل لکھتا ہے :-

"ان سرحدی چوکیوں میں رہنے والے مجاہدین کے ساتھ لوگ بڑی فیاضی کا سلوک اور دل کھول کر داد و دہش کرتے تھے حکومتوں کی طرف سے بھی اور عام ارباب ثروت و دولت کی طرف سے بھی بڑی بڑی بیش قرار رقمیں اور مختلف قسم کی چیزیں مسلسل آتی رہتی تھیں۔ مسلمان ان میں رضا کارانہ طور پر اس اسلامی فرض کو پورا کرتے تھے میں نے سجستان ۔ کرمان ۔ فارس ۔ خوزستان جبال طبرستان الجزیرہ آذربائیجان ۔ عراق ۔ حجاز ۔ یمن ۔ شامات مصر اور مغرب میں کوئی قابل ذکر رئیس یا بڑا آدمی ایسا نہیں پایا جس کی طرف سے ان رباطی مقامات پر بڑے زرخیز دیہات اور شہروں کی دکانیں وقف نہ ہوں۔"

اس دور کے امراء و روساء کا عمل اس کے سراسر برعکس اس پر ہے کہ ع

بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

مقصدِ حیات

سنہ ۷۱۱ عیسوی میں شمالی افریقہ کی فتوحات سے فارغ ہو کر موسیٰ ابن نصیر نے طنجہ کے گورنر طارق بن زیاد کو ان کی خداداد فوجی صلاحیتوں اور قابلیتوں کے پیشِ نظر سپین پر حملہ کرنے کے لئے منتخب کیا۔

طارق ابن زیاد نے سات ہزار فوج کو چار بڑی کشتیوں میں سوار کر کے آبنائے طارق کو عبور کیا۔ آپ نے ساحل پر اترتے ہی پہلا حکم یہ دیا کہ ان تمام کشتیوں کو جلا دیا جائے۔ اس حکم کی فوراً تعمیل کی گئی اور کشتیوں کا یہ مختصر سا بیڑا جلا کر راکھ کر دیا گیا۔

طارق ابن زیاد کے اس عاجلانہ اقدام نے بعض فوجی مدبروں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے طارق سے پوچھا۔

"آپ نے یہ کیا کیا۔ اگر خدانخواستہ ہمیں شکست کا سامنا ہوا۔ تو ہم اپنے وطن کو کیسے واپس لوٹ سکیں گے"

طارق نے جواب دیا:

ہم یہاں اس لئے نہیں آئے کہ بھاگ کر وطن کو لوٹ جائیں۔ ہمارے آنے کے صرف دو مقصد ہیں۔ اول سپین کی فتح تاآنکہ خدا کی زمین عدل و انصاف سے بھر جائے اور ظلم و فساد کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ دوسرا مقصد یہ کہ اگر ہم کو کفار کے ہاتھ سے شکست ہو جائے۔ تو ہم درجہ شہادت حاصل کریں اور اسی سرزمین پر اپنے خون کے قطرے ٹپکا کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں۔ یاد رکھو۔ ہمارا وطن اب یہی سرزمین ہے۔ یا تو اس کی خاطر مرینگے یا اس کو فتح کر کے دم لیں گے۔"

اس تقریر نے تذبذب کی حالت استقامت میں بدل دی۔ فوج کے حوصلے زیادہ مضبوط ہو گئے اور کامیابی و کامرانی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی۔ غور کیجئے! کہ اس مجاہد کا مقصد اپنی حکومت و امارت قائم کرنا نہیں تھا۔ بلکہ اپنے خالق و مالک کے نام کو بلند کر کے اسکے دین کو پھیلانا اور ظلم کو مٹانا تھا۔ جس نے اسکے نام اور اسکے دین کی سربلندی کو مقصد حیات ٹھہرایا۔ اس نے اپنے پرستار و پروانہ کے نام کو بھی دنیا سے مٹنے نہیں دیا۔ بلکہ آبنائے طارق جبل الطارق اور طاریفا زبانِ حال اس کی عظمت و شوکت کا نقارہ بجا رہے ہیں۔

تقدیر سے جنگ

نسلِ تیموریہ کا آخری شجاع عالمگیر ابھی چودہ ہی برس کا تھا کہ اس
پر ہاتھی نے حملہ کر کے اس کے گھوڑے کو سونڈ سے پکڑ کر دور پھینک دیا
عالمگیر نے پھرتی سے اُٹھ کر اس پر تلوار سے ایسا وار کیا کہ اُسے جان
بچانی پڑی۔ دارا شکوہ کی جنگ میں اس نے صرف پچیس تیس ہزار سے
ایک لاکھ سوار اور بیس ہزار پیادہ فوج کا مقابلہ کیا۔ اس کے چیدہ
چیدہ رسالے پسپا ہو گئے۔ وہ تنہا رہ گیا۔ بمشکل ایک ہزار آدمی اس کے
گرد ہوں گے۔ مگر اس کی جبینِ شجاعت پر بل نہ آیا۔ اور ایک ہزار
سے ایک لاکھ پر فتح پائی شہزادگی کے زمانہ میں اسے بلخ کی مہم پر
بھیجا گیا تھا۔ جہاں یہ عبدالعزیز خاں سے معرکہ آرا ہوا۔ میدان کا رزار
گرم تھا۔ تیروں اور نیزوں کی بارش ہو رہی تھی کہ ظہر کی نماز کا وقت آگیا
عین جنگ کے دوران میں اور جنگ کے میدان میں یہ پیکرِ استقلال
اپنے گھوڑے سے اترا۔ نماز کی صف قائم کر کے نہایت سکون و اطمینان

سے نماز پڑھنے میں مشغول ہو گیا۔ عبدالعزیز خاں نے جب یہ دیکھا کہ اس نے تیروں کی بوچھاڑ میں فرائض و نوافل نہایت خشوع و خضوع سے ادا کر لئے ہیں تو بہت حیران ہوا۔ اس حیرت انگیز سماں نے عبدالعزیز کو اتنا متاثر کیا کہ وہ ــــ یہ کہتے ہوئے کہ

"اس شخص سے لڑنا تقدیر سے لڑنا ہے"

لڑائی سے دست بردار ہو گیا۔

جوانی کا یہ جوش بڑھاپے تک قائم رہا۔ جبکہ ۸۲ برس کی عمر میں ستارا کے مقام پر مرہٹوں کے مقابلہ کیلئے گھوڑا دوڑا کر پہنچ گیا۔ مگر ذوالفقار جنگ نے بمشکل اس عمر میں میدان جنگ میں سرداری سے روکا۔ عالمگیر کی اسی بے نظیر جرأت و استقامت نے اس کے سب سے بڑے مخالف الفنسٹن کو بھی اس کی تعریف پر مجبور کر دیا تھا۔

آج کل ایسی شجاعت کے نظارے کہاں! اب تو معمولی معمولی عذرات پر فرائض و واجبات ترک کر دیئے جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے جب تک اپنے رب ذوالجلال کے آستانہ کو اپنی جبینوں سے آباد رکھا۔ دنیا پر غالب رہے۔ اور جب انہوں نے اس کے دروازہ کی غلامی چھوڑی تو محکوم و مغلوب ہو گئے۔

بیوی کے نام

مجاہدِ اسلام انور پاشا نے اپنی اہلیہ محترمہ کو میدان جنگ سے جو آخری خط لکھا اس میں دیگر امور کے علاوہ یہ بھی تحریر فرمایا۔

"تمہارا آخری خط اس وقت میرے پاس ہے۔ جو ہمیشہ میرے سینہ سے لگا رہیگا۔ تمہاری صورت کو اگرچہ نہیں دیکھ سکتا۔ مگر خط کی سطروں اور حرفوں میں تمہاری نازک انگلیاں مجھے ہلتی نظر آرہی ہیں وہ انگلیاں جو کبھی میرے بالوں سے کھیلا کرتی تھیں۔ میں تمہارا محبت بھرا دل توڑ کر اس دور دراز افتادہ مقام پر آگ و خون سے کھیل رہا ہوں۔ اور ذرہ پرواہ نہیں کرتا۔ کہ ایک عورت میرے فراق میں رات بھر تارے گنتی رہتی ہے۔ تم نے لکھا ہے کہ مجھے جنگ سے محبت اور تلوار سے عشق ہے میں نے کبھی کسی سے محبت نہیں کی۔ لیکن ایک وہ تم ہی ہو۔ جس نے میرا دل مجھ سے بالکل چھین رکھا ہے تمہارا یہ لکھنا بجا ہے۔ کہ میں تم سے اسلئے جدا نہیں ہوں کہ مال و دولت کا طالب ہوں۔ اسلئے بھی جدا

نہیں کہ اپنے لئے تخت شاہی قائم کر رہا ہوں جیسا کہ میرے دشمنوں نے مشہور کر رکھا ہے۔ میں تم سے اسلئے جدا ہوں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا فرض مجھے یہاں کھینچ لایا ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ سے بڑھ کر کوئی فرض نہیں۔ یہی وہ فرض ہے جس کی ادائیگی کی محض نیت ہی آدمی کو فردوس بریں کا مستحق و وارث بنا دیتی ہے۔ الحمد للہ کہ میں اس فرض کی نیت ہی نہیں رکھتا بلکہ اسے عملاً انجام بھی دے رہا ہوں۔ تمہاری جدائی ہر وقت میرے دل پہ آرے چلایا کرتی ہے۔ مگر میں اس جدائی سے جتنا خوش ہوں اتنا کسی دوسری چیز سے نہیں۔ کیونکہ صرف تمہاری محبت ہی ایک ایسی چیز ہے۔ جو میرے عزم و ارادہ کے لئے سب سے بڑی آزمائش ہو سکتی ہے۔ مگر اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس آزمائش میں پورا اترا۔ اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی محبت و حکم کو اپنی محبت اور نفس پر مقدم رکھنے میں کامیاب ہو گیا۔ تمہیں بھی خوش ہونا اور شکر ادا کرنا چاہیئے کہ تمہارا شوہر اتنا مضبوط ایمان رکھتا ہے کہ خود تمہاری محبت کو بھی اللہ کی محبت پر قربان کر سکتا ہے۔ تم پر تلوار سے جہاد فرض نہیں۔ لیکن تم بھی جہاد سے مستثنےٰ نہیں ہو۔ تمہارا جہاد یہ ہے کہ تم بھی اپنے نفس اور محبت پر اللہ کی محبت کو مقدم رکھو۔ اپنے شوہر کو بہت مضبوط کرتی رہو۔

دیکھو۔ یہ دعا ہرگز نہ کرنا کہ تمہارا شوہر میدان سے واپس آجائے کیونکہ یہ دعا خود غرضی و خود مطلبی کی دعا ہوگی۔ اور خداوند تعالےٰ کو پسند نہ آئے گی۔ البتہ یہ دعا کرتی رہو۔ کہ تمہارے شوہر کا جہاد اللہ سبحانہ وتعالےٰ قبول فرمائیں۔ فتح یاب واپس لائیں۔ ورنہ جام شہادت اسکے لبوں سے لگائیں۔ وہ لب جو تم جانتی ہو کبھی شراب سے ناپاک نہیں ہوئے بلکہ تلاوت وذکر الٰہی سے ہمیشہ آشنا رہے اور رہیں گے۔

پیاری نجیبہ! آہ وہ ساعت کیسی مبارک ہوگی جب اللہ تعالیٰ کی راہ میں یہ سر جسے تم بہت خوبصورت بنایا کرتی تھیں۔ تن سے جدا ہوجائیگا۔ وہ تن جو تمہاری محبت کی نگاہوں میں سپاہیوں کا نہیں نازنینوں جیسا ہے۔

دنیا چند روزہ ہے موت یقینی ہے۔ پھر موت سے ڈرنا کیا جب موت آنے ہی والی ہے تو آدمی بستر پر پڑے پڑے کیوں مرے کیوں نہ میدانِ جہاد میں شہادت کی موت مرے۔ شہادت کی موت موت نہیں زندگی ہے اور لازوال زندگی۔

یہ خط دراصل اسلام کے اس لائق مجاہد کا آنے والی نسلوں کے نام ایک آخری پیغامِ عمل ہے۔ موت کے نام سے ڈرنے والوں کو موت سے کھیلنے والے کا یہ پیغام مبارک ہو۔

(۱۴)

تجارت اور دیانت

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے

سود ایک کا لاکھوں کے لیے مرگِ مفاجات

تجارتی دیانت

حسن بصریؒ کے فیض یافتہ غلام یونس بن عبید آسمانِ علم کے ایک روشن ستارہ کی حیثیت رکھتے تھے علم و فضل کے باوجود ریشمی کپڑے کی تجارت کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک خاص مقام پر ریشم کا نرخ چڑھ گیا۔ انہوں نے نرخ تیز ہونے کی وجہ سے اپنے لئے ایک دکاندار سے تیس ہزار کا ریشم خریدا جو سابقہ نرخ پر ملا۔ انہوں نے ریشم فروش سے پوچھا کہ نرخ چڑھنے کی کچھ خبر ہے؟ اس نے کہا اگر مجھے خبر ہوتی۔ تو میں اپنا مال کیوں بیچتا۔

یونس نے یہ سن کر خرید کردہ مال واپس کرکے اپنا روپیہ یہ کہتے ہوئے لے لیا کہ میں آپ کی بے خبری سے ناجائز فائدہ نہیں اٹھانا چاہتا تھا۔ اس زمانہ میں تجارت کا تمام تر دارومدار دیانت و امانت پر تھا۔ مگر آج کل ذخیرہ اندوزی۔ ناجائز منافع گیری اور بلیک مارکیٹ پر ہے۔ یہاں تک کہ قرآن شریف کی بلیک مارکیٹ کرنے سے بھی گریز نہیں کیا گیا۔

دیانت کی انتہا

دوسری صدی ہجری میں دنیوی تجارت اُخروی منافع کی اساس پر کی جاتی تھی۔ تجار ہر مرحلہ پر دیانت داری و امانداری سے لین دین کرتے تھے۔ اور حقوق العباد کا زیادہ خیال رکھتے تھے۔ اُس زمانہ میں ایک خاص قسم کا کپڑا خز بہت مشہور و مقبول تھا۔ جو بہت قیمتی تھا ابن سعد میں ایک جگہ خز کے مطرف (غالباً تھان) کی قیمت سات سو درہم بتلائی گئی ہے۔ صحابہ کرام اور تابعین عظام اسے بکثرت استعمال کرتے تھے۔ اکثر اسی کا سوٹ (جبہ۔ چادر۔ عمامہ اور عمامہ کے نیچے کی ٹوپی) پہنتے تھے۔

ایک مرتبہ ایک عورت بصرہ کے ممتاز بزاز یونس کے پاس خز کی چادر بغرض فروخت لائی۔ اور ساٹھ درہم قیمت طلب کی۔ اس نے یہ چادر اپنے ہمسایہ دکاندار کو دکھلا کر اس کی قیمت دریافت کی ہمسایہ نے اس چادر کی قیمت ایک سو بیس درہم بتلائی۔ مگر اس کی اپنی دانست

ہیں یہ چادر ایک سو پچیس درہم کی تھی۔ اسلئے اس نے اس عورت کو اس کی خواہش کے مطابق ساٹھ روپے دینے کی بجائے اسے کہا کہ اپنے گھر والوں سے پوچھ آؤ۔ کہ وہ ایک سو پچیس تک بیچنے کی اجازت دیتے ہیں۔ گھر والوں کی رضامندی حاصل کر کے اس نے ایک سو پچیس درہم میں یہ چادر خرید لی۔

اسی طرح ایک اور موقعہ پر ایک عورت ان کے پاس ایک ریشمیں جبہ فروخت کے لئے لائی۔ اور پانسو درہم طلب کئے۔ لیکن وہ ان کی نگاہ میں بہت زیادہ قیمت کا تھا۔ اس لئے اس نے مالک کو پانچ سو درہم منہ مانگی قیمت کی بجائے دو ہزار درہم ادا کر کے جبہ رکھ لیا۔ اُس وقت اکثر دکاندار اسی طریقہ سے خرید و فروخت کرتے تھے مالک کو پوری اور جائز قیمت ادا کر کے خود بھی نفع اٹھاتے تھے۔ آج کل کیطرح وہ ہزاروں کا مال کوڑیوں کے مول خریدنے کی کبھی کوشش ہی نہیں کرتے تھے۔ اب تو ایسی مثال کا ملنا ناممکنات سے ہے۔ عیاری و چالاکی کو اصولِ تجارت بنا لیا گیا ہے۔ اور قریباً ہر تاجر کی نظر آخرت کی بجائے دوسرے کی جیب پر رہتی ہے۔

سمندر کا بادشاہ

عبدالرحمٰن الناصر نے سرزمین اندلس پہ تقریباً پچاس سال حکومت کی۔ آسودگی۔ خوشحالی۔ ترقی اور عروج میں وہ اپنے پچھلے دور سے سبقت لے گیا تھا۔ امرا پہ بھروسہ کرنے کی بجائے وہ ہر بات کا خود فیصلہ کرتا تھا۔ اس نے اپنے تمام آبائی ٹیکس معاف کر کے ہر دلعزیزی حاصل کر لی تھی۔

اندلس میں پھٹے لباس یا برے حال میں کبھی کوئی نہ دیکھا گیا تھا اور نہ کبھی کوئی شخص بھیک مانگتا نظر آیا تھا۔ یہ دنیا جہاں کی منڈی تھی۔ دنیا کی ہر چیز اس کے بازاروں میں باآسانی مل جاتی تھی بین الاقوامی تجارت کا یہ بہت بڑا مرکز تھا۔ تجارتی ترقی کے لئے عبدالرحمٰن الناصر نے ایک ہزار تجارتی جہازوں کا ایک بہت بڑا بیڑا تیار کیا تھا۔

یہ جہاز ہر وقت دنیا کی مختلف منڈیوں میں مالِ تجارت سے لدے پھرتے رہتے تھے۔ دنیا کا کوئی ساحل ایسا نہ تھا۔ جہاں

اندلس کا تجارتی جہاز موجود نہ ہو۔ اتنے بڑے بیڑے کی وجہ سے
دنیا کے دوسرے تاجروں کو بھی بہت بڑا فائدہ پہنچ رہا تھا۔ وہ
ان جہازی سہولتوں کی وجہ سے اپنا مال دنیا کے دور دراز ملکوں
میں بھیجا کرتے تھے۔ اور مسلمانوں کے لئے دستِ بدعا رہتے تھے
جن کے فیض جہازرانی سے یہ زر و دولت کما رہے تھے۔

عبدالرحمٰن الناصر کے زمانہ میں اندلس سمندروں کا بادشاہ تسلیم
کیا گیا تھا۔ جیسے پچھلے دنوں برطانیہ تھا۔ عروج و ترقی میں اس وقت
کا اندلس آج کے امریکہ اور یورپ سے کسی درجہ کم نہ تھا۔ اسی طرح
عبدالمومن کے زمانہ میں بحر روم کے سمندر پر اندلس کی حکمرانی رہی
اس کے تجارتی اور جنگی جہاز جب بحر روم کی غیر ملکی بندرگاہوں پر سفید
پھریرے لہراتے پہنچتے تو سب ان جہازوں کو سلامی دیتے۔ اور
ان کے احترام میں سر جھکاتے۔

تجارت کے میدان میں مسلمانوں کی یہ فضیلت و برتری ان کی نیک
نیتی کی وجہ سے تھی۔ کیونکہ وہ خود بھی کماؤ اور دوسروں کو بھی کمانے
دو کے اصول پر چلتے تھے۔ اور آج کل کی طرح دوسروں پر روزی
کے دروازے بند کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے۔

احتیاط کی قید

محمد بن سیرین عراق کے باشندے تھے۔ عین التمر میں دکان کرتے تھے۔ وہ عین التمر کے معرکہ میں گرفتار ہو کر بحیثیت غلام کسی مجاہد کے حصہ میں آئے۔ اور آخیر میں حضرت انس بن مالکؓ کی غلامی میں رہ کر پیکر علم و عمل بن گئے۔ جنہوں نے بعد میں انہیں آزاد کر دیا۔ آپکا محبوب مشغلہ تجارت تھا۔ جس میں ہر ممکن احتیاط برتتے تھے۔ خواہ اس کی وجہ سے تکلیف یا نقصان ہی کیوں نہ اُٹھانا پڑے۔

ایک مرتبہ آپ نے چالیس ہزار کا غلہ خریدا۔ سودا طے ہو جانے کے بعد کچھ ایسی باتیں اس سلسلہ میں ان کے علم میں آئیں جو ان کے نزدیک مکروہ تھیں۔ اس لئے انہوں نے مکروہ حالات میں خریدا ہوا غلہ لوگوں کے پاس فروخت کرنا مناسب نہ سمجھا۔ بیع مکمل ہو چکی تھی۔ غلہ واپس نہ ہو سکا۔ اسلئے آپ نے یہ غلہ خیرات کر دیا۔

ابن سعد کی مذکورہ بالا روایت کے خلاف تہذیب الاسماء میں

یہ واقعہ یوں درج ہے کہ آپ نے چالیس ہزار کا روغنِ زیتون خریدا تھا۔ اس کے ہمہ پیپوں میں چوہا نکل آیا۔ تحقیق سے معلوم ہوا کہ یہ کولہو میں پڑ گیا تھا۔ اور وہاں سے پیپہ میں پہنچا۔ اس لئے آپ نے یہ سالم تیل پھینکوا دیا اور اسے بیچنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن اتنی کثیر رقم ادا نہ کر سکے۔ اس لئے اس کی عدمِ ادائیگی میں قید با مشقت اُٹھائی۔

بہرحال اپنے ذاتی مفاد کے لئے نہیں بلکہ لوگوں کے پاس کردہ سودا کی گندم یا چوہے سے خراب شدہ تیل بیچنا مناسب نہ سمجھا۔ اور اس خسارہ کے عوض خود قید بھگتی۔ مگر آج کتنے تاجر ایسے ہیں جو اس طرح ہزاروں کا نقصان برداشت کر کے لوگوں کو مکروہ یا حرام مال کھلانے سے رُکتے ہوں؟

اس کے برعکس موقعہ ملنے پر حرام مال کو حلال اور ناجائز کو جائز بنا کر بیچنے سے بھی بعض دریغ نہیں کرتے۔

نرخ اور وزن

میمون بن مہران ایک مرتبہ کچھ کپڑا خریدنے کے لئے کوفہ گیا
محمد ابن سیرین کی دکان کی خاص شہرت سنی اور اس کی دکان پر پہنچا۔
جس طرح وہاں لین دین ہوا۔ اس کی تفصیل میمون نے یوں بیان
کی ہے کہ:۔

"جب میں نرخ طے کر کے ابن سیرین سے کوئی کپڑا خرید کرتا
تھا۔ تو وہ مجھ سے تین مرتبہ پوچھتے تھے۔ کہ

"تم اس کی خریداری پر راضی ہو؟"

میرے یہ کہنے کے باوجود کہ

"مجھے یہ قیمت منظور ہے"۔

ان کی تشفی نہ ہوتی تھی۔ اور دو آدمیوں کو بلا کر گواہ بناتے تھے اس
کے بعد وہ کہتے کہ اچھا اب لے جائیے۔ میں نے ان کی یہ احتیاط دیکھ
کر اپنی ضرورت کا کل سامان ان سے خرید کیا۔"

اسی طرح وزن کے معاملہ میں بھی ان کی احتیاط عجیب تھی اُس زمانہ میں وزن کے باٹوں کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ اس لئے آپ جب کسی سے کوئی مال قرض لیتے۔ تو اسے رائج الوقت باٹوں کے علاوہ کسی دوسری وزنی چیز سے تول لیتے اور اس چیز کو سربمہر کرکے رکھ دیتے تھے جس وقت مال واپس کرنا ہوتا۔ تو اسی سربمہر چیز سے مال وزن کرکے واپس دیتے تھے تاکہ اس کا کوئی حق ان کے ذمہ نہ رہ جائے۔ اس وقت اکثر ایسا ہی ہوتا تھا۔

اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ تجارت وہ حلال تھی۔ یا یہ کہ جس کے ذریعہ خریدار کو ناجائز منافع پر کم وزن مال دینے کی کوشش کی جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ تجارت میں اب ویسی برکت نہیں رہی

حرام کا شائبہ

ابن سیرین لاکھوں کی تجارت کیا کرتے تھے۔ اس میں اکثر ایسے مواقع پیدا ہوتے کہ اگر ذاتی مفاد محبوب رکھتے تو وارے نیارے ہو جاتے۔ مگر انہوں نے ہمیشہ خریداروں کے مفاد کو پیش نظر رکھا۔ اور بارہا خسارہ برداشت کیا۔

ابن سیرین عالم بھی تھے اسلئے ان کا عمل بھی اسکے عین مطابق ہوتا تھا۔ ایک فصل کے موقعہ پر آپ نے غلہ خرید کیا۔ جس میں اسّی ہزار کا نفع ہوا۔ لیکن بعض حالات نے ان کے دل میں یہ شک پیدا کر دیا کہ اسے جس طریق پر فروخت کیا گیا ہے۔ اس سے سود کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس پاکباز تاجر نے محض شک کی بنا پر ساری رقم چھوڑ دی۔ حالانکہ اس میں مطلق ربٰوا نہ تھا۔

ایک مرتبہ انہیں جرجرایا کی اراضی سے مالگذاری میں انگوروں کی کافی مقدار آئی۔ کچھ لوگوں نے انکا افشردہ نکالنا چاہا۔ تاکہ ان کی جلد

نکاسی ہو جائے ابن سیرین نے منع کیا کہ ایسا کرنے کی بجائے انہیں منقے بنا کر بیچو۔ لوگوں نے کہا کہ اس طرح بھی نکاسی ممکن نہیں۔ آپ نے افشردہ نکالنے کی بجائے ان سب انگوروں کو پانی میں پھنکوا کر ضائع کرا دیا۔ تاکہ لوگوں تک ایسی چیز نہ پہنچے جو حرام شکل اختیار کر چکی ہو۔

لین دین کے دوران میں اکثر کھوٹے سکے لوگ دے جاتے تھے آپ کو جو بھی ان کا علم ہوتا۔ انہیں علیحدہ کر کے رکھ دیتے کسی خریدار کے گلے مڑھنے کی کوشش نہ کرتے۔ اور نہ ہی ان سے کوئی سودا خرید کرنے کی کوشش کرتے۔ چنانچہ آپ کی وفات پر ایسے پانسو کھوٹے سکے ایک جگہ جمع شدہ ملے۔

صاف دل اس قدر تھے کہ کسی دوسرے کی تجارت پر رشک یا حسد نہ کرتے تھے۔ بلکہ خود فرمایا کرتے تھے۔

"میں نے بھلے برے کسی پر حسد نہیں کیا۔"

کیا آج کل تجارت اسی ڈھنگ سے چل رہی ہے؟ ہرگز نہیں آج کل تو ذاتی مفاد پر جماعتی وقار قربان کر دیا جاتا ہے۔ جائز یا ناجائز کی احتیاط کی بجائے جھوٹی قسمیں کھا کر خراب مال کو عمدہ ظاہر کر کے بیچا جاتا ہے۔

امام اعظمؒ کی تجارت

امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ بھی ایک بہت بڑے تاجر تھے۔ اکثر شہروں میں ان کی ایجنسیاں موجود تھیں۔ بڑے بڑے سوداگروں سے معاملہ رہتا تھا اور لاکھوں کا لین دین ہوتا تھا۔

اس قدر وسیع کاروبار کے باوجود اتنی احتیاط برتتے تھے کہ ان کے خزانہ میں ایک پائی ناجائز طور پر داخل نہ ہو سکتی تھی۔ اس احتیاط کے باعث اگر کبھی نقصان پہنچ جاتا تو ملول نہیں ہوتے تھے۔

ایک دفعہ حفص بن عبد الرحمٰن کے پاس خز کے تھان برائے فروخت بھیجے اور انہیں کہلا بھیجا کہ

"فلاں فلاں تھان میں عیب ہے بیچتے وقت خریدار کو دکھلا دو اور جتلا کر دینا۔"

حفص کو فروخت کرتے وقت یہ ہدایت یاد نہ رہی اور عیب بتائے بغیر مال فروخت کر دیا۔

امام صاحب کو جب اس کی اطلاع ہوئی۔ تو انہیں بہت افسوس
ہوا۔ کفارہ کی اور تو کوئی صورت نظر نہ آئی کیونکہ تھان ایسا شخص لے
گیا تھا۔ جس کا اتہ پتہ معلوم نہ تھا۔ اس لئے آپ نے ان تھانوں
کی قیمت جو تیس ہزار درہم تھی سب خیرات کر دی۔

ایک اور موقعہ پر امام صاحب کے پاس ایک عورت خز کا
تھان برائے فروخت لائی۔ امام صاحب نے دام پوچھے۔ تو
اس نے سو درہم بتلائے۔ فرمایا "کم ہیں"۔ اس نے کہا تو "دو سو روپے
دے دیجئے"۔ آپ نے فرمایا۔

"تھان پانسو سے کم قیمت کا نہیں"

اس عورت نے حیران ہو کر پوچھا۔

"آپ ہنسی تو نہیں کرتے"

امام صاحب نے کہا نہیں اور پانسو روپے اپنے پاس سے دے کر تھان رکھ لیا

اسی دیانت و امانت نے انہیں آسمان شہرت پر پہنچا دیا تھا مگر آج
کل تو امام اعظم کے "مقلد" اکثر کرم خوردہ یا ناقص تھان دوسرے تھانوں
میں اس طرح ملا کر لوگوں کو دیتے ہیں کہ انہیں پتہ نہ چلے چنانچہ غیر ملکی
تجارت کے سلسلہ میں پاکستان کی اس بارہ میں بہت رسوائی ہوئی ہے
جس کی وجہ سے گورنمنٹ کو خاص احتیاطی تدابیر اختیار کرنی پڑی ہیں

سودی کاروبار

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک پیشگوئی کے مطابق یہ وہ زمانہ ہے کہ سود کے اثرات سے کوئی بھی نہیں بچا ہوا۔ تمام تر تجارت بینکوں کے ذریعہ ہوتی ہے۔ جہاں سودی لین دین ہوتا ہے اکثر مسلمان سرمایہ دار بھی بغیر سود کسی کو قرض نہیں دیتے اور بعض تو ہندوؤں سے بھی زیادہ سود لیتے ہیں۔

اس وقت سوائے روس کے باقی تمام دنیا میں سودی کاروبار جاری ہے۔ سود کے بغیر کاروبار چلانا ناممکن بنایا جاتا ہے مگر زمانہ سابقہ میں کروڑوں روپوں کا لین دین۔ تجارت اور قرض بغیر سود کے چلتا تھا۔

چوتھی صدی کا سیاح ابن حوقل جہاں گردی کرتے ہوئے جب مغربی افریقہ کی آخری حد باد غشت میں پہنچا تو اس نے وہاں اربوں روپے کی تجارت یا سودا اور قرض کے لین دین کا رواج دیکھا اور

ان کی دستاویز تک پڑھیں چنانچہ وہ ایک بلا سود قرض کی نسبت لکھتا ہے
میں نے ایک رسید قرضہ بادغشت میں دیکھی۔ جو محمد بن ابی
سعد ان کے قرض کے متعلق تھی۔ اس پر عادل گواہوں
کی گواہیاں ثبت تھیں اس رسید کی رقم ۲۴ ہزار اشرفیاں تھیں
ایک روایت کے مطابق غوری نے آخری دفعہ امام رازیؒ سے
قرض لے کر ہندوستان پر چڑھائی کی تھی عالمگیر کے لڑکے مراد بخش
گورنر گجرات نے ایک مرتبہ حاجی پیر محمد زاہد علی سے چھ لاکھ کا قرض
اسی طرح لیا۔ یہ سب قرضے بلا سود تھے۔

اتنی کثیر رقم کا قرض حسنہ بغیر کسی ضمانت اور رجسٹری وغیرہ کے
آج کون دیتا ہے؟ اس زمانہ میں یہ لین دین سود کے منافع کی لالچ
کی بجائے آخرت کے فائدہ کے پیش نظر ہوتا تھا۔ نیت نیک ہوتی
تھی۔ صاحب مندوں کی دعائیں شامل رہتی تھیں جس سے کاروبار
بھی چمکتا تھا۔ اور روپیہ بھی محفوظ رہتا تھا۔

اس زمانہ میں بھی بعض نیک دل صاحب ثروت لوگوں نے
ہمت کر کے بلا منافع بعض مسلمانوں کو قرض دیا ہے۔ مگر ان کو اسکی
وصولی میں ایسی دقتیں پیش آئیں کہ آئندہ کے لئے انہوں نے
بھی ہاتھ کھینچ لیا۔

تجارتی میلہ

گزشتہ صدیوں میں دنیا کی تجارت پر مسلمان اس طرح حاوی تھے جیسے آج امریکہ اور برطانیہ۔ دنیا کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا۔ جہاں یہ نہ پہنچے ہوں۔ اس وقت کے کاروبار کی وسعت کا آج کی منڈیاں مقابلہ نہیں کر سکتیں۔

اربیل سے مراغہ جاتے ہوئے راستے میں ایک منزل کرمنشاہی پڑتی تھی۔ یہاں سالانہ چاند کی ابتدائی تاریخوں میں تجارتی میلے لگا کرتے تھے۔ ان میلوں میں مختلف قوموں کے تجارتی لوگ شرکت کرتے اور کپڑے۔ عطر۔ شکر۔ روشنی کے سامان۔ ٹھٹھیرے۔ سونا۔ چاندی۔ گھوڑے۔ خچر۔ گدھے۔ گائے۔ بیل۔ بھیڑ۔ بکریوں کی تجارت کرتے۔

میلے کا یہ میدان ۹ مربع میل سے زائد رقبہ میں پھیلا ہوا تھا اور بقول ابن حوقل "حج کے موقعہ پر جس قدر ہجوم اور ساز و سامان میدانِ عرفات میں جمع ہوتا تھا۔ یہاں اس سے زیادہ ہوتا تھا اور حج کے

نسل کی بازیابی ہوجاتی تھی۔

کاروبار کی کثرت کا اندازہ کرنے کے لئے صرف یہی مثال کافی ہوگی کہ ابواسحٰق ماجدوانی نے صرف اس میلہ میں ایک سال دو لاکھ بار بیچے اور ابومحمد عبدالرحمٰن ابن المسری نے اس واقعہ کی توثیق کرتے ہوئے کہا۔

"آپ دو لاکھ پر حیران ہوتے ہیں۔ اسی میلہ میں میں نے
دس لاکھ بکریاں فروخت کی ہیں۔ بلکہ عجیب
یہاں ایک دوسرا تاجر تھا اس قدر جانور فروخت کیے تھے"

بیشتر ممالک کی تجارت کا حال ہے۔ اسی زمانہ میں یہی کیفیت مغرب میں تھی۔ مصر سے نکل کر صحرائے لیبیا کے مشہور شہر قیروان کو جانے والے راستہ میں برقہ کے شہر سے گزرنا پڑتا تھا۔ یہ ایک تجارتی مرکز تھا اس شہر میں اون، سیاہ مرچ، شہد، موم، روغن زیتون وغیرہ کی تجارت ہوتی تھی۔ اور یہاں بکثرت تاجر اور دوسرے ممالک کے لوگ ہر وقت اور ہر زمانہ میں آتے رہتے تھے۔ ان لوگوں کی آمد ورفت کا سلسلہ کبھی منقطع نہ ہوتا۔ اور اس شہر کے راستوں میں قافلوں پر قافلے چلتے تھے

یہ تجارتیں کیا تھیں مسلمانوں کی قوت عمل کے کرشمے اور حسن نیت کی کرامتیں تھیں۔

ایک ذاتی مشاہدہ

غالباً ۱۹۴۴ء کا زمانہ تھا۔ ایک صاحب فرسٹ بزرگ جو درجہ میں ابدال اور پیشہ میں تاجر تھے۔ راقم کے پاس آکر ٹھہرے شہر اور شہر والوں سے ناواقف تھے۔ اسلئے مجھے ہمراہ چلنے کو کہا سب سے پہلے ہم ایک لاکھ پتی تاجر کی نو تعمیر بلڈنگ میں پہنچے۔ وہ اور ان کے صاحبزادے موجود تھے تاج کمپنی کے قطعات انہوں نے پسند کئے۔ جو مجموعاً تیئس ۲۳ روپے کے تھے۔

اس تاجر نے اپنی دیانت کے مطابق ایک آنہ فی روپیہ اپنا کمشن لگا کر اس ملک التجار کو صحیح صحیح دام بتلا دیئے۔ مگر اس نے دولت کے عارضی نشہ میں نہایت نازیبا انداز میں ان سے زیادہ کمشن کا مطالبہ کیا کہ

"آپ لوگ یونہی زائد قیمت بتلاتے ہیں۔ دوسرے تاجر ۳۲۔۴۰ فیصدی کمشن دیتے ہیں۔ اگر اسی قدر منظور ہو تو

بہتر۔ ورنہ اپنا سامان اٹھائیے۔"

راقم اس منڈی کے مقامی تاجروں کی ذہنیت سے بخوبی واقف تھا۔ اسلئے راقم نے اس نووارد تاجر کو کہا کہ

"چونکہ یہ لوگ خود ایسا کرتے ہیں۔ اس لئے وہ آپ کو بھی ویسا ہی کہہ اور سمجھ رہے ہیں"

تاجر نے یہ کہتے ہوئے کہ

"آپ میرے رزاق نہیں۔ اگر آپ کمشن چھڑانے پر ہی تلے ہوئے ہیں تو میں اپنا ذاتی کمشن ایک روپیہ سات آنہ اس ثواب کے عوض چھوڑتا ہوں۔ کہ اس دفتر میں لوگ ان قرآنی قطعوں کو پڑھتے رہیں گے۔ تو مجھے انکا ثواب پہنچتا رہے گا۔"

اس لاکھ پتی۔ پابندِ صوم صلوٰۃ۔ ثقہ صورت نے ایک روپیہ سات آنہ کمشن کاٹ کر باقی رقم ان کے حوالے کی۔ جو انہوں نے شکریہ کے ساتھ قبول کر کے جیب میں ڈال لی۔

مگر اس مومن صورت تاجر کے اس خسارہ کے سودے نے میرے سینہ میں آگ سی لگا دی کہ اس سمجھدار حریصِ دولت نے ایک روپیہ سات آنہ کی رقم کے عوض ان درجنوں قطعات کا ثواب بیچ دیا۔ جو

اب تک راقم وہاں لگے ہوئے دیکھتا ہے جنہیں اس دفتر میں آنے جانے والے بغیر پڑھے ہوئے ہوتے ہیں۔

جب ہم اس کے پھاٹک سے باہر نکلے تو اس تاجر نے میرے سینہ میں جو آگ سی لگ رہی تھی اپنی فراست سے دیکھ لی اسکو ٹھنڈا کرنے کے لئے میری پشت پر ہاتھ رکھا اور راقم کے کچھ کہے بغیر فرمایا

"آپ پریشان کیوں ہوتے ہیں۔ اس کی تجوری میں ایک روپیہ سات آنہ کی رقم وہ اضافہ نہیں کر سکتی۔ جو اضافہ یہ قطعات میرے نامۂ اعمال میں اس وقت تک کرتے رہیں گے جب تک کہ وہ پڑھے جاتے رہیں گے"۔

اس سے راقم کو تسکین ہوئی۔ وہاں سے ایمرسن کالج (ملتان) پہنچے۔ یہاں کتابیں دیکھتے دیکھتے ایک لڑکے نے کتاب چرا لی۔ راقم نے اس کتاب کی ناموجودگی کا ان سے ذکر کیا تو فرمایا۔

"جو لڑکا یہ کتاب چرا کر لے گیا ہے۔ وہ میرے علم میں ہے مگر میں نے اسے اپنے ہم مکتبوں میں رسوا کرنا مناسب نہ سمجھا۔ اس نے کچھ اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ مجھے تو اس کی قیمت سے زائد ہی نفع ہوا ہے"۔

راقم نے ان کی تجارت میں جو برکت دیکھی وہ بیان سے باہر ہے آپ

نے دیکھا کہ اس لاکھ پتی تاجر اور اس طالب علم کی نظر چند پیسوں پر
ہی اٹک کر رہ گئی۔ اور انہوں نے اس سے اپنی آخرت کا سرمایہ
نہیں بڑھایا بلکہ خسارہ میں ہی رہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک تاجر اس وقت تک صحیح تجارت کر ہی نہیں
سکتا جب تک اس کے دل میں دوسروں کے حقوق کا احترام، خدا کا
خوف، روزِ حساب کی فکر نہ ہو۔ صرف انکم ٹیکس، پراپرٹی ٹیکس، سیلز ٹیکس،
پرنسپل ٹیکس سے بچنے کے لئے وہ کس قدر مکر و فریب، خوشامد
و رشوت سے کام لیتے ہیں۔ مگر اتنا نہیں سوچتے کہ

اس شہنشاہ الحاکمین کے سامنے نہ کوئی فریب کام آئیگا
نہ کوئی مکر چل سکے گا۔ نہ رشوت سے کام نکلے گا۔ اور نہ
ہی کسی کو سفارش کی جرأت ہو گی۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ

آخرت کے نفع کے مقابلہ میں دنیا کا خسارہ کوئی حیثیت نہیں
رکھتا۔

تجارت کی برکت

مسلمانوں کی تجارت کی وسعت کے بعد ان کی دولت و ثروت کا تذکرہ بھی یقیناً قابل رشک ہو گا۔ اگلے وقتوں میں دولت کی کثرت و فراوانی زیادہ تر تجارت کی وجہ سے تھی۔ حضرت طلحہؓ فرماتے ہیں۔

"میرے پاس جو کچھ بھی ہے سب تجارت و بیوپار سے حاصل ہوا ہے۔"

آپ خیر و خیرات کی وجہ سے صحابہ کرام میں "الفیاض" مشہور تھے۔ اپنی وفات پر بارہ لاکھ درہم نقد اور تین کروڑ کی جائداد چھوڑی۔ ابن سعد کی ایک روایت کے مطابق آپ کے گھر سے تین بھار (بھار گائے کے چمڑے کو کہتے تھے) سونا نکلا۔

مشہور تاجر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی وفات پر ان کی چاروں بیویوں میں تقسیم کے لئے جب سونا کاٹا گیا۔ کاٹنے والوں کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ ہر بیوی کو اسّی اسّی (۸۰-۸۰،

ہزار اشرفیاں ملیں۔ باقی حصہ داران کے حصص کا تو شمار ہی کیا۔

حضرت زبیر بن العوامؓ کی دولت موجودہ حساب سے ۳۰ ہزار ملین تھی۔

یہ تو صحابہ کرام کی دولت کا حال ہے۔ ان سے بعد کے زمانہ کی یہ کیفیت تھی کہ

خلیفہ مقتدر باللہ کے زمانہ میں الجصاص جوہری کی خانہ تلاشی سے ایک کروڑ آٹھ لاکھ کی اشرفیاں برآمد ہوئیں۔ دکان کے مال اور دوسرے مال کا تو شمار ہی نہیں۔

الطبری کے ایک بیان کے مطابق خلیفہ معتصم باللہ کے زمانہ کے ایک چکی پیسنے والے نے بصرہ سے نقل مکانی کرکے بغداد میں کاروبار شروع کیا جس سے اسے اس قدر آمدنی ہوئی کہ ایک سو اشرفی روزانہ زکوٰۃ کی مد میں خیرات کرتا تھا۔

ابن اثیر کی ایک روایت کے مطابق بصرہ کے تاجر شریف عمر کی صرف تجارت کی سالانہ آمدنی اڑھائی کروڑ تھی۔

ایران کی قدیم تجارتی بندرگاہ سیراف کے ایک تاجر نے اپنے اس مال کے ثلث کی نسبت وصیت کی جو اس وقت اس کے پاس موجود تھا۔ یہ ثلث دس لاکھ اشرفیوں کا تھا جس کی دولت کی ایک تہائی ایک ملین پونڈ ہے۔ اس کا کل اندازہ خود لگا لیجئے۔ مزید برآں جو دو تیہ

اس نے بے سرمایہ لوگوں کو تجارت میں لگانے کے لئے دے رکھا
تھا۔ وہ اس کے علاوہ تھا۔

عدن کے سوداگر ہاشنت کے سب سے چھوٹے لڑکے ٹیپلے کے
زیر استعمال چاندی کے آلات کا وزن کیا گیا تو وہ ایک ہزار دو سو من
نکلے۔ اسکے باقی لڑکوں اور اسکے گھر کی دولت کا قیاس ہی ہو سکتا ہے
کہ کس قدر ہوگی۔

اسی ہاشنت کے متعلق یہ بیان ہے کہ ایک دفعہ جب وہ
چین میں مال بیچ کر آئے تو صرف اس کشتی کو پانچ لاکھ دینار سے
اصل مالک نے کیا کمایا ہوگا۔ یہ آپ خود ہی سوچ سکتے ہیں۔

اس وقت صرف مکان کی تعمیر پر عام طور پر ۳۰-۴۰ ہزار اشرفیاں
یعنی پونڈ خرچ کرتے تھے۔

ٹیورانیئر کے ایک بیان کے مطابق عالمگیر کے زمانہ میں سورت
کے ایک ملا عبدالغفور کا سرمایہ تجارت کروڑ روپوں سے زائد تھا۔

یہ وہ اعداد و شمار ہیں جن پر زکوٰۃ ادا ہوتی تھی۔ اور یہ اسی
ثروت کا نتیجہ تھا کہ ایک زمانہ میں مدینہ میں لوگوں کو زکوٰۃ لینے والے
تلاش کے باوجود نہیں ملتے تھے۔

(۱۴)

سادگی و پاکیزگی

تمدن۔ تصوف۔ شریعت۔ کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام

مساواتِ عملی

سرکارِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رفقاء کے ہمراہ سفر پر جا رہے تھے۔ بھوک لگنے پر تمام شرکارِ سفر نے مل کر کھانا پکانے کا انتظام شروع کیا ہر ایک نے اپنے حصہ کا کام بانٹ لیا۔ سرورِ کائنات نے جنگل سے لکڑیاں لانے کا کام اپنے ذمہ لیا۔ صحابہ نے یہ کام بھی خود کرنا چاہا۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں یہ سچ ہے لیکن مجھے یہ پسند نہیں کہ میں تم سے اپنے آپ کو ممتاز کروں۔ کیونکہ خدا اس بندے کو پسند نہیں کرتا۔ جو اپنے ہمراہیوں میں ممتاز بنتا ہے

اسی طرح غزوۂ احزاب کے موقعہ پر حضورؐ صحابہ کرام کے ساتھ مل کر خندق کھودتے رہے۔ یہاں تک کہ شکم مبارک پر مٹی کی تہ جم گئی۔

مساواتِ اسلامی کا دنیا کی کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ مگر اب مسلمانوں نے خود بینی۔ خودرائی و خودنمائی کے مظاہروں سے دنیا کو انگشت نمائی کا موقعہ دے دیا ہے۔

حقیقی جمہوریت

شہنشاہ انگلستان کی ماہانہ تنخواہ منزلہ کہ پچاس ہزار روپیہ تھی۔ اس میں شہزادوں و دیگر افراد خاندان شاہی کے اخراجات کی رقم شامل نہیں تھیں۔

اسکے مقابلہ میں اسلام کے سب سے بڑے بادشاہ کی تنخواہ کیا تھی؟ اس کے اندازہ کے لئے ان کا اپنا بیان ہی کافی ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے ایک موقعہ پر خود ہی اپنے مصارف یوں فرمائے۔

میں خود بتاتا ہوں کہ بیت المال سے مجھے کتنا لینا جائز ہے۔ دو جوڑے کپڑے۔ ایک جاڑے کے لئے اور ایک گرمی کیلئے۔ ایک سواری جس پر حج اور عمرہ ادا کروں اور قریش کے ایک متوسط الحال آدمی کے اخراجات طعام کے برابر اپنے اور اہل و عیال کیلئے اخراجات طعام۔ اسکے بعد میں ایک ادنیٰ مسلمان ہوں۔ جو ان کا حال ہے

وہی میرا حال ہے۔"

حضرت معاذ بن جبل قیصر روم کے دربار میں سفیر بن کر گئے تھے۔ رومی امیروں نے قیصر کے جاہ و جلال اور اعزازات و اختیارات کی تفصیل بتا کر انہیں مرعوب کرنا چاہا تو حضرت معاذ نے امیر عرب و عجم کے اختیارات و تحفظات کی تفصیل بتا کر اسے ششدر کر دیا۔ فرمایا:

"ہمارا خلیفہ ہم جیسا ایک فرد ہے اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا خلیفہ باقی رکھیں ورنہ اسے معزول کر دیں۔ اگر وہ چوری کرے تو اس کے ہاتھ کاٹ ڈالیں۔ اگر زنا کرے تو اس کو سنگسار کر دیں۔ اگر وہ ہم میں سے کسی کو گالی دے تو وہ بھی برابر کی گالی دے۔ اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کا بدلہ دینا پڑے۔ وہ ہم سے چھپ کر قصر و ایوان میں نہیں بیٹھتا۔ وہ ہم سے غرور و تکبر نہیں کرتا۔ وہ مال غنیمت میں اپنے کو ہم پر ترجیح نہیں دیتا۔ وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے اور بس۔"

ان الفاظ کو دوبارہ سہ بارہ غور سے پڑھیے۔ موجودہ زمانہ کے جمہوری حاکموں اور ان کے حقوق و تحفظات کو سامنے لائیے اور پھر بتائیے کہ صحیح ترین جمہوریت وہ تھی۔ یا دور حاضرہ کی ہے۔ جس میں سادگی و پاکیزگی نام کو بھی نہیں۔

احتیاطِ غذا

گذشتہ زمانہ میں بھی کھیتوں اور باغوں میں کھاد دینے کا رواج عام تھا۔ اکثر لوگ آج کل کی طرح اُس وقت بھی گندگی یعنی غلاظت پیشاب وغیرہ کی کھاد دیا کرتے تھے جس سے ترکاریوں کی نفاست لطافت اور پاکیزگی میں فرق آجاتا تھا۔ اسلئے عام طور پر لوگ ترکاریوں کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ کیونکہ گندی کھاد کی وجہ سے یہ خوراک "طیب" یعنی پاک نہیں رہتی تھی۔

خادمِ رسولؐ حضرت انسؓ کا بصرہ میں ایک مشہور باغ تھا جس میں آپ کا مکان بھی تھا۔ طبقات ابن سعد میں لکھا ہے کہ حضرت انسؓ کے اس باغ میں ایک ایسا پھول ہوتا تھا۔ جس کی خوشبو مشک کی خوشبو جیسی تھی۔ اس میں طرح طرح کی سبزیاں اور ترکاریاں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ مگر پاکیزگی اور لطافت کے خیال سے انہیں غلاظت کی کھاد نہ دی جاتی تھی۔

اس باغ میں سال میں دو دفعہ فصل ہوتی تھی۔ کیونکہ اسے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا دی تھی۔ اس باغ کی ترکاریاں وغیرہ آپ اپنے دوست و احباب میں تقسیم فرمایا کرتے تھے۔

رفیع بن مہران ابوالعالیہ کبار تابعین سے تھے۔ اور تُستر کے رہنے والے تھے جو مشتبہ چیزوں سے اتنی احتیاط کرتے تھے کہ ان پیشہ وروں اور عہدہ داروں کے یہاں جن کی کمائی میں کچھ بھی مشتبہ مال کا احتمال ہوتا تھا پانی نہ پیتے تھے۔ مزاج میں بڑی لطافت تھی۔ اس لئے کھاد کی ترکاریاں نہیں کھایا کرتے تھے۔ البتہ حضرت انسؓ نے انہیں جو ترکاریاں بھیجی تھیں۔ وہ آپ نے شوق سے کھائیں کیونکہ وہ بغیر کھاد کے اگی ہوئی تھیں۔

مسلمان اپنے ظاہر و باطن کو آلائشوں اور آلودگیوں سے محفوظ رکھنے کے لئے کس قدر احتیاط برتتے تھے۔ مگر آج کل ناجائز اور حرام چیزوں سے بھی پرہیز نہیں کی جاتی۔ صرف پرہیز ہی نہیں کی جاتی۔ بلکہ اعلانیہ، ویدہ دلیری سے انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔

سادہ زندگی

حضرت عمر بن عبد العزیز شروع میں بہت ہی مغرور طبیعت اور جاہ پسند تھے۔ نہایت ہی عمدہ لباس پہنتے تھے اور جس پر ایک دفعہ لوگوں کی نظر پڑ جاتی اسے پرانا سمجھتے تھے۔ بہترین قسم کی خوشبوئیں لگاتے اور خوب اکڑ کر چلتے تھے۔ کہ ان پر انگلیاں اٹھتی تھیں۔

خلافت کی ذمہ داریوں کے بوجھ نے یہ سب کس بل نکال دیئے ان کا عجب و غرور۔ تواضع و انکساری میں بدل گیا۔ منصب خلافت سنبھالتے ہی مسجد میں پہنچ کر لوگوں کے سامنے اپنی حکومت کی پالیسی بیان کر کے باہر نکلے تو غلام سواری کے لئے شاہی گھوڑے لئے کھڑے تھے۔ وہ آگے بڑھے مگر خلیفہ نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔

"یہ گھوڑے ہمارے لئے نہیں بلکہ بیت المال کے ہیں
میرے لئے میرا خچر کافی ہے"

آپ اس پر سوار ہو گئے۔ شاہی خدام نے آپ سے شاہی محل کی

طرف تشریف لے جانے کی درخواست کی۔ مگر اس منکسر المزاج نے کہا
"میرے لئے میرا خیمہ ہی کافی ہے"

قصرِ خلافت میں داخل ہوئے تو پردوں کو چاک کرادیا جو غلغاریکے
جو فرش بچھایا جاتا تھا۔ اسے بازار فروخت کرکے اس کی قیمت
بیت المال میں داخل کرادی۔

اتنی سادہ زندگی بسر کرنے لگے کہ ایک بادشاہ اور ایک عام آدمی
کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا تھا اور جب تک اجنبی کو ہاتھ
لگا کر خلیفہ کی نشاندہی نہ کرائی جاتی۔ وہ بادشاہ وقت کو پہچان نہ سکتا تھا۔

ایک شخص نے آپ کی قمیص کو گریبان کے قریب آگے اور پیچھے
دو پیوند لگے ہوئے دیکھے تو از راہِ ہمدردی کہنے لگا "امیر المومنین آپکو
خدا نے سب کچھ دے رکھا ہے۔ کاش کہ آپ عمدہ کپڑے پہنتے"
آپ نے سر جھکا لیا اور فرمایا۔

"میانہ روی عقل کی حالت میں اور عفو و کرم قدرت کی حالت
میں سب سے بہتر ہے"

ان حالات کے باوجود نظامِ حکومت اس شان سے چلایا کہ انکے
عہدِ حکومت کو خلافتِ راشدہ کا تتمہ سمجھا جاتا ہے۔ ایسے حالات آج بھی
پیدا کیئے جا سکتے ہیں صرف خواہشاتِ نفس کی قربانی اور خوفِ خدا کی
ضرورت ہے۔

خلیفۂ وقت کا کھانا

رمضان شریف میں ایک روز ہاشم بن قاسم خلیفہ المہتدی باللہ کو ملنے گئے۔ جب وہ واپس چلنے لگے۔ تو خلیفہ نے کچھ دیر اور بیٹھنے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بیٹھ گئے۔ روزہ افطار کر کے خلیفہ نے نماز پڑھائی

نماز سے فارغ ہو کر خلیفہ نے کھانا منگوایا۔ خادم بید کی ایک ٹرے میں کھانا لایا۔ جس میں میدہ کی روٹیاں۔ کچھ نمک۔ سرکہ اور زیتون کا تیل تھا۔

خلیفہ نے ہاشم بن قاسم کو بھی کھانے میں شریک کر لیا۔ ہاشم نے مختصر سا کھانا دیکھ کر یہ خیال کیا کہ مزید کھانا ابھی آئیگا۔ اس لئے آہستہ آہستہ کھانے لگے۔ خلیفہ تاڑ گیا اور پوچھا۔

"تم روزہ سے نہیں تھے"؟

ہاشم نے جواب دیا

"میں روزہ سے تھا"
خلیفہ نے کہا
"کل روزہ نہیں رکھو گے"۔
ہاشم بولے
"رمضان شریف کا مہینہ ہے۔ کیوں نہ رکھوں گا"
خلیفہ نے کہا۔
"تو اچھی طرح سے کھاؤ۔ اور یہ نہ سمجھو کہ اور کھانا آئیگا۔ ہمارے یہاں اس کھانے کے سوا اور کھانا اس وقت گھر پر موجود نہیں"۔

یہ سن کر ہاشم بن قاسم بہت حیران ہوئے اور پوچھا
"یا امیر المومنین۔ یہ کیا؟ بفضل تعالیٰ آپ کو سب نعمتیں میسر ہیں"۔
خلیفہ نے بتلایا "اسمیں کوئی شک نہیں۔ مگر جب میں نے بنو امیہ کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے حالات کا بغور مطالعہ کیا۔ تو دیکھا کہ آپ کم کھاتے تھے اور رعایا کی زیادہ فکر کرتے تھے اس وجہ سے لاغر بھی ہو گئے تھے۔ اور جب میں نے اپنے خاندان پر نظر دوڑائی۔ تو مجھے بہت غیرت آئی۔ کہ ہم لوگ بنی ہاشم ہو کر ان جیسے بھی نہ ہوں"۔
اسی تفکر کا نتیجہ تھا کہ آپ زاہد و عابد ہونے کے علاوہ احکام الٰہی کے اجرا میں بہت سخت تھے۔ مگر اب مسلمانوں میں ایسی غیرت کہاں؟

بے مثال سادگی

دوسری جنگِ عظیم کے دوران میں ترکیہ کے وزیرِ جنگ غازی انور پاشا نے بعض الجھنوں کو سلجھانے کے لئے دربارِ رسولؐ کی حاضری ضروری سمجھی گئی پہلی پوری۔ قفقاز اور شام کی فوجی چھاؤنیوں کے ملاحظہ کے بعد غازی موصوف مارشل احمد عزت پاشا اور غازی جمال پاشا کے ہمراہ مدینۃ الرسول کی طرف روانہ ہوئے۔

اس وقت نجد و حجاز کا علاقہ ترکی حکومت کے زیرِ اثر تھا جس کی طرف سے مدینہ منورہ میں فخری بے گورنر تھے۔ اس جلیل القدر اور ہر دلعزیز مجاہد کی آمد کی خبر مدینہ پہنچ چکی تھی۔ والیِ نجد و حجاز شریف حسین۔ گورنر مدینہ فخری بے دیگر اعیانِ سلطنت علماء اور مشائخ آپ کے استقبال کے لئے اسٹیشن پر موجود تھے۔

بروز جمعہ دس بجے دن کے قریب گاڑی مدینہ کے اسٹیشن پر آکر رکی۔ اسلام کا یہ نپولین گاڑی سے اترا۔ گارڈ آف آنر نے

سلامی دی۔ امرائے سلطنت مصافحہ کے لئے آگے بڑھے۔ انہوں نے نہ تو کسی سے مصافحہ کیا۔ نہ کسی کی طرف نگاہ کو جنبش دی۔ حرم کی طرف رخ کر کے گردن جھکا دی۔ ہاتھ باندھے سب بے خود ہو کر بصد عجز و ادب کھڑے ہو گئے۔

اس وقت انہوں نے کوئی فاخرہ لباس نہیں پہنا ہوا تھا۔ نہ ہی پوری وردی میں ملبوس تھے۔ صرف پاجامہ اور قمیص زیب تن تھی دنیائے اسلام کے اس مایہ ناز وزیر جنگ کی یہ غیر معمولی سادگی اور عجز و نیاز دیکھ کر اہل عرب بہت متاثر ہوئے۔ فخری بے نے ہمت کر کے عرض کی۔

"جناب! آپ حضرات کیلئے سواری کا بندوبست کیا گیا ہے"

انور نے ان کا سکوت توڑا۔ اور فرمایا۔

"فخری بے شکریہ، مگر ہم تو روضۂ مطہرہ پیدل ہی جانا چاہتے ہیں"
یہ کہہ کر سب آپ بلا تکلف روضۃ النبیؐ کی طرف پیدل چل پڑے۔ پھر سب سر جھکا ہوا۔ نظریں نیچی۔ رفتار دھیمی۔ سراپا عجز و نیاز سب نے چل رہے تھے امراء وزراء علماء مشائخ اور اہل شہر نہایت سکوت و ادب کے ساتھ پیچھے پیچھے چل رہے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی غمزدہ اسیرہ

فریادی کسی با جبروت شہنشاہ کے دربار میں لایا جا رہا ہو۔ خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کے بعد جس قدر بھی شاہانِ زمن دربارِ رسول میں حاضری کے لئے آئے کسی کی آمد نے ایسا دلگداز نظارہ پیش نہ کیا۔

باب السلام میں پہنچتے ہی سر بسجود ہو گئے۔ زار و قطار روتے بچشم تر حرم میں داخل ہو کر جالی مبارک کو بوسہ دیا۔ اور اپنی دکھ بھری کہانی اپنے آنسوؤں کی زبانی سنا کر ساری قوم کی سرفرازی کیلئے محوِ دعا ہو گئے۔

اہلِ مغرب جس جرنیل کا نام سن کر کانپ اُٹھتے تھے اس کی سادگی و عاجزی ہمارے اربابِ اقتدار کے لئے ایک قابلِ عمل سبق ہے۔ جو صرف ظاہری وقار کو قائم رکھنے کے لئے اسراف کی حد تک خرچ کرنے کے عادی ہیں۔

(۱۴)

فیاضی و بے نیازی

گدائے میکدہ کی شانِ بے نیازی دیکھ
پہنچ کے چشمۂ حیواں پہ توڑتا ہے سبو

مستغنی کی حاجت

خلیفہ منصور ابوجعفر نے حضرت عمرو بن عبید کی خدمت کرنے کی غرض سے ان کے سامنے کچھ مال پیش کیا۔ انہوں نے بکمال استغنیٰ شاہی عطیہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ خلیفہ نے اسے بُرا منایا اور قسم کھا کر کہا۔ "واللہ آپ کو یہ قبول کرنا ہوگا۔" عمرو بن عبید نے بھی قسم کھالی کہ "واللہ میں ہرگز قبول نہ کروں گا۔" خلیفہ کا لڑکا مہدی بھی اس وقت موجود تھا۔ اس نے اپنے والد کی قسم کی اہمیت جتاتے ہوئے ان سے کہا۔ امیر المومنین نے تو قسم کھالی ہے۔ انہوں نے جواب دیا امیر المومنین کو بہ نسبت میرے کفارہ ادا کرنا زیادہ آسان ہے۔"

اس جواب نے دونوں باپ بیٹوں کو لاجواب کر دیا۔ منصور نے کہا۔ اچھا اب آپ ہی اپنی کوئی حاجت بیان کریں۔ انہوں نے فرمایا "مجھے صرف اتنی حاجت ہے کہ جب تک میں خود نہ آؤں۔ مجھے نہ بلایا جائے اور جب تک میں خود نہ طلب کروں۔ مجھے نہ دیا جاوے۔"

سبحان اللہ! اہل ایمان دنیا کو کتنا ہیچ سمجھتے ہیں۔

دامِ زر

داؤد بن نصیر ابو سلیمان الطائی دوسری ہجری کے ایک زاہد پیشہ بزرگ تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کے بیس سال صرف تین سو درہم پر گزارے جس سے ان کی غربت و افلاس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

آپ کوفہ کے مشہور قاریوں میں سے تھے۔ ایک بار ہارون رشید کوفہ آیا اس نے وہاں کے قاریوں کی ایک فہرست مرتب کی تاکہ ازراہِ خسروی ہر ایک کو دو دو ہزار درہم دئیے جائیں۔ یہ عطیہ تقسیم کرنے کے لئے قرار کی فہرست پڑھی جا رہی تھی۔ ان کا بھی نام پکارا گیا۔ یہ غیر حاضر تھے۔ غیر حاضری کی جب وجہ معلوم کی گئی۔ تو پتہ چلا کہ آپ کو اطلاع ہی نہیں ہوئی تھی۔ اسلئے حکم ہوا کہ یہ رقم انکی خدمت میں بھیج دی جاوے۔ اس کام پر ابن سماک اور حماد بن ابی حنیفہ کو مامور کیا گیا۔

یہ حضرات داؤد بن نصیر کی بے اعتنائی سے بخوبی واقف تھے
انہیں خدشہ پیدا ہوا کہ شاید وہ یہ شاہی عطیہ قبول نہ کریں۔ اس لئے
دونوں نے صلاح کی۔ کہ نادار شخص پر زر و جواہر کی کثرت بڑا اثر کرتی
ہے۔ لہٰذا یہ رقم تھیلی میں پیش کرنے کی بجائے ان کے سامنے
بکھیر دی جائے۔

ان حضرات نے داؤد کی خدمت میں پہنچ کر تھیلی الٹ دی۔
اور درہم ان کے روبرو بکھیر دیئے۔ تاکہ آنکھ سے دیکھنے کا اثر دل پر
پڑے اور یہ نادار ان کو قبول کر لے۔ وہ ایسی کچی گولیاں کب کھیلنے
والے تھے۔ فوراً تاڑ گئے اور کہا۔

"یہ چالیں تو بچوں کے ساتھ چلی جاتی ہیں۔ بس یہ عطیہ
قبول کرنے سے معذرت چاہتا ہوں۔"

آپ کی یہ بے نیازی اس احتیاط کی وجہ سے تھی کہ ان کے
نزدیک شاہی خزانہ کی آمدنی مشتبہ تھی۔ جیسے آج کل منشیات
اور سینما وغیرہ کے ٹیکس اکٹھے خزانہ میں جمع ہوتے ہیں۔ اور یہاں
سے تنخواہیں تقسیم کی جاتی ہیں۔

اس دور میں ایسے محتاط بزرگ بہت ہی کم پائے جاتے ہیں۔

دولت سے فرار

صفوان بن سلیم زہری مدینۃ الرسولؐ کے فقہا میں سے تھے بڑے زاہد و عابد تھے۔ سخاوت کی یہ حد تھی کہ ایک شب سردی کے موسم میں مسجد سے باہر نکلے ایک شخص کو ننگے بدن دیکھا۔ فوراً اپنے کپڑے اتار کر اسے پہنا دیے۔

لیکن استغنا کا یہ عالم تھا کہ سلاطین و امراان کی خدمت میں جو کچھ بھیجتے۔ وہ واپس کر دیتے تھے۔ ایک مرتبہ سلیمان بن عبدالملک مدینہ آیا۔ جب مسجد نبوی میں گیا۔ تو اس کی نظر صفوان پر پڑی ہمراہیوں سے پوچھا۔

"یہ کون بزرگ ہیں ان کے بشرہ سے بہتر میں نے آثار نہیں دیکھے"

ہمراہیوں نے کہا۔

"یہ صفوان بن سلیم ہیں۔"

یہ سنتے ہی عبدالملک نے غلام کو حکم دیا کہ پانسو دینار کی تھیلی

ان کی خدمت میں پیش کرے۔ غلام پانسو کی تھیلی لے کر ان کے پاس گیا۔ اور کہا۔

"امیرالمومنین یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ اور آپ کے لئے یہ نذرانہ بھیجا ہے۔"

صفوان بولے

"تمہیں دھوکا ہوا ہے انہوں نے کسی اور کے پاس بھیجا ہوگا"

غلام نے عرض کیا۔

"آپ صفوان نہیں ہیں؟"

انہوں نے جواب دیا کہ

"صفوان تو میں ہوں لیکن احتیاطاً تم جا کر دوبارہ ان سے پوچھ لو۔"

غلام جونہی تصدیق مزید کے لئے سلیمان کی طرف بڑھا صفوان نے فوراً جوتا سنبھالا اور آنکھ بچا کر مسجد سے نکل گئے اور اس وقت تک واپس نہ آئے جب تک کہ سلطان چلا نہ گیا۔

لوگ آج کل دولت کے پیچھے دوڑتے ہیں اور اس زمانہ میں دولت لوگوں کا پیچھا کیا کرتی تھی۔

اخلاقی خسارہ

مسروق بن عبدالرحمن راجہ ؒ یمن کے بڑے نامور شہسواروں سے تھے۔ اموی دور میں کچھ عرصہ منصب قضا پر سرفراز رہے۔ یہ خدمت بلامعاوضہ انجام دیتے رہے۔ ان کی نگاہ میں دنیا کی کوئی حقیقت نہ تھی۔ ان کا دل اس کی طرف مائل ہی نہ ہوتا تھا۔ اور نہ دنیا کی کوئی چیز ان کے لئے کشش رکھتی تھی۔ اکثر لوگ ان کی خدمت کا شرف حاصل کرنا چاہتے تھے۔ مگر ان کی بے نیازی کا شکار ہو جاتے تھے۔

ایک مرتبہ خالد بن اسید نے ان کے پاس تیس ہزار کی رقم بھیجی آپ نے واپس کر دی۔

ان کے عزیز و اقربا نے آپ کو اس کثیر رقم کی واپسی سے باز رکھنے کی بہتیری کوشش کی اور سمجھایا کہ

"لے لیجئے۔ اس سے صدقہ کیجئے گا۔ عزیزوں کے ساتھ

سلوک کیجیئے گا۔ اور اسی قبیل کے دوسرے کاموں میں خرچ کیجئے گا۔"

مگر وہ اس کی قبولیت پر رضامند نہ ہوئے۔ گو کبھی کبھی فاقہ کی نوبت آجاتی تھی۔ لیکن بے نیازی کا دامن کبھی نہیں چھوٹتا تھا۔ یہاں تک کہ ایک روز بیوی نے شکایت کی۔

"آج بچوں کے کھانے کی کوئی چیز نہیں ہے ——"

یہ سن کر مسکرائے اور فرمایا۔

"خدا کی قسم وہ ان کے رزق کا ضرور انتظام کریگا یہ اسی کے ذمہ ہے۔"

انجبار سے میل جول اور لین دین کو اخلاقی خسارہ تصور کرتے تھے۔ مگر آج اخلاقی خسارہ کون پوچھتا ہے۔ اب تو مالی خسارہ پورا کرنے کے لئے اخلاق و ایمان تک قربان کر دیا جاتا ہے۔

دنیا کی بے قدری

تیسری صدی ہجری کے قاضی ابو عبداللہ محاملی مدینہ میں نمازِ عید سے فارغ ہوتے تو سب سے پہلے اس وقت کے عالم باعمل داؤد ظاہری کو مبارک باد عرض کرنے کے لئے پہنچے۔ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ عید کے دن بھی وہ جو کی بھگو کر کھا رہے ہیں۔

وہاں سے فارغ ہو کر قاضی صاحب ان کے ایک پڑوسی کے پاس گئے جو بڑے فیاض واقع ہوئے تھے اور شکوہ کیا کہ "آپ اپنے ہمسایہ کی خبرگیری نہیں کرتے۔ آپ کے قریب ہی داؤد جیسا عالم رہتا ہے جو عید کے دن بھی جو کی روٹی بھگو کر کھا رہا ہے"

ہمسایہ نے کہا۔

"میں نے کل شام ہی ان کی خدمت میں ایک ہزار درہم بھیجے تھے۔ تاکہ وہ اپنی ضروریات پر صرف کریں لیکن انہوں نے یہ قبول نہ کئے اور غلام کے ہاتھ کہلا بھیجا کہ تم نے مجھ کو کس آنکھ سے دیکھا۔ اور میری کس ضرورت اور احتیاج کا حال تم کو معلوم

ہوا۔ کہ تم نے میرے پاس یہ درہم بھیجے۔ اب آپ ہی بتایئے اس میں میرا کیا قصور؟"

قاضی نے کہا "لایئے مجھے دیجئے۔ میں خود دے آتا ہوں"۔

ہمسایہ نے اب ایک ہزار کی بجائے دو ہزار درہم دیئے جب یہ دو ہزار درہم لے کر ان کے پاس پہنچے۔ تو داؤد نے فرمایا "میں نے تمہیں عالم سمجھ کر اندر آنے دیا۔ تم نے میری اندرونی حالت کا بیرونی آدمی سے اظہار کر کے امانت میں خیانت کی ہے۔ مجھے دام و درہم کی ضرورت نہیں واپس لے جایئے"۔

قاضی صاحب بصد حریاں واپس لوٹے اور فرمایا "جب میں واپس ہوا۔ تو دنیا میری آنکھوں میں نہایت حقیر معلوم ہوتی تھی"۔

قاضی صاحب نے یہ درہم اس فیاض ہمسایہ کو واپس کرنے چاہے انہوں نے یہ کہہ کر لینے سے انکار کر دیا کہ میں ان درہموں کو خدا کی راہ میں نکال چکا ہوں اب واپس نہیں لے سکتا۔ آپ مستحقین میں تقسیم کر دیجئے"

غور کیجئے۔ ایک ہمسایہ تونگری کے ذریعہ حق تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں تھا۔ دوسرا تقویٰ کے راستے اس کی رضامندی کا متلاشی تھا۔ راستے گو جدا جدا تھے مگر مقصد دونوں کا ایک تھا ہمسایہ کی فیاضی اور عالم کی بے نیازی دونوں قابل رشک ہیں۔

دوزخ سے آزادی

ایک زمانہ میں کوفہ بہت بڑا علمی مرکز تھا۔ محمد بن قحطبہ اپنے بچوں کیلئے ایسے استاد کی تلاش کے لئے وہاں آیا جو قرآن۔ حدیث۔ فقہ۔ نحو اور شعر و شاعری کا ماہر ہو۔

تحقیق سے پتہ چلا کہ ان تمام علوم کے جامع صرف داؤد طائی ہی ہیں آپ نے ان کی خدمت میں دس ہزار درہم کا توڑا بھیجا تاکہ اسے آپ اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

اس جامع کمالات کے لئے دس ہزار تو کیا دس کروڑ دینار بھی کوئی قیمت نہ رکھتے تھے۔ اسلئے انہوں نے ان کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور واپس لے جانے کے لئے فرمایا۔

محمد بن قحطبہ نے خیال کیا کہ شاید رقم تھوڑی تھی اسلئے شرفِ قبولیت نہیں پا سکی۔ اس نے اب اپنے دو غلاموں کے ہاتھ دس دس ہزار کے دو توڑے بھجوائے اور غلاموں کو کہا کہ اگر تم انہیں قبول کرانے

ہیں کامیاب ہوئے تو آزاد کر دئیے جاؤ گے۔

دونوں یہ ہدیہ لے کر ان کی خدمت میں پہنچے۔ اور اپنی آزادی کے لالچ میں بہت چکنی چپڑی باتیں کیں کہ کسی طرح یہ ہدیہ قبول ہو جائے جب وہ کسی طرح رام ہوتے دکھائی نہ دیے۔ تو غلاموں نے کہا۔

"اگر آپ ان کو قبول کر لیں۔ تو ہم آزاد ہو جائیں گے"

انہوں نے فرمایا۔

"ان کے واپس کرنے سے میری دوزخ کی قید و بند سے آزادی ہو جائے گی"

یہ کہہ کر ہدیہ واپس کر دیا اور دونوں غلام مایوس واپس لوٹے۔

یہ ایسے ہدایا کی قبولیت علم کی اجرت تصور کرتے تھے جس سے ان کی آزادی و خودداری میں فرق پڑتا تھا۔ اس لئے زمانہ سلف کے اکثر علمار تعلیم با معاوضہ دیتے تھے۔ اور کسب حلال سے اپنا گزر اوقات کرتے تھے۔

مگر اس دور میں ایسے لوگ کہاں؟

اُجرتِ تصنیف

پانچویں صدی میں ابو غالب تمام بن غالب نے علمِ لغت پر ایک نہایت ہی عمدہ اور جامع کتاب تحریر کی تھی۔

امیر ابو الجیش مجاہد بن عبداللہ کو جب اس کا علم ہوا تو انہیں خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا انتساب ان کے نام پر کیا جائے۔

چنانچہ امیر ابو الجیش نے ان کی خدمت میں ایک ہزار دینار بھیجے اور کہلا بھیجا کہ

"اس کتاب میں صرف اس قدر اضافہ کر دیں کہ ابو غالب نے اس کتاب کو ابو الجیش مجاہد کے لئے تصنیف کیا۔"

ابو غالب نے یہ اشرفیاں واپس کر دیں۔ اور کہلا بھیجا۔

"اگر مجھ کو تمام دنیا دیدی جائے۔ تب بھی میں ایسا نہیں کر سکتا اور نہ اس جھوٹ کو جائز سمجھتا ہوں۔ کیونکہ میں نے اس کتاب کو خاص طور پر تمہارے لئے نہیں لکھا۔ بلکہ تمام

تمام لوگوں کے لئے لکھا ہے۔"

اس کیرکٹر کے قربان جایئے۔ ان لوگوں نے کس طرح علم کی نشان کو دوبالا کیا۔ زمانہ حال میں تو نوبت اس درجہ تک پہنچ گئی ہے کہ اُجرت پر کتابیں تصنیف کر کے امرا کے نام سے شائع کی جاتی ہیں اور اس طرح اپنے علم کو چند روپلی سکوں کے عوض فروخت کیا جاتا ہے۔

یہ علماء کی اسی بلند اخلاقیوں کا نتیجہ تھا کہ اُن کا فیضِ علم صرف امرار و سلاطین کے لئے وقف ہو کر نہیں رہ گیا تھا۔ بلکہ ہر کس و ناکس کے لئے عام تھا۔ تاکہ کوئی محروم نہ رہے۔

امرا و فقرا

شیخ مصلح الدین مصطفیٰ بن احمد نویں صدی ہجری کے حنفی عالم اور علوم ظاہری و باطنی کے جامع تھے۔ گوشہ نشینی اختیار کی ہوئی تھی۔ ان کے دروازہ پر امرا و اکابر کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ صرف ایک وقتِ مقررہ پر باہر تشریف لاتے تھے۔

اُن کو امرا کی نسبت فقرا کی صحبت زیادہ پسند تھی۔ امرا کو بھی تھوڑا سا وقت دیتے تھے۔ مگر زیادہ تر فقرا کے لئے وقف تھا۔ اربابِ دنیا سے دور ہی رہنا بہتر سمجھتے تھے۔

ترکیہ کے سلطان بایزید خاں نے ملاقات کی خواہش ظاہر کی انہوں نے یہ درخواست منظور نہ کی جس سے سلطان کی حسرت دل ہی دل میں رہ گئی۔

سلطان بھی صاحبِ فہم تھا۔ وہ جان گیا کہ اس میں ضرور کوئی مصلحت ہوگی۔ اس لئے اس نے شرفِ ملاقات کے لئے اصرار کرنا ادب

کے خلاف سمجھا۔

جس وقت اُن کا انتقال ہوا۔ تو سلطان بایزید خاں خود ان کے جنازہ میں شریک ہوا۔ اور چہرہ سے کفن اٹھا کر ان کی زیارت کا شوق پورا کیا۔

ارباب دنیا سے اہل اللہ کی یہ بے نیازی صرف اسلئے ہوتی ہے کہ یہ ان لوگوں کے سامنے بھی اپنی دنیوی اغراض پیش کر کے ان کی پریشانی کا موجب بنتے ہیں۔ ان سے اپنی اصلاح کرالنے یا دین سیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

خود راقم نے ایک ایسے بزرگ سے سوال کیا جنہوں نے خود کو چھپانے کی خاطر کوٹ پتلون پہن رکھا تھا۔ کہ آپ لوگوں سے چھپ کر انہیں اپنے فیض سے کیوں محروم رکھتے ہیں۔ فرمایا

"جو بھی آتا ہے دنیوی اغراض کے لئے آتا ہے نہ کہ اپنے دین کی درستی کے لئے۔ جس سے ہمیں پریشانی ہوتی ہے"

آہ۔ یہ ایسا زمانہ ہے کہ دین پر دنیا کو مقدم سمجھا جاتا ہے۔

شانِ بے نیازی

ترکیہ کے بادشاہ طرمشیرین کے زمانہ میں شاہی مسجد کی امامت کے فرائض امام حسام الدین الیاغی سرانجام دیا کرتے تھے جنہیں دیکھنے اور ملنے کا شرف سیاح اسلام ابن بطوطہ کو بھی حاصل ہوا۔ وہ لکھتے ہیں کہ

امام ہر جمعہ کو لوگوں کے سامنے وعظ کہتا ہے۔ اور بادشاہ کو نیکی کا حکم دیتا ہے۔ اس کو برائی اور ظلم سے روکتا ہے۔ اس کو سخت باتیں سناتا ہے۔ مگر بادشاہ خاموشی کے ساتھ اس کی باتیں سنتا ہے۔ اور روتا ہے۔

وہ نہ بادشاہ کا عطیہ قبول کرتا۔ نہ اس کا کھانا کھاتا۔ نہ اس کا کپڑا پہنتا۔ وہ خدا کے نیک بندوں میں سے تھا۔

اکثر میں اس کے جسم پر ایک سوتی روئی دار قبا دیکھا کرتا تھا۔ جو بوسیدہ ہو کر پھٹ گئی تھی۔ سر پر نمدے کی ویسی ہی کم قیمت ایک ٹوپی تھی۔ جس کے اوپر عمامہ نہ تھا۔ میں نے

ایک دن کہا۔

"آپ نے یہ کیسی قبا پہنی ہوئی ہے۔ جو اچھی نہیں ہے۔"

اس نے کہا۔

"یہ میری نہیں ہے۔ میری لڑکی کی ہے۔ میں نے پچاس سال سے خدا سے یہ عہد کر رکھا ہے۔ کہ کسی کا عطیہ قبول نہ کروں گا۔"

اس کی یہی فقیری "امیری" کو خاطر میں نہ لاتی تھی۔ اور یہ حقیقت نفس الامری ہے کہ کسی کا ایک لقمہ کھانا بھی اس کی نظریں نیچی کر دیتا ہے۔ اور خودداری کا خون ہوتا ہے۔ جسے زندہ رکھنے کے لئے ہمارے علما و صلحا، سلاطین اور امرا کے عطیوں اور نذرانوں سے دور بھاگا کرتے تھے۔ مگر اس دور تک وہ خودداری نہیں آئی۔ یہ دورِ زرگری ہے خودداری نہیں۔ جس کے مرثیے شاعرِ اسلام علامہ اقبالؒ کہتے کہتے آخری نیند سو گئے۔

حسنِ کردار

عبدالرحمٰن بن ربیعہ آذر بائیجان کے گورنر تھے۔ ایک مرتبہ ان کو ملنے کے لئے اس مفتوحہ علاقہ کے سابق بادشاہ کا ایک شہزادہ آیا۔ عبدالرحمٰن نے اسے اپنے قریب بٹھالیا۔ ان کی نظر اس خوبصورت انگوٹھی پر جا پڑی جو شاہزادہ نے پہن رکھی تھی۔

عبدالرحمٰن نے دریافت کیا۔

"یہ کہاں سے لائے ہو؟"

کہا

"میرے باپ نے ایک حکمران کو لکھا تھا۔ اس نے ایک بیش بہا ہیرا بھیجا۔ جو اس انگوٹھی میں جڑا ہے۔ اگر آپ لینا چاہیں تو لے سکتے ہیں۔"

عبدالرحمٰن نے جواب دیا۔

"ہرگز نہیں مسلمان جب کسی ملک پر حملہ کرتا ہے۔ تو اس کا

مقصد لعل و جواہر اور سونا چاندی جمع کرنا نہیں ہوتا۔ بلکہ اعلائے کلمۃ الحق ہوتا ہے۔"

ان کے اس طرزِ عمل سے شہزادہ اتنا متاثر ہوا کہ اسی وقت مسلمان ہو گیا اور کہا

"اگر کوئی ایران کا حاکم ہوتا۔ تو مجھ سے جبراً چھین لیتا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ مسلمان کا کردار بہت بلند ہے۔"

سبحان اللہ مسلمانوں کا کردار جب تک منصفانہ رہا۔ انکی تعریف میں غیر مذاہب کے لوگ بھی رطب اللسان رہے۔ اور ان کے کردار کی بلندی سے اشاعتِ اسلام ہوئی۔ مگر اس زمانہ میں مسلمانوں نے اپنی بداعمالیوں سے اسلام کو اتنا شدید نقصان پہنچایا ہے جتنا دشمن نہیں پہنچا سکتے۔

امام اور بادشاہ

ابن بطوطہ نے اپنی سیاحت ترکیہ کے زمانہ کا ایک چشم دید واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز وہ نماز عصر کے لئے مسجد گئے۔ بادشاہ بھی اس میں نماز پڑھا کرتا تھا۔ اس مسجد کے امام حسام الدین الباغی تھے نماز کا وقت قریب ہوا۔ تو بادشاہ کا غلام اس کا مصلیٰ لایا جہاں وہ روزانہ معمولاً نماز پڑھا کرتا تھا وہاں بچھا دیا۔ اور امام سے کہا۔

"سرکار چاہتے ہیں جب تک وہ وضو سے فارغ نہ ہو جائیں تھوڑی دیر کے لیے نماز میں ان کا انتظار کیا جائے"۔

امام نے کہا۔

"نماز خدا کے لئے ہے۔ یا طرمتیرین کے لئے"۔

امام نے مؤذن کو تکبیر کہنے کا حکم دیا۔ جماعت کھڑی ہوئی اور نماز شروع کر دی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد بادشاہ پہنچا۔ وہ دو رکعت نماز پڑھ چکے تھے۔ اس لئے بادشاہ اخیر کی دو رکعتوں میں شامل ہو گیا۔

چونکہ اخیر میں آیا تھا۔ اسلئے اسے آج مسجد کے دروازہ کے پاس جگہ ملی۔ جہاں لوگ جوتے اتارتے تھے۔ اور وہاں اس نے نماز ادا کی۔ جب نماز مکمل کر چکا تو ہنستا ہوا۔ امام صاحب کی طرف بڑھا ان سے مصافحہ کیا اور محراب کے سامنے بیٹھ گیا۔

اس وقت امام مسجد کے ایک طرف بادشاہِ وقت بیٹھا تھا اور دوسری طرف ابن بطوطہ بیٹھے تھے۔ بادشاہ نے ابن بطوطہ سے کہا۔

"جب اپنے ملک میں جانا تو کہنا کہ ایک عجمی فقیر ترکوں کے بادشاہ کے ساتھ یہ برتاؤ کرتا ہے۔"

اس واقعہ سے ایک تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں نماز کے وقت مسجد میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہوتی تھی۔ ورنہ صرف دیر سے آنے کی وجہ سے بادشاہ کو مسجد کے صحن میں نہیں بلکہ جوتیاں اتارنے والی جگہ پر نماز نہ پڑھنی پڑتی۔ دوسرا یہ کہ اس وقت کے علماء احکامِ الہٰی کے مقابلے میں شہنشاہِ وقت کے حکم کی قطعاً پروا نہیں کرتے تھے۔ خواہ سرکاری خزانہ کے وظیفہ خوار ہی کیوں نہ ہوں۔ اور نہ ہی اس دور کے حاکمِ اعلیٰ اس زمانہ کے حکام کی طرح کم ظرف ہوتے تھے کہ ذرا کسی نے ان کی مرضی کے خلاف کوئی بات کہہ دی۔ تو اسے جیل میں بند کر دیا۔

خوددار فیاض

حماد بن مسلم کوفہ کے مشہور امام اور استاذِ وقت تھے۔ آئمہ فن مسعر، شعبہ اور ابو حنیفہؒ نے انہی کے حلقۂ درس میں تعلیم پائی تھی۔ علم و فضل کے علاوہ مال و دولت نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ ان کے زمانہ میں ابن زیاد کوفہ کا عامل مقرر ہو کر آیا۔ ایک شخص نے ملازمت کے لئے اسے سفارش کرنے کے لئے حماد سے درخواست کی انہوں نے پوچھا کہ اس خدمت سے تمہیں کس قدر مالی فائدہ پہنچیگا؟ اس نے کہا "ہزار درہم"۔ حماد نے جواب دیا۔

"میں تم کو پانچ ہزار درہم خود دلوا دیتا ہوں۔ اس کے سامنے اپنی آبرو ریزی نہیں کرانا چاہتا"۔ چنانچہ انہوں نے اسے از گرہ خود پانچ ہزار درہم دے دیئے مگر اپنی خودداری کو ٹھیس نہ لگنے دی۔

آج کل خوددار فیاضوں کی بجائے بے ضمیر دولتمند بکثرت نظر آتے ہیں۔ جو لاکھوں کے مالک ہوتے ہوئے قلیل مفاد کیلئے دستِ سوال دراز کرنے سے نہیں ہچکچاتے۔

(۱۵)

دین و دنیا

وہی جہاں ہے ترا جس کو تو کرے پیدا!
یہ سنگ و خشت نہیں جو تری نگاہ میں ہے

فہمِ دین

دورانِ سیاحتِ خوزستان ابن حوقل ایک شہر سے گزر رہا تھا۔ دو قلیوں کی باہمی بحث و تمحیص نے اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ اس نے دیکھا کہ ایک قلی بوجھ اٹھائے بازار سے گزر رہا ہے۔ دوسرا قلی بھی بوجھ سے لدا اس کے ساتھ چل رہا ہے۔ دونو بوجھ سے جھکے جا رہے ہیں۔ مگر اس کا انہیں کچھ احساس نہیں اور بڑے مزے سے تفسیرِ قرآن اور علم الکلام کی بحث میں محو چلے جا رہے ہیں۔ ابن حوقل ایسے اہم دینی مسائل پر ان کی دلچسپ بحث سنتا ہوا دور تک چلا گیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں تعلیمِ دین عام تھی۔ ہر شخص دین سمجھنے کی فکر میں رہتا تھا۔ جسے حاصل کرنا آج ہمارا ادیب کسرِ شان سمجھا جاتا ہے۔ جن ممالک میں آج تعلیم کا عام چرچا ہے۔ وہاں قلی تو کیا عام شہری بھی ایسے اہم مضامین پر بحث کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔

فقیہیں فضیلت

ایک دن مامون رشید نے دربار لگایا ہوا تھا۔ ہر فن کے باکمال دربار میں موجود تھے۔ ایک عورت نے آکر فریاد کی۔

"امیرالمومنین۔ میرا بھائی فوت ہو گیا ہے۔ اس نے چھ سو اشرفیاں ترکہ میں چھوڑی ہیں۔ مگر مجھے صرف ایک دی گئی ہے"

مامون رشید نے اس خیال سے کہ اس کے ساتھ بے انصافی کیسے ہو سکتی ہے۔ دل ہی دل میں کچھ حساب لگایا۔ اور کچھ دیر کے غور و تامل کے بعد عورت سے کہا کہ

"تمہاری حق تلفی نہیں ہوئی۔ تمہارا حصہ واقعی ایک اشرفی بنتا ہے۔"

اس غیر متوقع جواب پر سب حیران ہوئے علماء نے کہا۔

"یہ کیسے؟"

مامون نے کہا۔

"متوفی کی دو بیٹیاں ہوں گی، دو تہائی یعنی چار سو اشرفیاں وہ
لے گئی ہوں گی۔ متوفی کی ایک والدہ ہوگی چھٹا حصہ یعنی
سو اشرفیاں اس نے لی ہوں گی۔ متوفی کی ایک بیوی ہوگی
آٹھواں حصہ یعنی پچھتر اشرفیاں اسے ملی ہوں گی۔"

اس کے بعد مامون نے اس عورت سے پوچھا۔

"تو سچ بتا۔ متوفی نے بارہ بھائی نہیں چھوڑے ہیں؟"

عورت نے اثبات میں جواب دیا تو مامون نے کہا۔

"دو دو اشرفیاں بھائیوں کے حصہ میں آئی ہوں گی یعنی
چوبیس اشرفیاں سب بھائی لے گئے۔ تو باقی ایک ہی
بچی۔ جو تمہارا حصہ تھا۔"

مامون رشید کی اس فقہی قابلیت پر سب عش عش کر اٹھے۔

شاہانِ سلف اکثر امورِ شرعیہ کے خود ماہر ہوتے تھے۔ مگر ہمارے
اربابِ حکومت حدودِ شرعیہ کے قریب آنے سے بھی گھبراتے ہیں۔

جائز و ناجائز

خلیفہ واثق باللہ کے زمانہ میں فتنہ خلقِ قرآن زوروں پر تھا اس نے احمد بن داؤد کے زیرِ اثر حکم دے رکھا تھا کہ اماموں اور مؤذنوں کا امتحان لیا جائے۔ جو اس مسئلہ کے حق میں ہوں۔ ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ لیکن جو مخالف ہوں انہیں قید یا قتل کر دیا جائے۔

اسی سلسلہ میں ابو داؤد اور نسائی کے استاد ابو عبد اللہ بن محمد ازدی مسئلہ خلقِ قرآن کے انکار کے جرم میں گرفتار ہو کر پابجولاں خلیفہ واثق باللہ کے سامنے لائے گئے۔ احمد بن داؤد بھی اس وقت خلیفہ کے پاس بیٹھا تھا۔

ابو عبد اللہ ابن داؤد سے یوں مخاطب ہوئے۔

"جس مسئلہ کی طرف تم لوگوں کو بلا رہے ہو۔ اس کا علم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی تھا یا نہیں۔ اگر آنجناب کو اس مسئلہ کا علم تھا۔ تو حضور نے اس کی طرف لوگوں کو کیوں نہ بلایا۔"

ابو داؤد نے جواب دیا۔

"آپ کو علم تھا۔"

ابوعبداللہ نے کہا۔

"جب آپ کو اس بات کا علم تھا۔ تو جو کام رسولِ خدا نے نہیں کیا تم اس کو کیوں روا رکھتے ہو اور جس کام کو آنجناب نے ناجائز رکھا تم کس طرح اسے جائز سمجھتے ہو"

پا بجولان ابوعبداللہ کا یہ جواب سن کر تمام لوگ متحیر ہو گئے احمد ابن داؤد سے اس کا کوئی جواب بن نہ آیا۔ خلیفہ واثق باللہ ہنستے ہوئے منہ پہ رومال رکھے زنان خانہ میں جا لیٹے۔ اور بار بار یہ الفاظ دہرانے لگے

"جس امر کو رسول اللہ نے ناجائز قرار دیا۔ اس کو ہم جائز سمجھتے ہیں اور جس معاملہ میں حضور نے خاموشی اختیار کی اس میں ہم تشدد کر رہے ہیں۔"

تھوڑی دیر بعد آپ نے حکم دیا کہ اس قیدی کو رہا کر کے تین سو دینار دیئے جاویں ان کو ان کے شہر بھجوایا جاوے۔ اور آئندہ کیلئے اس مسئلہ پہ کسی کا امتحان نہ لیا جائے۔ اس دن کے بعد خلیفہ نے ابن داؤد کو منہ نہ لگایا۔ اور اس نے بھی توبہ کر لی۔

یہی حالت ہماری ہے۔ ہم نے اکثر ایسے رسم و رواج قائم کر رکھے ہیں۔ جو شرعاً ناجائز ہیں اور اکثر ایسے امور شرعیہ ترک کر رکھے ہیں جو واجب التعمیل ہیں۔

امام بخاریؒ اور مزدوری

امام بخاریؒ بعض دن صرف ایک چھوارے پر گزار دیتے تھے کیونکہ انہیں بار بار حاجت کے لئے سترکھولتے شرم آتی تھی ہر حدیث لکھنے سے پہلے غسل کر کے دو رکعت نماز ادا کرتے تھے جن کی تبییض کا کام انہوں نے رسولِ مقبولؐ کی قبر مبارک اور منبرِ اطہر کے درمیان بیٹھ کر انجام دیا تھا۔ جسے اصطلاحِ محدثین میں ترجمہ کہا جاتا ہے۔ ہر ترجمہ لکھتے وقت دو رکعت نماز نفل ادا کرتے تھے۔ وہ اپنے وقت کے رئیس اعظم بھی تھے۔

تیسری صدی ہجری میں انہوں نے اپنے شہر بخارا کے باہر مسافروں کے آرام و آسائش کے لئے ایک سرائے بنوانی شروع کی تعمیر کیلئے اینٹیں مزدور اٹھا کر تعمیر کے قریب ذخیرہ کرتے جاتے تھے۔ اور امام بخاریؒ بنفس نفیس وہ اینٹیں اٹھا اٹھا کر معمار کو دیتے جاتے تھے۔ جو تعمیر کا کام کر رہا تھا۔ اس سرائے کی تعمیر...... میں کافی عرصہ لگ گیا تھا۔

اس تعمیر کے دوران میں ایک روز آپ کا ایک شاگرد ادھر سے
آگزرا۔ اس نے ازراہِ ہمدردی امام موصوف سے مزدوری کی وجہ پوچھی
انہوں نے فرمایا۔

یہ ایسا کام ہے۔ جو نفع دیتا ہے اور اللہ تعالےٰ مجھ کو سلف
صالحین کے اتباع کرنے کا اجر دے گا۔

زہد وورع اور علم و فضل کے باوجود یہ مزدوری؟ کس لئے؟ محض
اتباعِ سلف صالحین کے لئے اللہ اکبر۔ اس سے یہ نہ سمجھئے کہ اس
جلیل القدر امام کی شان میں کوئی فرق آگیا بلکہ اس نے ان کی توقیر
میں چار چاند لگا دیئے۔ اور اس دنیا میں وہ نظیر قائم کی جس کی مثال
ملنی محال ہے۔

مگر دورِ حاضر کی نزاکتوں۔ نفاستوں اور امارتوں نے اتباعِ
سلف صالحین کا جذبہ ہی مٹا دیا ہے۔

شوکتِ کفر پہ ضرب

پرانے زمانہ میں مسلمانوں کے اندر تعمیرات پر فضول خرچی کی حد تک خرچ کرنے کا شوق تھا۔ جس کی تاریخ قدم قدم پر شہادت دے رہی ہے۔ دمشق کی مشہور مسجد "جامعہ اموی" کی تعمیر پر ولید بن عبدالملک نے ایک کروڑ بارہ لاکھ دینار خرچ کئے تھے۔

المقدسی نے اس بارہ میں اپنے چچا حسن سے شکایت کی کہ ولید اگر مسلمانوں کی اس رقم کو جو دمشق کی جامع مسجد پر خرچ ہوئی۔ سڑکوں۔ پلوں۔ اور قلعوں پر خرچ کرتا۔ تو زیادہ بہتر ہوتا۔

حسن نے جواب دیا۔

بیٹا! شام عیسائیوں کا ملک ہے...... جہاں بہترین قسم کے گرجے موجود ہیں۔ جن کی زیبائش و آرائش پر بہت زیادہ خرچ کیا جاتا ہے۔ اگر ولید کو خدا تعالے یہ توفیق نہ دیتا۔ تو مسلمان احساسِ کمتری میں مبتلا ہو جاتے۔ اب یہ

عجائبات دنیا میں شمار ہو رہی ہے"۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ارادہ کیا کہ جامع اموی کے جواہرات اور زر و نقرہ نکلوا کر بیت المال میں جمع کر دیا جائے۔ وہ ابھی اسی فکر میں ہی تھے کہ قیصرِ روم کی طرف سے ایک وفد انہیں ملنے کے لئے آیا۔ وہ اس وفد کو ہمراہ لے کر اس مسجد کی طرف لے گئے۔

ارکانِ وفد پر مسجد کی شان و شوکت کا بہت ہی رعب طاری ہوا جس کے باعث ان سفیروں کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے آواز بھی نہیں نکل سکتی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز نے جب کفار کی یہ کیفیت دیکھی۔ تو اپنی رائے بدل لی۔ اور فرمایا۔

"اے مسلمانو! میں دیکھتا ہوں۔ کہ ہماری مسجد کافروں کے قلوب کا غصہ بن گئی ہے۔ اس لئے اس میں اب کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے"۔

اس واقعہ نے ایسی عمارات کے جواز کی ایک صورت پیدا کر دی ہے۔ کیونکہ ان سے شوکتِ کفر پہ ضرب پڑتی ہے۔

مسجد اور نمازی

بلادِ اسلامیہ میں مسجدیں کثرت سے پائی جاتی تھیں۔ اور ان ہی سے درسگاہوں کا بھی کام لیا جاتا تھا۔ حضورِ نبیِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صرف پندرہ سال کے اندر ممالک اسلامیہ میں چار ہزار مسجدیں تعمیر ہو چکی تھیں۔

یہ تعداد رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ اور ایک وقت ایسا آیا کہ صرف قرطبہ کے شہر میں تین ہزار آٹھ سو تہتر (۳۸۷۳) مسجدیں موجود تھیں۔

جامعہ قرطبہ ۱۲۹۳ ستونوں پر کھڑی تھی۔ ان ستونوں کے درمیان جو قبے بن گئے تھے۔ ان کی تعداد ۲۸۰ تھی وہ درسگاہوں کا کام دیتے تھے۔ یعنی صرف اسی ایک مسجد میں ۲۸۰ درسگاہیں تھیں۔ اس کے اندرونی حصہ میں پچاس ہزار اور صحن میں تیس ہزار آدمی بآسانی نماز پڑھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ وہاں سات سو سے اوپر اعلیٰ درجہ کی مساجد تھیں۔

اسی طرح کوفہ کی ایک مسجد میں کم وبیش چالیس ہزار نمازیوں کی گنجائش تھی۔ جسے زیاد کی گورنری کے زمانہ میں ساٹھ ہزار نمازیوں کے لئے وسیع کیا گیا تھا۔ جامعہ اموی دمشق میں بیس ہزار نمازیوں کی نشستگاہ تھی۔ اور یہی حال فسطاط مصر کی جامع عمرو بن عاص کا تھا۔

ان مسجدوں میں علماء و فقہاء رہا کرتے تھے جن سے استفادہ کرنے والوں کی بقول ابن حوقل یہ حالت ہوتی تھی کہ کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔

اب آپ خود ہی اندازہ لگایئے کہ اُس وقت نمازیوں کی کثرت اور تعلیم دین کا کتنا شوق و اہتمام تھا۔ اس کے مقابلہ میں آج ہماری مسجدیں نمازیوں کو ترستی ہیں۔ اور تعلیم دین کی طرف تو رغبت ہی نہیں رہی۔

عجیب آزمائش

سکندریہ کی فتح کی مہم جاری تھی مسلمانوں کی فوج پڑاؤ ڈالے پڑی تھی۔ سکندریہ کے بادشاہ نے اپنے سائیسوں کو حکم دیا کہ وہ اس کی سواریوں میں سے ایک عمدہ خچر پہ سونے کا ایک مرصع بجواہر و یاقوت زین کسیں۔ سونے کا لگام لگائیں۔ موتیوں کی ایک مالا اسکی گردن میں ڈالیں۔ اور عربوں کے لشکر کی طرف لے جا کر اسے چھوڑ آئیں۔

بادشاہ کا یہ مقصد تھا کہ دنیا کی محبت ان پر غالب آجائے گی۔ اور اس طرح انہیں مغلوب کر لیں گے۔

غلاموں نے حکم شاہی کے مطابق بادشاہ کا ایک بہترین خچر زر و جواہر سے مرصع کر کے رات کے وقت مسلمان لشکر کے قریب چھوڑ دیا۔

رات کو مسلمانوں کے لشکر کی نگاہبانی کے فرائض کاتب رسولؐ حضرت شرجیل بن حسنہ انجام دے رہے تھے۔ جب وہ خچر مسلمانوں کی

فوج کے قریب پہنچا۔ تو وہ اس کی زیب و زینت دیکھ کر ہنس پڑے اور فرمایا۔

"خدا کے دشمن ہمارا امتحان لیتے ہیں۔ کہ ہم دنیا کے طالب ہیں یا آخرت کے۔ خدا کی قسم ہمارے اندر کوئی مسلمان ایسا نہیں۔ جو فانی چیزوں کی طرف توجہ کرے۔ ہماری نظر تو باقی اور ہمیشہ رہنے والی چیز پر ہے۔"

انہوں نے اس خچر کو لگام سے پکڑ کر قبطیوں کے لشکر کے پاس جا کر چھوڑ دیا۔

جب یہ سجی سجائی پھرتی زینت واپس پہنچی۔ تو بادشاہ کا چہرہ فق ہو گیا اس نے کہا۔

"خدا کی قسم۔ انہی باتوں کی وجہ سے مسلمان مظفر و منصور ہوتے چلے جاتے ہیں اور ہم قعرِ ذلت میں گرتے جا رہے ہیں"۔

بعینہٖ یہی حالت ہماری ہے۔ وہ دنیا سے نفرت کر کے اس پر حکمران رہے ہم اس سے محبت کر کے ہر جگہ محکوم نظر آتے ہیں۔

خلیفہ کی حسرت

خلیفہ المتوکل کو فتح بن خاقان سے بہت محبت تھی۔ اکثر ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے۔ اگر فتح بن خاقان کہیں چلے جاتے۔ تو خلیفہ کا عیش و آرام حرام ہو جاتا۔ دونو ایک جان دو قالب کا صحیح نمونہ تھے یہ محبت و رفاقت آخر وقت تک قائم رہی۔ اور دونوں ایک ہی دن ایک ہی وقت اور ایک ہی جگہ قتل ہوئے۔

ایک دن فتح بن خاقان جب خلیفہ کے پاس آئے۔ تو خلیفہ سر جھکائے مغموم و متفکر بیٹھے تھے۔ فتح بن خاقان نے پوچھا۔

امیر المومنین۔ آپ کو تو ہر قسم کا عیش و آرام میسر ہے۔ جو روئے زمین پر اور کسی کو حاصل نہیں۔ پھر یہ غم و فکر کیوں؟"

متوکل نے نہایت حسرت سے جواب دیا۔

"مجھ سے بھی زیادہ وہ شخص آرام میں ہے۔ جسے اسباب معیشت حاصل ہوں۔ جو وسیع مکان اور ایک صالح و

نجیب بخت بیوی رکھتا ہو۔ نہ وہ ہمارا محتاج ہے کہ ہم اسے ذلیل سمجھ سکیں۔ اور نہ کسی کی مجال ہے کہ اسے آواز دے سکے"

واقعی ایک شہری کو جو آزادی و حقوق حاصل ہوتے ہیں۔ وہ کسی بادشاہ کو حاصل نہیں ہو سکتے۔ بلندی مراتب کے ساتھ ذمہ واری اور جواب دہی کا بوجھ بھی بڑھتا جاتا ہے۔ جو ان کی زندگی کو بے لطف بنا دیتا۔ اسی سلئے یہ لوگ بسا اوقات عام شہریوں پر رشک کرنے لگتے ہیں۔

عزت کے متلاشی

خلیفہ المتوکل علی اللہ نے ایک مرتبہ علماء کرام کا اجلاس طلب کیا جس وقت سب آگئے تو خود شرکتِ مجلس کے لئے باہر نکلا۔

خلیفہ وقت کی تعظیم کے لئے تمام علماء کھڑے ہوگئے مگر احمد بن معدل بیٹھے رہے۔ متوکل نے عبید اللہ سے پوچھا۔

"کیا اس شخص نے ہماری بیعت نہیں کی؟"

عبید اللہ نے ان کی طرف سے وکالت کرتے ہوئے کہا۔

"امیر المومنین۔ انہوں نے بیعت ضرور کی ہے۔ مگر ان کی بینائی کمزور ہے۔ اس لئے یہ کھڑے نہیں ہوتے۔"

احمد بن معدل بولے

"امیر المومنین۔ میری بینائی درست ہے اور میں اچھی طرح دیکھ سکتا ہوں۔ اس میں کوئی فرق نہیں آیا۔ مگر میں آپ کو خدا کے عذاب سے بچانا چاہتا ہوں۔ کیونکہ نبی کریم صلی اللہ

علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جو شخص لوگوں سے یہ امید رکھے کہ وہ اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوں۔ وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنائے۔"

یہ سن کر متوکل انہیں کے برابر آکر بیٹھ گیا۔

کیا ہی خوش نصیب لوگ تھے جو نتائج و عواقب سے بے نیاز ہو کر بادشاہوں کو ایسی ایسی کھری باتیں سنا دیتے تھے جب اہلِ ایمان کو حق کہنے سے کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔

مالی نظام

مامون رشید نے خدیجہ بنت حسن بن سہیل سے شادی کے وقت دس کروڑ فرانک خرچ کئے تھے۔ اور اپنے خسر حسن بن سہیل کو دس ملین فرانک اور فارس واہواز کا ایک سال کا خراج بطور انعام دیا تھا۔ عام طور پر وہ اپنے خاص آدمیوں پر روزانہ دو ہزار فرانک خرچ کیا کرتا تھا۔ صرف تین آدمیوں کو روزانہ پندرہ لاکھ فرانک بخشش کے طور پر دئے جاتے تھے۔ ایک مرتبہ سوار ہوتے وقت اس نے چوبیس ملین فرانک خیرات کر ڈالے۔

یہ سب ہنگامی اخراجات تھے۔ فوج۔ وزرا۔ حکام۔ قاضیوں اعلیٰ عہدہ داروں اور افسروں کی تنخواہیں۔ شعرا۔ فقرا اور علماء کے وظائف اور عطیے۔ سرحدی حفاظت۔ فتوحات۔ جنگی اخراجات۔ شاہی خاندان کے ذاتی اخراجات غرضیکہ کل مستقل اخراجات نکال کر خزانہ میں تین سو پچاس ملین فرانک سالانہ بچ رہتے تھے۔ جو بیت المال میں بطور

محفوظ سرمایہ جمع ہوتے تھے۔

عبدالرحمٰن خلیفہ ثالث کے زمانہ میں سالانہ آمدنی تین کروڑ پونڈ تھی۔ دولت اس قدر عام تھی کہ خلیفہ مذکور کو اس کے وزیر نے ایک ادنیٰ سا تحفہ پیش کیا جو ایک زبردست جاگیر جس کے جنگلات میں بیس ہزار سرسبز درخت تھے ..... ساٹھ مہ وش غلام۔ ایک سو عربی النسل گھوڑے اور خچر۔ آٹھ سو زرہ کے سوٹ۔ اور ایک لاکھ ڈالر کی بیش قیمت چیزوں پر مشتمل تھا۔ یہ ادنیٰ تحفہ عرب مورخین کے اندازہ کے مطابق پانچ کروڑ پونڈ کی مالیت کا تھا۔

مالی بحران تو کم و بیش کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ حالانکہ فضول خرچی کی حد تک خرچ کیا جاتا تھا۔ اس وقت افراطِ زر کی بڑی وجہ یہ تھی۔ کہ راعی و رعایا میں بدنیتی۔ بددیانتی اور خود غرضی نہیں تھی۔ محاصل پورے وصول ہوتے تھے۔ محکمے مختصر تھے۔ مگر آج صورت حال اس کے برعکس ہے جس کی وجہ سے بڑی بڑی حکومتیں مالی خسارہ میں پھنسی ہوئی ہیں۔

نزہت گاہیں

چوتھی صدی ہجری میں مسلمانوں میں باغوں اور نہروں کا بھی عام شوق پایا جاتا تھا۔ ان کی وسعت و کثرت کا بقول ابن حوقل یہ حال تھا کہ "صرف بصرہ کے علاقہ کی نہروں وغیرہ کا حال جب میں سنتا تھا۔ تو دل ماننے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا لیکن مشاہدہ کے بعد میں نے جو کچھ پایا۔ اس کو کیسے بیان نہ کروں؟

اس علاقہ میں عبادان سے عبادان تک جس کی کم وبیش ڈیڑھ سو میل کی مسافت ہوگی۔ گھنے اور گنجان نخلستان ہیں۔ ایسے نخلستان کہ انسان اس علاقہ کے جس حصہ سے گزرے وہ اپنے آپ کو کسی نہر یا نخلستان کے کنارے ہی پائیگا۔ ان تمام علاقوں میں تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر آرام گاہیں اور نشست گاہیں مسلسل ملتی جائیں گی حسین اور خوبصورت درمیان میں پرفضا نزہت انگیز میدان ہیں جو طرح طرح کے فواکہ، اثمار اور پھل پھول سے بھرے ہوئے ہیں پھر ان میں بڑے بڑے تالاب ہیں لوگ ان سیرگاہوں میں ٹہلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ کوئی آرہا ہے

کر دی جا رہا ہے۔ بصرہ سے اُبلہ تک بارہ میل کی لمبی نہر ہے جس کے دونوں جانب باغات اور بڑے بڑے محل اس طرح بنے ہوئے اور ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں جیسے ڈوری سے ناپ کر لگائے اور بنائے گئے ہیں۔

بصرہ کے علاقہ میں ایک لاکھ بیس ہزار نہریں جاری تھیں۔ ان میں سے ایک ہزار نہروں کی وسعت اتنی تھی کہ بآسانی ان میں کشتیاں چلتی تھیں اور ان کے کنارے پر واقع درختوں کا یہ حال تھا۔ جیسے سب کے سب ایک دن نصب کیے گئے ہوں۔"

یہی حال سارے عراق بخارا، سمرقند، ماوراءالنہر کا تھا۔ جو اس وقت ریگستان میں تبدیل ہو چکے ہیں۔ اس علاقہ میں نہروں کا جو جال بچھا ہوا تھا۔ انکی کھدائی کے کام کی اہمیت کا اندازہ ایک بہت بڑے جرمن انجینئر کے بیان ہو سکتا ہے جس نے امیر شکیب ارسلان سے بدوران گفتگو کہا تھا کہ "عراق کی جب میں نے سیر کی۔ تو ہارون رشید کے زمانہ کی ایک نہر جو اب برباد شدہ حال میں ہے دیکھ کر متحیر ہو گیا کہ اتنی طویل اور اتنی عمیق نہروں کا بنانا موجودہ زمانہ کی مغربی حکومتوں کے بس کی بھی بات نہیں۔"

ان واقعات سے ذرا ان لوگوں کی اولالعزمیوں کا اندازہ لگائیے کہ جو کام ان کیلئے آسان تھا۔ وہ مشینی ذرائع و وسائل رکھنے والوں کیلئے مشکل بنا یا جاتا ہے۔

تلاشِ معاش

تجارت میں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے نوے فی صدی برکت بتلائی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریباً تمام صحابہ کرام تجارت کیا کرتے تھے تاریخ کی ورق گردانی بتلاتی ہے کہ اکثر علمائے دین۔ اولیائے متقین۔ اور آئمہ مذاہب نے تلاشِ معاش کا ذریعہ تجارت کو ہی بنا رکھا تھا۔ یا صنعت و حرفت کی طرف راغب تھے۔

حضرت سالم بن عبداللہ۔ حضرت سمان بازار میں لین دین کا کام کرتے تھے۔ امام یونس بن عبید۔ داؤد اور امام اعظم کی ریشمی کپڑے کی تجارت تھی۔ امام بن جوزی تانبا فروخت کرتے تھے۔ حافظ حدیث ابن رومیہ عطار کی دکان کرتے تھے۔ ابو یعقوب لکڑی کا کام کرتے تھے۔ محمد بن سلمان کا ذریعہ معاش گھوڑوں کی خرید و فروخت تھی اسماعیل بن ابی خالد احمسی تابعی آٹا پیسنے کی چکی چلا کر روزی پیدا کرتے تھے اور بیس قرنی اونٹ چرا کر اور گٹھلیاں بیچ کر گزارہ کرتے تھے

ابن سیّبؒ روغن زیتون بیچا کرتے تھے۔

بعض بزرگانِ دین حرفت کے ذریعہ روزی کماتے تھے۔ جیسے ابوالفضل مہندس دمشقی مشہور طبیب بڑھئی کا کام کرتے تھے۔ اپنے زمانہ میں ماہر فن مانے جاتے تھے۔ شاہی شفا خانہ کے دروازے انہی کے تیار کردہ تھے۔ اور جامع مسجد دمشق کی گھڑیاں بھی یہی مرمت کیا کرتے تھے جن کی انہیں تنخواہ ملتی تھی۔

ابن طاہر۔ امام ابو سعید نحوی۔ ابن الہشیم طبیب نامور اور امام ابن النحاس اپنے دست و بازو سے روٹی کماتے تھے۔ اور اجرت پر کتابت کرتے تھے۔ حالانکہ امام ابو سعید نحوی عہدِ قضا پر بھی مامور تھے۔ لیکن پھر بھی دس ورق یومیہ لکھا کرتے تھے اور ان کی ہی اُجرت پر قناعت کرتے تھے۔

ابن الہشیم ماہرِ فنِ طب ایک بہت ہی معزز عہدہ پر سرفراز ہونے کے باوجود سال میں صرف تین کتابیں مجسطی۔ متوسطات اور اقلیدس لکھا کرتے تھے جس سے ان کو ڈیڑھ سو اشرفی ملتی تھی۔ اور اسی پر گزارہ کرتے تھے۔

دور نہ جایئے بہت عرصہ نہیں گزرا کہ شہنشاہ ہند اورنگ زیب عالمگیر اپنی روزی کتابت قرآن کرکے کماتے تھے۔ حالانکہ تمام

شاہانِ مغلیہ کی زر و دولت خزانہ میں موجود تھی۔

اس طرح دنیوی کام کرنے سے ان کی عزت، عظمت، رفعت اور وقعت میں کیا کوئی کمی آئی ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ اسی قوتِ عمل نے انہیں آسمانِ شہرت پر چاند اور ستاروں کی طرح چمکایا۔

ہمارے تعلیم یافتہ نوجوان روز بروز بے روزگاروں میں اضافہ کر رہے ہیں لیکن کسبِ حلال کی تلاش میں قوتِ عمل کو کام میں نہیں لاتے۔ بچاروں کے پاؤں میں تپلون کی بیڑیاں اور گلے میں نکٹائی کا پھندا پڑا رہتا ہے جس کی کسب حلال سے بے سہ منتی ہوتی ہے۔ اس لئے بھوکا مرنا منظور کرتے ہیں۔ مگر کوٹ پتلون کی عزت پر حرف نہیں آنے دیتے۔ حالانکہ جن کی پتلون انہوں نے اتار رکھی ہے۔ ان کی قریباً اسی فی صدی آبادی اپنے ملک میں اسی پتلون اور نکٹائی کے ساتھ کارخانوں اور سڑکوں پر مزدوری کرتے نظر آتے ہیں۔

---

(۱۶)

علم و ادب

اک فغانِ بے شرر سینے میں باقی رہ گئی
سوز بھی رخصت ہوا۔ جاتی رہی تاثیر بھی

تعظیمِ علم

خلیفہ ہارون رشید کے حاشیہ نشینوں میں ایک نابینا عالم ابومعاویہ ضریر کیشی تھے۔ ایک روز ہارون رشید نے انہیں اپنے ساتھ کھانا کھلانے کے لئے بٹھا لیا۔

جب یہ کھانا کھا کر فارغ ہوئے۔ تو حسب معمول ان کے ہاتھ دھلائے گئے۔ مگر انہیں یہ علم نہ ہو سکا کہ انکے ہاتھ کس نے دھلائے ہیں۔

ہارون رشید نے ہاتھ دھلانے کے بعد ان سے پوچھا کہ آپ کے ہاتھ کس نے دھلائے ہیں؟

ابومعاویہ نے کہا۔

مجھے کیا خبر۔

اس پر ہارون رشید نے انہیں بتلایا کہ محض تعظیمِ علم کے لئے میں نے خود آپ کے ہاتھ دھلائے ہیں

ہارون رشید کا یہ احساس فضیلتِ علم کا عملی اعتراف تھا۔ مگر آج ایسا کون کرتا ہے۔

مقامِ علم

امام الکبیر یزید بن ابی حبیب قریش کی شاخ بنی عامر بن لوی کے غلام تھے۔ لیکن فیضِ علم سے مصر کے ممتاز حفاظِ حدیث میں شمار ہونے لگے۔ ابن یونس کے بیان کے مطابق

"وہ پہلے شخص تھے جن کی ذات سے مصر میں علم ظاہر ہوا اور حلال و حرام کے مسائل شروع ہو گئے"

بہت محتاط مگر صاف گو واقع ہوئے تھے۔ ایک مرتبہ امیرِ مصر حوثرہ بن سہیل آپ کی بیماری کے دوران میں عیادت کے لئے آئے۔ بادوران گفتگو امیرِ مصر نے آپ سے یہ مسئلہ دریافت کیا۔

"جس کپڑے پر مچھر کا خون لگا ہوا ہو۔ اس کپڑے کے ساتھ نماز پڑھنی کیسی ہے؟"

یہ سوال سن کر انہوں نے امیرِ سلطنت کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اور گفتگو بند کر دی۔ حوثرہ کو ان کی ناراضگی کا احساس ہو گیا۔ فوراً

اُٹھ کھڑا ہوا۔ انہوں نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

"روزانہ خلق اللہ کا خون کرتے ہو۔ اور مجھ سے مچھر کے خون کے متعلق پوچھتے ہو؟"

سوتر بہت خفیف ہوا۔ اور چلا گیا۔

ایک مرتبہ ریان بن عبدالعزیز نے انہیں پیغام بھیجا کہ "آپ میرے پاس آئیں۔ میں آپ سے کچھ معلومات حاصل کرنا چاہتا ہوں۔"

انہوں نے جواب بھیجا۔

"تم خود میرے پاس آؤ۔ میرے پاس تمہارا آنا تمہارے لئے زینت ہے اور میرا تمہارے پاس جانا تمہارے لئے عیب ہے۔"

علم کا مقام شہنشاہی سے بھی بلند و بالا ہے جس کے دربار میں بادشاہوں تک بحیثیت سائل جاتے ہیں اور دھتکارے جاتے ہیں۔

ذوقِ علم

عروہ بن زبیرؓ ان اسلاف کی یادگار تھے۔ جو علم و عمل کے مجمع البحرین تھے۔ ایک مرتبہ یہ اور ان کے باقی تین بھائی عبداللہ، مصعب اور عبدالملک مسجدِ حرام میں بیٹھے ہوئے تھے ان میں سے ایک نے یہ تجویز پیش کی۔ کہ آج خدا کے گھر میں اس کے روبرو ہم سب اپنی اپنی دلی آرزو پیش کریں۔

سب نے اس تجویز کو پسند کیا اور باری باری ہر ایک نے اپنی خواہش پیش کرنی شروع کی۔

عروہ کے بھائی عبداللہ نے کہا۔

"میں تو چاہتا ہوں کہ مجھے حرم کی بادشاہی ملے اور تختِ خلافت پر بیٹھوں۔"

ان کے دوسرے بھائی مصعب بولے۔

"میری خواہش یہ ہے کہ قریش کی دو نوں حسین عورتیں سکینہ

بنت حسین اور عائشہ بنت طلحہ میرے عقد میں آجائیں۔"
ان کے بعد عبدالملک کی باری آئی۔ وہ کہنے لگے کہ
"میری آرزو یہ ہے کہ میں کل روئے زمین کا بادشاہ ہو جاؤں
اور امیر معاویہ کا جانشین بنوں"۔
سب سے آخر میں عروہ نے کہا۔
"مجھے تم لوگوں کی خواہشات سے کچھ نہیں چاہیئے۔ میں تو
دنیا میں علم اور زہد اور آخرت میں کامیابی چاہتا ہوں"۔
وہ کوئی ایسا مبارک اور مقبولیت کا وقت تھا کہ ان چاروں بھائیوں
کی آرزوئیں مولا پاک نے پوری کر دیں۔
عبداللہ بن زبیرؓ حرم کے بادشاہ بنے اور سات سال تک مسندِ
خلافت پر فائز رہے مصعب کی شادی سکینہ اور عائشہ سے ہو گئی عبدالملک
امیر معاویہ کی قائم کردہ سلطنت کے وارث ہوئے جن کی سندھ سے لے کر
اسپین تک حکمرانی رہی۔ اور عروہ آسمانِ علم پر ایک روشن ستارہ کی طرح
چمکے اور خاصانِ خدا کا مرتبہ پایا۔
علم کی بادشاہی دنیوی سلطنتوں کے مقابلہ میں لازوال ہوتی ہے

علم کی عزت

امیر عز الدین موسک بنی ایوب کی حکومت کے زمانہ میں ایک بہت بڑے رئیس تھے۔ ریاست و امارت کے باوجود پرلے درجہ کے فیاض، علم دوست اور بزرگانِ دین کے از حد عقیدت مند تھے۔

فنِ قرأت کے مشہور ترین امام شاطبی حسنِ اتفاق سے ان کے شہر میں تشریف لائے۔ ان کی آمد کی خبر عز الدین کو بھی ہو گئی۔ ان کے دل میں امام موصوف سے شرفِ ملاقات حاصل کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ جس کے لیے انہوں نے امام شاطبی کو اپنے مکان پر تشریف لانے کی دعوت بھیجی۔

شیخ نے اس دعوت کو عزتِ علم کے منافی جانا۔ اس لئے ایک امیر کے در پر جانے سے معذوری ظاہر کرتے ہوئے اس دعوت کا جواب چند اشعار میں بھیجا۔ جن کا مطلب تھا کہ

میری طرف سے امیر کو یہ نصیحت ہے کہ فقیہ کی طرف نظر

التفات نہ فرمائیں۔ کیونکہ فقیہہ جب تمہارے دروازوں پہ
آنے لگے۔ تو سمجھ لو کہ اس میں خیر نہیں۔"

علمائے حق نے ہمیشہ علم کی عزت اور حفاظت کی۔ ان کی خودداری
نے اسے امراء و رؤسا کے درباروں میں ذلیل ہونے سے بچایا اور
اس غرض کے لئے بڑی سے بڑی قربانیاں دینے سے بھی دریغ
نہیں کیا۔ آج اس کی رہی سہی عزت صرف انہی کی قربانیوں کا نتیجہ
ہے۔

طلبِ علم کا طریق

خلیفہ مہدی بن منصور کے شہزادوں کو قاضی القضاۃ شریک پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز شہزادوں کی تعلیم کے اوقات میں حمدان اصفہانی قاضی شریک کو ملنے کے لیئے آئے۔ شہزادے ابھی نہیں آئے تھے اس لئے سلسلہ گفتگو جاری ہو گیا۔

تھوڑی دیر بعد مہدی کا لڑکا آیا۔ استاد کو محو گفتگو دیکھ کر تکیہ لگا کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ حمدان اصفہانی کو شہزادہ کی اس پر غرور حرکت پر بہت تعجب ہوا۔ کیونکہ یہ اندازِ نشست آدابِ استاد کے سراسر منافی تھا۔ شہزادہ نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے استاد سے ایک حدیث دریافت کی۔ انہوں نے اس کے سوال کا کوئی جواب نہ دیا۔ شہزادہ نے دوبارہ اپنا سوال دہرایا۔ مگر قاضی نے کوئی توجہ نہ دی۔

ایک غیر شخص کے سامنے استاد کی اس بے اعتنائی کو شہزادہ نے اپنی توہین تصور کی۔ اس کی جبینِ غرور پر بل آگیا۔ اور قاضی سے کہا۔

"آپ خلفاء کی اولاد سے حقارت سے پیش آتے ہیں۔"

قاضی نے جواب دیا۔

"اہلِ علم کے نزدیک علم کی شہزادوں کی بہ نسبت زیادہ قدر ہے۔"

شہزادہ سمجھ گیا کہ اس سے واقعی غلطی ہوئی ہے اور اس طرح بیٹھنا نہ صرف آدابِ مجلس بلکہ ادبِ استاد کے بھی خلاف تھا۔ اس لئے وہ فوراً دوزانو ہو بیٹھا۔ شریک نے کہا۔

ہاں طلبِ علم کا یہی طریقہ ہے۔

حصولِ علم میں اساتذہ کی تعظیم و تکریم کو بہت دخل حاصل ہوتا ہے مگر آج کل اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی جاتی۔

اعترافِ حقیقت

ابو محمد یزیدی مامون رشید کو پڑھایا کرتے تھے۔ ایک روز حسب معمول وقت مقررہ پر آئے۔ مگر مامون ابھی زنانخانہ میں تھا۔

استاد نے خادم کی معرفت مامون کو بلا بھیجا۔ اور شکایت کی کہ یہ اپنا وقت بہت ضائع کرتا ہے۔ مامون کو آنے میں دیر لگی۔ استاد نے پڑھنے کے لئے دوبارہ خادم بھیجا۔

خادموں نے موقعہ پاکر استاد کو مامون کی شکایت کردی کہ آپ کے چلے جانے کے بعد یہ بہت شرارتیں کرتا ہے۔ اور ہم لوگوں کو مارتا پیٹتا رہتا ہے۔ آپ اسے تنبیہ کریں۔

ابھی یہ سلسلہ گفتگو جاری تھا کہ مامون آگیا۔ استاد نے اسے سات بید مارے۔ مامون رونے لگا۔ کہ اوپر سے وزیر مملکت جعفر بن یحییٰ برمکی کے آنے کی خادم نے اطلاع دی۔ مامون فوراً آنسو پونچھ کر فرش پر جا بیٹھا۔ جعفر حاضر ہوا۔ اور استاد اُٹھ کر باہر چلا گیا۔

جعفر بن یحییٰ کے چلے جانے کے بعد جب استاد واپس آیا۔
تو اس نے مامون سے پوچھا۔
"تم نے کہیں میری شکایت تو نہیں کی؟"
مامون نے سعادتمندانہ لہجہ میں جواب دیا۔
"اے ابا محمد۔ میں ہرون رشید سے کبھی نہیں کہہ سکتا چہ جائیکہ
میں جعفر سے کہتا۔ کیونکہ پڑھنے میں میرا ہی فائدہ ہے۔"
یہ اسی احساس کا نتیجہ تھا کہ مامون رشید خاندان بنو عباس میں سب سے
زیادہ عالم فصیح۔ بلیغ اور قادر الکلام نکلا۔
ہمارے نوجوانوں میں ایسا احساس بہت ہی کم پایا جاتا ہے۔

اہتمامِ تعلیمِ دین

ہارون رشید کے زمانہ میں فنِ حدیث کے امام مالک بن انس تھے ان کے حلقہء درس میں امام شافعی ایسے ائمہِ فن داخل تھے خود ہارون رشید نے ان سے علم حدیث کی مشہور کتاب موطا پڑھی تھی۔ ہارون رشید چاہتا تھا کہ اپنے شہزادوں مامون و امین کو بھی ان سے تعلیم دلوائے۔

ہارون رشید نے امام مالک سے درخواست کی کہ

"آپ حریم خلافت میں تشریف لاکر شہزادوں کو علم حدیث پڑھائیں"

امام مالک نے کہلا بھیجا۔

"لوگ علم کے پاس خود چل کر آتے ہیں علم لوگوں کے پاس چل کر نہیں جاتا۔ اور جب یہ علم آپ کے ہی گھرانے سے نکلا ہے اگر آپ اس کی عزت نہ کرینگے۔ تو وہ کیوں کر عزت پا سکتا ہے،"

ہارون رشید اس تجزیہ کا قائل ہو گیا۔ اور شہزادوں کو حکم دیا کہ وہ امام موصوف کی عام درسگاہ میں جا کر تعلیم حاصل کریں۔

ہارون رشید اپنے شہزادوں کو تعلیم دلوانے کا بہت شائق تھا۔ جب فقہ و حدیث کے مرکز کوفہ میں گیا۔ تو وہاں بھی اس نے تمام محدثین کو طلب کیا۔ تاکہ ان میں سے انتخاب کر کے شہزادوں کو ان سے بھی تعلیم دین دلوائے۔

اس کی طلبی پر اور تو سب ارباب فن حاضر ہوئے۔ مگر امام مالک کی طرح عبداللہ بن ادریس اور یحییٰ بن یونس علم حدیث کی عزت کو برقرار رکھتے ہوئے حاضر نہ ہوئے۔ ہارون رشید نے ان دو کو ہی شہزادوں کی تعلیم کے لئے منتخب کیا۔

تعلیم دین کی اہمیت جاننے والے شہنشاہوں نے شاہی وقار کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے شہزادوں کو تعلیم دین کیلئے عام درسگاہوں میں بھیجنے سے گریز نہ کیا۔ مگر ہمارے ارباب ثروت اپنی اولاد کو تعلیم دین دلانا عار اور تضیع اوقات سمجھتے ہیں۔

امیر بخارا اور امام بخاریؒ

امام بخاری رحمتہ اللہ علیہ جب علوم و فنون حاصل کرنے کے بعد صحیح بخاری شریف مرتب کر کے اپنے وطن واپس لوٹے تو اہل شہر نے اُن کا بڑی دھوم دھام سے استقبال کیا۔ ان پر ہزاروں درہم و دینار نچھاور کیے گئے اور ہر طرح کی خوشیاں منائی گئیں۔

اب ان کے پاس ہر وقت لوگوں کا تانتا بندھا رہتا اور ان کے فیضِ علم کا ہر طرف چرچا ہونے لگا۔

جاہ طلب اور دین فروش حلقہ میں امام بخاری کی اس مقبولیت سے سراسیمگی سی پھیلنے لگی۔ اور ان کا اثر و رسوخ کم ہونے لگا۔ انہوں نے امیرِ بخارا خالد بن احمد الذہلی سے شکایت کی۔ کہ امام بخاری کی بڑھتی ہوئی عظمت اور مقبولیت آپ کے اقتدار کیلئے خطرناک ثابت ہوگی۔ وہ اپنے حاشیہ نشینوں کے چکمہ میں آگیا۔ اور امام بخاری کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ

"آپ اپنی کتاب جامع صحیح (بخاری شریف) اور تاریخ مجھے آکر سنا جایا کریں۔

امام بخاری نے امیر سے کہلا بھیجا۔

"میں علم دین کو ذلیل نہیں کر سکتا کہ اسے سلاطین اور امراء کے دروازوں پر لئے پھروں۔ اگر امیر کو علم حدیث کی ضرورت اور خواہش ہے تو وہ میرے غریب خانہ پر یا مسجد میں آکر عام لوگوں کے ساتھ پڑھا کرے یا سنا کرے۔"

امام بخاری کے اس سیدھے بے باکانہ جواب سے امیر آگ بگولا ہو گیا امام صاحب کی فوری جلا وطنی کا حکم دے کر ان پر کتے چھوڑ دیئے جس پر امام صاحب سمرقند چلے گئے۔ جہاں سنہ ۲۵۶ھ ہجری میں وفات پائی۔

جو علم کی قدر کرتا ہے علم اسے بھی ہمیشہ کے لئے زندہ رکھتا ہے۔

اُستاد کا ادب

اگلے وقتوں میں اساتذہ کا ادب و احترام بادشاہوں سے بھی زیادہ کیا جاتا تھا۔ بلکہ شاہانِ وقت اپنے اساتذہ کرام کے ادب و احترام میں اپنے وقار و جلال کی پروا نہیں کرتے تھے۔

کوفہ کے مشہور امام اور استادِ وقت جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادمِ خاص حضرت انسؓ سے حدیث سننے اور بڑے بڑے تابعین کے فیضِ صحبت سے مستفید ہونے کا شرف حاصل تھا امام ابوحنیفہؒ کے استاد تھے۔ دو برس تک حمّاد کے حلقۂ درس میں حاضر رہنے کے بعد انہیں خود درس و تعلیم کا سلسلہ قائم کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ مگر استاد کے ادب کے خیال سے انہوں نے یہ خیال ترک کر دیا۔ وہ استاد کی حد سے زیادہ تعظیم کرتے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے، کہ۔

"میرے استاد حماد جب تک زندہ رہے میں نے انکے

مکان کی طرف کبھی پاؤں نہیں پھیلائے۔"

حماد نے سنہ ۱۲۰ھ میں وفات پائی۔ اس آفتابِ علم کے غروب ہوتے ہی کوفہ میں اندھیرا چھا گیا۔ ان کے شاگرد موسیٰ ابن کثیر کو مسندِ درس پر بٹھایا گیا۔ کچھ عرصہ بعد وہ حج کو تشریف لے گئے اور پھر یہ مسندِ علم خالی ہو گئی۔ لوگوں نے امام ابو حنیفہؒ سے درخواست کی کہ وہ خود اسے زینت بخشیں۔ جوانی کی درس تدریس کی خواہش پورا کرنے کا اب بہترین وقت تھا۔ مگر آپ نے استاد کے ادب و احترام کی وجہ سے مسندِ اُستاد پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔ بالآخر عوام و خواص کے اصرار پر بامر مجبوری اس پر بیٹھے۔

امامِ اعظم کے ادب کے بعد خلیفۂ وقت کے احترام کا اندازہ لگائیے۔

خلیفہ واثق باللہ ایک روز دربار میں بیٹھے تھے۔ ہارون بن زیاد ان کو ملنے کے لئے آئے۔ خلیفہ نے انہیں نہایت عزت و احترام سے اپنے پاس بٹھایا۔ اور سعادت مندانہ انداز میں ان سے گفتگو کرتا رہا۔ اور بعد ملاقات بڑی تعظیم و تکریم سے انہیں رخصت کیا۔ امیرِ سلطنت کی طرف سے اس اعزاز و اکرام کے مظاہرہ سے اہل دربار بہت متعجب ہوئے۔ ایک درباری سے نہ رہا گیا

اس نے خلیفہ سے پوچھا۔

"یا امیر المومنین! یہ کون شخص تھے۔ جن کی آپ نے اس قدر تعظیم کی؟"

خلیفہ نے جواب دیا۔

"یہ میرے اُستاد ہیں جنہوں نے سب سے پہلے میری زبان ذکرِ خدا سے کھولی۔ اور مجھے اللہ تعالیٰ کی رحمت کے نزدیک کر دیا۔"

امام وقت اور خلیفہ وقت کی طرف سے اساتذہ کرام کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے اس مہذب دور کے طلبا کا اپنے استادوں اور پروفیسروں سے سلوک بھی پیش نظر رکھیں جو انکا مذاق اور تمسخر اڑانا داخل فرائض شاگردی سمجھ کر اس پر فخر محسوس کرتے ہیں جو والدین کی عزت کرنے کے عادی نہ ہوں۔ ان سے استادوں کے ادب کی توقع عبث ہے۔

---

(۱۷)

عدل و مساوات

سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تم سے کام دنیا کی امامت کا

عدل کی ابتدا

قاضی یحییٰ مامون رشید کے بے تکلف دوستوں میں سے تھے اور اکثر مامون رشید کے کمرہ میں شب باش ہوا کرتے تھے۔

ایک رات قاضی یحییٰ مامون رشید کے کمرہ میں سوئے ہوئے تھے۔ ابھی ان کی پوری طرح آنکھ نہ لگی تھی کہ مامون رشید کو کھانسی شروع ہو گئی۔ اس نے کھانسی روکنے کے لئے اپنی قمیض کی آستین سے منہ بند کر لیا۔ تاکہ ان کے دوست کے آرام میں خلل نہ پڑے اور نیند نہ کھل جائے اس سلسلہ میں بعد کو فرمانے لگے کہ عدل کی ابتدا یہ ہے کہ اول اپنے دلی دوست سے عدل کرے۔ پھر اس سے کم درجہ والوں سے حتیٰ کہ ادنیٰ شخص سے بھی عدل کرنے لگے۔

اگلے وقتوں میں مسلمانوں کی یہ اولین کوشش ہوتی تھی۔ کہ ان سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے۔ اب تو اکثر مسلمان مسلمانوں کے ہی درپئے آزار رہتے ہیں۔

مساواتِ عدل

حضرت عمر فاروقؓ کے زمانہ کے آخری عیسائی تاجدار جبلہ الایہم مشرف باسلام ہونے کے بعد حضرت عمرؓ کے ہمراہ حج کرنے چلا گیا۔ طواف کے دوران میں شانِ امارت کی وجہ سے اُس کا تہبند زمین پہ گھسٹتا جاتا تھا۔ کہ ایک غریب بدوی کا بدقسمتی سے اس پہ پاؤں آگیا جس سے تہبند کھل گیا۔

اس نو مسلم تاجدار نے آؤ دیکھا نہ تاؤ غصہ سے لال پیلا ہو کر اس بدوی کو اس زور سے طمانچہ مارا کہ اس غریب کی ناک ٹیڑھی ہو گئی۔ جس پہ اس تاجدار پہ مقدمہ قائم کر دیا گیا۔

خلیفہِ وقت حضرت عمرؓ نے بدوران سماعت جبلہ سے کہا۔

"بہتر ہے تم اس بدوی کو راضی کر لو یا پھر قصاص دینے کے لئے تیار ہو جاؤ۔"

جبلہ نے جو بڑی شان و شوکت سے مسلمان ہوا تھا جب ایک ادھر

اور تاجدار کی حیثیت سے ایک بدوی کے مقابلہ میں بطور ملزم کھڑے ہوئے یہ حکم سنا۔ تو بہت ہی غیظ و غضب میں آیا۔ اور کہا کہ

"ایک معمولی شخص کے مقابلہ میں ایک بادشاہ کے ساتھ یہ سلوک؟"

خلیفہ اسلام نے جواب دیا۔

"اسلام کے قانونِ عدل نے تم کو اور اس معمولی آدمی کو برابر کر دیا ہے۔ عدل کے وقت رعایا اور بادشاہ مساوی ہیں۔ اسلام کے قانون میں فضیلت اگر کسی کو کسی پر ہے تو صرف نیک اعمال اور اچھے اخلاق ہی کی وجہ سے ہے۔"

مگر آج عدل و انصاف کو ہر چیز سے بالا تر نہیں سمجھا جاتا۔ بلکہ حکام کے تحفظ کے لئے خاص قوانین مروج ہیں۔ تاکہ انہیں اپنی غلط کاریوں کی جوابدہی کے لئے عدالتوں کا منہ نہ دیکھنا پڑے۔

خلیفہ کی مخالفت

سوار بن عبداللہ قاضی بصرہ کی عدالت میں ایک زمین کے متعلق

سائیس اور سوداگر کا مقدمہ چل رہا تھا۔

خلیفہ منصور نے قاضی بصرہ کو لکھا۔ کہ

"سائیس اور سوداگر کے مقدمہ میں آپ سائیس کے حق

میں فیصلہ کرنا"

سوار بن عبداللہ نے خلیفہ کو اطلاع دی کہ

"میرے پاس جو گواہ گزرے ہیں۔ ان سے تاجر کے

دعویٰ کی تائید ہوتی ہے۔ اس لئے میں شہادت کے خلاف

کیسے فیصلہ کر سکتا ہوں"

منصور نے دوبارہ تاکیداً لکھا۔ کہ

"واللہ تمہیں سائیس کے حق میں ہی فیصلہ کرنا ہوگا"

قاضی نے جواب بھیجا۔ کہ

"خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جائے۔ میں سوداگر کے ہی حق میں فیصلہ دوں گا۔"

خلیفۂ وقت کے پاس جب قاضیٔ بصرہ کا یہ آخری جواب پہنچا۔ تو اس نے کہا۔

واللہ۔ میں نے زمین کو عدل سے بھر دیا۔ خود میرے ہی قاضی عدالت میں میری مخالفت کرتے ہیں۔

مگر اس دور میں اکثر حکام وقت کے ہی اشارہ چشم و آبرو پہ چلتے ہیں۔ اور اگر کوئی جرأت سے کام لیتا ہے۔ تو اسے گھر بٹھا دیا جاتا ہے۔

شیخ اور انصاف

ایک دفعہ قاضی شریح کی ملاقات کے لئے اُس وقت کے بہت
بڑے عالم اشعث بن قیس آئے۔

قاضی مسندِ عدالت پر رونق افروز تھے۔ انہوں نے

ہمارے شیخ اور سردار خوش آمدید

کہہ کر ان کو اپنے پاس بٹھا لیا۔ اشعث کو بیٹھے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی
تھی کہ ایک غیر معروف شخص نے قاضی کی عدالت میں اشعث کے خلاف
ایک دعویٰ دائر کر دیا۔ اور دادرسی کا خواہاں ہوا۔

استغاثہ کو دیکھتے ہی قاضی نے اپنے شیخ اور سردار سے فوراً
رخ بدل لیا۔ تیور چڑھا لئے اور شیخ اشعث کو حکم دیا۔

"یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ اور وہاں بیٹھو۔ جہاں آپ کا مقابل
ہے اور اس کی بات کا جواب دو۔"

اشعث قاضی کے اس حکم پر حیران ہوئے اور قاضی سے بولے

کی۔

"میں سائل کے سوال کا جواب یہیں سے دے دونگا۔"

قاضی نے اشعث کے اس جواب کو وقارِ عدالت کے منافی تصور کرتے ہوئے باوازِ بلند کہا۔

"تم فوراً کھڑے ہو جاؤ۔ ورنہ میں کسی کو حکم دونگا کہ تمہیں یہاں سے پکڑ کر اٹھا دے۔"

شیخ اشعث قاضی کے پُرعتاب حکم کی تاب نہ لا کر فوراً ملزم کے کٹہرے میں آکر کھڑے ہو گئے۔ اور اس مقدمہ کی جواب دہی کی۔

منصف و عادل حاکم کو انصاف کرنے سے بڑے سے بڑا تعلق اور رشتہ بھی باز نہیں رکھ سکتا۔

امیرِ سلطنت پر ڈگری

بنو عباس کے خلیفہ مہدی کے ایک مختار نے مسور بن مساور کی کچھ اراضی پر ناجائز قبضہ کر لیا تھا۔ مسور نے اس کی نسبت دربار میں دعویٰ دائر کر دیا۔

مہدی اپنے چچا عباس بن محمد اور قاضی القضاۃ عافیہ کے ساتھ بیٹھا۔ لوگوں کی درخواستیں سن رہا تھا کہ یہ درخواست بھی پیش ہوئی۔

مہدی اس میں چونکہ خود فریق مقدمہ تھا۔ اس لئے اس نے مدعی کو بلا کر کہا۔

"اگر تمہارے پاس اپنے دعویٰ کی تائید میں کوئی دلیل ہے تو وہ ان دونوں کے سامنے پیش کرو۔ یہ جو فیصلہ دیں وہ میرے لئے قابل قبول ہوگا۔"

مسور نے قاضی عافیہ سے عرض کی کہ

امیر المومنین نے میری فلاں زمین پر جبراً قبضہ کر دیا ہے۔"

قاضی نے مہدی سے کہا کہ
"آپ اپنی صفائی پیش کریں"۔ خلیفہ نے جواب دیا۔
"میں کیا صفائی پیش کروں!"
اس پر قاضی نے خلیفہ سے سوال کیا کہ
"اس زمین پر آپ کا قبضہ خلافت سے پہلے کا ہے یا بعد کا؟"
مہدی نے جواب دیا۔
"خلافت کے بعد کا"
قاضی عافیہ نے امیر سلطنت کی بغل میں بیٹھے بیٹھے وہ خلیفۂ وقت کے خلاف ڈگری صادر کردی جس کی بنا پر اسے زمین چھوڑنی پڑی۔
سلطنت کا وقار محکمہ عدلیہ کی آزادی سے ہی قائم رہ سکتا ہے جہاں عدلیہ آزاد ہو۔ وہاں غریب کی حق رسی کے امکان زیادہ ہوتے ہیں۔ ورنہ نہیں۔

خلیفہ کا دعویٰ خارج

محکمہ قضا، خلیفہ معتضد باللہ نے پہلے اپنے پاس رکھا ہُوا تھا۔ بعد میں خود کو اس کی ذمہ داریوں کا اہل نہ سمجھ کر قضیات کا بار ابوحازم پر ڈال دیا۔ خلیفہ نے ایک شخص سے کچھ رقم لینی تھی۔ اس مقروض سے بعض دوسرے لوگوں نے بھی اپنا اپنا قرض وصول کرنا تھا۔ انہوں نے قاضی ابوحازم کی عدالت میں اس کے خلاف دعوے کر کے ڈگریاں حاصل کر لیں اور قاضی نے ان کو وصولی کرا دی۔

خلیفہ کو جب یہ حال معلوم ہُوا تو اس نے قاضی کو کہلا بھیجا۔ کہ "مجھے اس کے خلاف مدعی سمجھ کر اس سے میرا مال واپس کرا دو۔"

قاضی نے جواب بھیجا۔

"امیرالمومنین میں گواہوں کے بغیر کسی دعوے کو کیسے تسلیم کروں۔ آپ اپنے دعوے کی تائید میں کوئی گواہ پیش کریں۔"

معتقد نے اس کے جواب میں لکھا کہ

"اس امر کے متعلق میرے فلاں فلاں دو معزز گواہ ہیں"

قاضی نے جواب لکھا۔

"یہ دونوں شخص آپ کے نزدیک معزز ہو سکتے ہیں مگر یہ جب تک میرے روبرو پیش نہ ہوں اور میں ان پر جرح و قدح کر کے یہ نہ دیکھ لوں کہ وہ شرعی لحاظ سے بھی قابل گواہی و قابل اعتبار ہیں یا نہیں۔ میں آپ کا دعویٰ کیسے صحیح تسلیم کر لوں۔ ان کی عدالت میں شہادت کے بعد جو کچھ ثابت ہوگا۔ اسی کے مطابق فیصلہ کروں گا"

گواہوں نے ان حالات میں قاضی کے سامنے آنے سے انکار کر دیا۔ اور قاضی نے امیر المومنین کا دعویٰ خارج کر دیا۔

عادل حاکم کے سامنے خلیفہ وقت کی حیثیت بدوران مقدمہ ایک عام شخص سے زیادہ نہیں ہوتی۔

خلیفہ کا انصاف

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بعد ساتویں صدی ہجری میں خلیفہ الظاہر بامر اللہ ہی ایک ایسے خلیفہ گزرے ہیں جنہوں نے بقول ابن اثیر حضرت ابوبکر و حضرت عمر رضی اللہ عنہم کی روایاتِ عدل و انصاف کو زندہ کیا۔ آپ کا عہدِ خلافت سال سے بھی کم تھا مگر اس عرصہ میں انہوں نے لوگوں کا وہ تمام مال و املاک جو ان کے باپ دادا نے ضبط کیا تھا۔ یا خرچ کیا تھا مستحقین کو واپس کر دیا۔ ان کے لگائے ہوئے اضافی ٹیکس منسوخ کر کے سابقہ ٹیکس بحال رکھے۔

اس کے زمانہ میں خزانہ کے ترازو میں نصف قیراط کے برابر کان تھی۔ افسر خزانہ کا عملہ لیتے وقت ہلکے پڑے سے تول لیتا۔ اور دیتے وقت بھاری پلڑے میں تول کر دیتا تھا۔

اس واقعہ کی اطلاع جب خلیفہ کو پہنچی۔ تو الظاہر بامر اللہ نے

وزیر کو ایک تنبیہ آمیز خط لکھا۔ جس کی ابتدا ان آیاتِ قرآنی سے کی۔ جو کم تولنے کے متعلق وارد ہوئی تھیں۔ اور حکم دیا کہ

"بعد تحقیقات عائل خزانہ کو ہدایت کی جاوے کہ ان سب لوگوں کو بلا کر کمی پوری کر دے جن کو کم وزن دیا گیا ہے"۔

وزیر نے بعد تحقیقات رپورٹ بھیجی۔ کہ

"واقعی یہ خرابی ایک عرصہ سے چلی آ رہی ہے اور اگر لوگوں کی یہ کمی پوری کر دی گئی تو اس طرح سے پینتیس ۳۵ ہزار دینار واپس کرنے پڑینگے"۔

غالباً وزیر کا خیال یہ تھا کہ اتنی کثیر رقم سُن کر خلیفہ اپنے ارادہ سے باز آجائیگا۔ مگر خلیفہ نے لکھا۔

"پینتیس ہزار کیا اگر پینتیس کروڑ دینار بھی واپس دینا پڑیں تو تامل نہ کریں"۔

جسے آخرت کے حساب کی فکر ہوتی ہے۔ وہ دنیا میں ہی حساب بیباق کر جاتا ہے۔

انصاف میں مداخلت

قاضی شرف الدین محمد عبداللہ (جو ابن عین الدولہ کے نام سے بھی مشہور ہیں) کی عدالت میں ایک ایسا مقدمہ پیش ہوا جس میں سلطانِ وقت کی گواہی تھی۔

قاضی نے بادشاہ کے نام بہ نفسِ نفیس حاضرِ عدالت ہو کر گواہی دینے کا حکم نامہ جاری کیا جس پر مجبوراً اسے حاضرِ عدالت ہونا پڑا۔ قاضی نے انہیں دیکھتے ہی کہا۔

"بادشاہ حکمران ہوتے ہیں۔ گواہی نہیں دیتے۔"

بادشاہ اس فقرہ سے سمجھ گیا کہ میری شہادت اس عدالت میں کوئی وقعت حاصل نہ کر سکے گی۔ اس لئے گرما کر قاضی سے کہا۔

"میں گواہی دوں گا۔ تم اسے قبول کرو یا نہ۔"

قاضی نے سلطان کی گواہی لینے کے بعد اسے ناقابلِ اعتبار قرار دے کر مسترد کر دیا۔ اس سے وقارِ شاہی کو بہت ٹھیس لگی۔ بادشاہ نے

اپنی گواہی کے مسترد ہونے کی وجہ پوچھی تو قاضی نے کہا۔
"آپ خود انصاف کریں کہ میں آپ کی گواہی کیسے قبول کروں جبکہ آپ ایک مغنیہ پر عاشق ہیں۔ وہ رات کو آپ کے پاس آتی ہے اور دن میں آپ بیبا کانہ اس کے ہاں چلے جاتے ہیں۔ جہاں نشہ کے عالم میں اس کی پیش کردہ باندیوں سے متمتع ہوتے ہیں"۔
بادشاہ سے یہ صاف گوئی برداشت نہ ہوسکی اس نے قاضی کو کچھ سخت سست الفاظ کہے۔ قاضی نے یہیں وجہ استعفا دیدیا کہ "حکمرانوں کی مداخلت سے انصاف نہیں ہوسکتا"۔
کچھ دنوں کے بعد بادشاہ نے اپنے درباریوں کے مشورہ پر اپنی غلطی کا احساس کیا۔ اور خود بہ نفسِ نفیس قاضی کے مکان پر گیا۔ اور انہیں راضی کرکے مسندِ عدالت پر بٹھایا۔
یہاں بھی یہی مصیبت ہے کہ محکمہ عدلیہ محکمہ انتظامیہ کے ماتحت ہے جس کی وجہ سے بعض اوقات انتظامی مصالح کی بنا پر عدالتی کارروائی میں مداخلت کرکے انصاف کا خون کیا جاتا ہے

ظالم مومن اور عادل کافر

۶۵۶ھ میں ہلاکو خان نے بغداد فتح کیا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ مسلمان اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے انتہائی ذلت و پستی کی حالت کو پہنچ چکے تھے۔ اور خدا کی زمین پر بار ہو رہے تھے۔ ہلاکو خان نے فتح حاصل کرنے کے بعد حکم دیا۔ کہ علماء سے اس امر کی نسبت فتویٰ لیا جاوے کہ

کافر عادل بادشاہ افضل ہے یا مومن مگر ظالم؟

اس استفتار نے علماء کو ایک عجیب مشکل میں ڈال دیا۔ کیونکہ وہ بھی اُسی زمانہ و حالات سے تعلق رکھتے تھے۔ جن کو قدرت کی طرف سے بدلنے کا سامان کیا گیا تھا۔

اس فتویٰ کا جواب دینے کے لئے تمام علماء مدرسہ مستنصریہ میں جمع ہوئے۔ کافی غور و خوض ہوا۔ مگر جواب لکھنے کی کسی کو ہمت نہ ہوئی۔

حسنِ اتفاق سے اس مجلس میں رضی الدین علی بن طاؤس بھی موجود تھے۔ جو اس وقت کے طبقۂ علماء میں بہت ہی معزز و محترم تھے انہوں نے جب علماء کی یہ جھجک دیکھی۔ تو فتویٰ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور اس پر یہ لکھ کر رکھ دیا۔ کہ

"مسلمان ظالم سے کافر عادل بادشاہ افضل ہے۔"

گو بظاہر یہ فتویٰ اپنے خلاف دیا گیا۔ مگر یہ منشاءِ قرآن کے عین مطابق تھا۔ جو دنیا سے ظلم و فساد کو مٹانے اور امن و انصاف قائم کرنے کی تعلیم دینے کے لئے نازل ہوا۔ اس غرض کے لئے شرط مسلمان کی نہیں بلکہ یہی کام بارہا قدرت نے غیر مسلموں سے بھی لیا۔

امام ابن تیمیہ اپنی کتاب الحسبۃ فی الاسلام میں لکھتے ہیں:

"روایت کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ عادل سلطان کی مدد فرماتا ہے۔ اگرچہ وہ کافر ہو۔ ظالم مسلمان کی مدد نہیں فرماتا اگرچہ وہ مومن ہو۔"

وقار اور عدل

امیر المومنین الحکم کے چچا سعید الخیر کا ایک مقدمہ قاضی ابن بشیر کی عدالت میں زیر سماعت تھا۔ اس میں سعید الخیر کے وکیل نے ایک دستاویز پیش کی جس کے صرف دو گواہ حاشیہ زندہ تھے۔

ایک گواہ کوئی معمولی شخص تھا۔ اس کی گواہی لینے کے بعد قاضی نے دوسرے گواہ کو پیش کرنے کا حکم دیا۔ جو خود امیر المومنین الحکم تھے۔ سعید الخیر نے شاہی رعب سے قاضی سے کہا۔

"بادشاہِ وقت کی شہادت اس پر ثبت ہے۔ انہیں طلب نہ کیا جائے۔"

مگر قاضی نے یہ اعتراض مسترد کر دیا۔ اس سے سعید الخیر کی نخوت کو بہت ٹھیس لگی۔ اور سیدھا الحکم کے دربار میں پہنچا۔ اور کہا۔

"یہ قاضی مسندِ عدالت کے قابل نہیں۔ اس نے شاہِ وقت کی تحریر کی کوئی عزت نہیں کی۔ بلکہ آپ کی طلبی کے احکام

صادر کر دیتے ہیں۔"

الحکم نے کہا۔

"ہمارا کام گواہیاں دینا نہیں۔ آپ فریق مخالف سے فیصلہ کر لیں۔ اگر کوئی نقصان ہوا تو میں ادا کر دونگا۔"

سعید الخیر نہ مانا۔ اس کے اصرار پر الحکم نے اپنی گواہی ایک کاغذ پر تحریر کر کے شہادت کے دو شاہد جو عالم فاضل تھے۔ قاضی کے پاس بھیج دیئے۔ قاضی نے وہ شہادت لے لی اور شاہدوں کے بیان سن کر ان کو رخصت کر دیا۔

سعید الخیر نے قاضی سے کہا۔

"اب تو خود امیر المومنین کی شہادت ہو گئی ہے۔ لہٰذا آپ فیصلہ دیں۔"

قاضی نے فرمایا۔

"یہ شہادت ناکافی ہے۔ کوئی عادل گواہ پیش کرو۔"

یہ سنتے ہی سعید الخیر آپے سے باہر ہو گیا۔ اور سیدھا امیر المومنین کے پاس پہنچا۔ وہ سمجھ گئے کہ قاضی نے بوجہ رشتہ داری میری شہادت مسترد کر دی ہوگی۔ پوچھا کہ پھر کیا بات ہوئی؟

سعید الخیر نے کہا "آج سلطنت کا وقار ختم ہو گیا۔ شاہی خاندان

کی عزت خاک میں مل گئی۔ کیونکہ قاضی نے بادشاہ کی شہادت قبول نہیں کی۔"

غرضیکہ سعید الخیر نے بادشاہ کے جذبات کو خوب مشتعل کر کے اپنا کام نکلوانے کی کوشش کی۔ مگر الحکم نے کہا۔

"قاضی کا فیصلہ فی الواقعہ دیانت پر مبنی ہے۔ جو حق کے مقابلہ میں شاہِ وقت کی پرواہ نہیں کرتے ان کے فیصلے کتنے سچے اور صحیح ہوتے ہوں گے۔ خدا کی قسم میں اس سے بازپرس کرنے کو تیار نہیں۔"

الحکم نے ثابت کر دیا کہ عدل کے مقابلہ میں سلطنت اور اس کا وقار کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

(۱۸)

صبر و ثبات

پھر وہ شرابِ کہن مجھ کو عطا کر کہ میں
ڈھونڈ رہا ہوں اسے توڑ کے جام و سبو

حیرت انگیز استقامت

ایک مرتبہ موت کی آندھی کچھ ایسی چلی کہ اس نے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے محبوب ترین لڑکے عبدالملک، عزیز ترین بھائی سہل اور بہترین غلام مزاحم کو چند ہی دنوں میں ان سے جدا کرکے دوسری دنیا میں پہنچا دیا۔

ان شدید ترین صدمات کے باوجود انہوں نے سررشتۂ صبر و سکون ہاتھ سے نہیں چھوٹنے دیا۔ عین اس وقت جبکہ وہ اپنے عزیز ترین فرزند کو دفن کر رہے تھے۔ ایک شخص بائیں ہاتھ سے اشارہ کرکے خلیفۂ وقت سے اظہارِ تعزیت کرنے لگا۔ انہوں نے فوراً کہا کہ گفتگو میں بائیں ہاتھ سے اشارہ نہ کرو۔ داہنے ہاتھ سے کرو۔ سب لوگ اس استقامت سے بہت متاثر ہوئے کہ ایسے وقت میں بھی انہیں دائیں بائیں کا خیال ہے۔

اس طرح انہوں نے دنیا کو عملاً بتلا دیا کہ ایسے حالات میں بھی اصلاح و تربیت کے فرض کو نہیں بھولنا چاہیئے۔

شہادت کی مسرت

آرمینیہ کی جنگ کے اختتام پر مسلمان آرام کر رہے تھے کہ ملکہ نے بدعہدی کر کے اچانک ان پر حملہ کر دیا۔ عیاض بن غنمؓ نے خبر ملتے ہی ان کی امداد کے لیے مجاہدین دوڑائے۔ وہ آندھی کی طرح خالد بن ولید کی امداد کو پہنچے۔ اور دشمن کو بدعہدی کا قرار واقعی مزا چکھا کر ٹھنڈا کر دیا۔ لڑائی ختم ہونے پر حضرت معاذ بن جبلؓ کا لڑکا واپس نہ آیا۔ انہوں نے اسکی تلاش شروع کر دی اور معمعہ کے مقام پر اسے اس حالت میں پایا کہ بدن چھلنی ہو چکا تھا۔ اور دم توڑ رہا تھا۔ مسلمان اسے اٹھا کر خیمہ میں لائے۔

اسے دم توڑتے دیکھ کر عبدالرحمٰن بن غنم کی چیخ نکل گئی۔ اور آبدیدہ ہو گئے۔ اس باہمت نوجوان نے اپنے آخری لمحوں میں جن کی دید دوسرے کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ کہا۔

خاموش رہیئے۔ یہ غزوہ مجھے ان غزوات سے بھی زیادہ محبوب

ہے جو میں نے رسول اللہ کے ہمراہ لڑے۔

باپ اتنا ہی کہنے پائے تھے کہ بیٹا اب تم جلدی اپنے رب سے ملنے والے ہو کہ موذن نے ظہر کی اذان شروع کی اللہ کا نام سنتے ہی انکی روح پرواز کر گئی۔ نماز سے فارغ ہو کر باپ نے اپنے بیٹے کو اسی خون آلود لباس میں کفنا کر دفنا دیا۔ دوسرے لوگوں نے نماز سے فارغ ہونے کے بعد شکوہ کیا کہ آپ نے جنازہ کیلئے ہمارا انتظار نہ کی۔ فرمایا یہ عہدِ جاہلیت کی رسم ہے۔ جنازہ کیلئے دوسروں کی انتظار کرنا سنت نہیں۔

نوجوان بیٹے کو دفنانے کے بعد ہاتھ منہ اور سر دھو کر سرمہ لگایا۔ اور فرمایا۔ "بیٹا تمہیں یہ شہادت مبارک ہو"۔

مسکراتے ہوئے حضرت عیاشؓ کے خیمہ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے ایسے موقعہ پہ وجہ مسرت پوچھی تو فرمایا۔

"میں نے رسول اللہ سے سنا ہے کہ جس کا لڑکا مرجائے اور اس کا باپ اس لڑکے کے ساتھ بہت حریص ہو اور اسکو نہایت عزیز رکھتا ہو۔ تو ایسی صورت میں اس کا غزوہ سب سے بہتر غزوہ ہے اور اس کیلئے بخشش کے سوا کچھ نہیں"۔

اپنے عزیز ترین بیٹے کی شہادت پر اظہارِ مسرت کے ایسے نمونے اب کہاں دیکھنے میں آتے ہیں؟

عزم و استقلال

خلیفہ عبدالملک نے ولید اور سلیمان کو اپنا ولیعہد مقرر کر کے ان کی بیعت لینے کا گورنروں کے نام حکم جاری کیا۔ گورنر مدینہ ہشام بن اسماعیل نے اہل مدینہ کی بیعت لینے کے بعد سعید بن مسیبؒ کو بلایا۔ مگر انہوں نے بلا سوچے سمجھے بیعت کرنے سے انکار کر دیا۔

وقار کے نشہ میں ہشام نے اس جواب کو توہین آمیز تصور کیا۔ اور سعید کو کوڑوں سے مارتے ہوئے راس الثنیۃ تک لے جانے کا حکم دیا جہاں مجرموں کو سولی دی جاتی تھی تاکہ انہیں بے عزت کیا جائے۔

سعید موت سے کب ڈرنے والے تھے۔ انہوں نے سولی پر سفر کمل جانے کے خیال سے لنگوٹا پہن لیا۔ اور کوڑے کھاتے ہوئے اپنے مقتل کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ وہاں سے جا کر ان کو پھر واپس لوٹا کر لانے لگے۔ تو سعید نے حسرت سے کہا۔

"اب واپس کہاں لے جاتے ہو؟"

جواب ملا۔

"قید خانہ میں"۔

آپ کو قید خانہ میں بند کر دیا گیا۔ آپ نے قید و بند کی سختیاں بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرنی شروع کر دیں۔

ہشام نے ابوبکر بن عبدالرحمٰن کو بھیجا کہ وہ کسی طرح سعید کو قید خانہ میں سمجھائیں بجھائیں۔ تا کہ وہ بیعت کے لیے تیار ہو جائیں مگر وہ تختۂ دار سے بصد حسرت واپس لوٹے ہوئے تھے۔ انہیں قید کی تکالیف کب خائف کر سکتی تھیں۔ سعید بولے۔

"ابوبکر خدا سے ڈرو۔ اور اس کو سب قوتوں سے بڑھ کر سمجھو۔ خدا کی قسم۔ تمہارے دل اور آنکھ دونوں کی روشنی جاتی رہی"۔

ابوبکر ناکام واپس لوٹے اور ہشام سے کہا۔

"ان کے عزم و استقلال میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی۔ بلکہ تمہارے جبر و تشدد نے انہیں زیادہ جری بنا دیا ہے"۔

مردانِ حق کے پائے ثبات کو دنیا کی کوئی طاقت متزلزل نہیں کر سکتی۔

دنیا و آخرت

حجاج بن یوسف نے جس وقت حضرت ابن زبیرؓ کو مسجد میں گھیرا تو وہ اکیلے تھے۔ اور دس ہزار فوج باہر گھیرا ڈالے کھڑی تھی جسے دو روز تک تن واحد سے مقابلہ کرنا پڑا۔

عبداللہ ابن زبیر بالآخر شہید ہو گئے۔ ان کی نعش حجاج کے حکم سے صلیب کے ساتھ منظرِ عام پہ لٹکا دی گئی۔

اس ظالم کا کلیجہ اس سے بھی ٹھنڈا نہ ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ اس کی ماں اسمار کو بلا لاؤ۔ اسمار نے آنے سے انکار کر دیا۔

حجاج نے دوبارہ آدمی بھیجے کہ اسمار بنت ابو بکرؓ کو بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے میرے پیش کرو۔ وہ آدمی گئے۔ مگر انہیں اس گستاخی کی جرأت نہ ہو سکی۔

اس پر حجاج خود وہاں پہنچا۔ اور ان سے یوں مخاطب ہوا۔
"دیکھا تم نے۔ میں نے تمہارے بیٹے سے کیا سلوک کیا ہے"۔

اسمار نے کہا

"مگر تم نے یہ نہیں دیکھا کہ میرے بیٹے نے تمہیں کتنا نقصان پہنچایا۔"

حجاج نے حیران ہو کر دریافت کیا۔

"تیرا بیٹا میرا کیا بگاڑ سکتا تھا۔ جو اس نے بگاڑ لیا۔"

اسمار نے فرمایا۔

"تم نے اس کی دنیا خراب کی۔ اس نے تیری آخرت تباہ کر دی۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا تھا کہ ثقیف میں ایک سیاہ کار ظالم و کذاب پیدا ہو گا۔ اور وہ یقیناً تو ہے۔"

اسمار کے اس جرأت آمیز جواب نے حجاج کو خاموش کر دیا۔ وہ اُٹھ کر چلتا بنا۔ اور یہ نابینا زائد از صد سالہ بوڑھی لاٹھی ٹیکتی ہوئی اس جگہ پہنچی۔ جہاں اس کے بیٹے عبداللہ ابن زبیرؓ کی نعش لٹک رہی تھی۔ اس نے پہرہ داروں سے پوچھا۔ کیا ابھی اس دولہے کے اترنے کا وقت نہیں آیا۔ انہوں نے انہیں دھکے دے کر پیچھے دھکیل دیا۔ اس وقت اس پیکر صبر و ثبات کا نہ کوئی آنسو بہا اور نہ آہ و فغاں نکلی بلکہ وہ مسرور تھی کہ اللہ کا یہ بندہ اللہ کی راہ میں ہی کام آیا۔ آج کی ماؤں کو ذرا اپنے گریبان میں جھانکنا چاہیے کہ اس معاملہ میں ان کا کیا مقام ہے؟

عزم و ثبات

خلیفہ ولید بن عبد الملک کی فرمانروائی کا زمانہ تھا۔ ممالک افریقہ
فتح ہو چکے تھے۔ شمالی افریقہ کو فتح کرنے کے بعد مسلمان سرزمین یورپ
پر قدم رکھنے کے لئے بیتاب تھے۔ شمالی افریقہ کی اسلامی افواج کے
کمانڈر امیر عقبی نے گھوڑا دوڑا کر یورپ کا رخ کیا۔ اس کی نظر اسپین
پر تھی۔ درمیان میں بحر ظلمات حائل تھا جس کی قدرتی روانی نے عقبہ
کو آگے بڑھنے سے روک دیا۔ بحر ظلمات کوئی ایسا دریا نہ تھا۔ کہ اسے
محض اپنی ہمت اور بہادری سے پار کر لیا جاتا۔ بحرِ ظلمات کے تلاطم
نے امیر عقبی کے جوش کو ٹھنڈا کر دینا چاہا مگر اسلامی عزم و ثبات نے
اسے گھوڑا دوڑانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن روانیِ آب نے گھوڑے کو
آگے نہ بڑھنے دیا۔ امیر رک گیا۔ حسرت و یاس بھری نگاہوں سے
آسمان کی طرف دیکھا اور درد بھری آواز میں اپنے مالک سے یوں
ملتجی ہوا۔ کہ

"اے خدا۔ تو جانتا ہے کہ میں نے کبھی مقابلہ سے گریز نہیں
کیا۔ میں کبھی موت سے نہیں ڈرا۔ آج بحرِ ظلمات کی روانی
میرے گھوڑے کو آگے بڑھنے سے روکتی ہے۔ اسلئے
میں مجبور ہوں۔ ورنہ میں تیرے کلمہ کو بلند کرنے میں کبھی
دریغ نہ کرتا۔"

چونکہ عزم پختہ، یقین محکم اور نیت نیک تھی۔ دریا کا زری و خود غرضی
کو راہ میں جگہ نہ تھا۔ اس لیئے مسلمانوں نے اسے پار کرنے کے
دوسرے وسائل اختیار کیئے اور آبنائے طارق کو عبور کر کے سرزمین
یورپ کے اُس جزیرہ نما میں جا پہنچے۔ جو بقول عرب سپہ سالار
اُس وقت :-

"آسمان اور زمین کی خوشبو۔ تی میں ملک شام۔ آب وہوا
کی لطافت میں یمن۔ عطریات میں ہند۔ زرخیزی میں مصر اور
بیش بہا فلزات میں چین تھا۔"

انسان جب ذاتی اغراض سے بلند و بالا ہو کر صرف اپنے مالک
و معبود کی خوشنودی اور اس کے دین کی سربلندی کے لیئے نکلتا
ہے۔ تو فتح و نصرت ہمیشہ اس کے قدم چومتی ہے۔

انجامِ صبر

ہشام بن اسماعیل گورنر مدینہ اہل بیت کا جانی دشمن تھا۔ یہ بسر منبر حضرت امام زین العابدینؓ اور ان کے اہل بیت کو ناقب بل برداشت گالیاں دیتا تھا۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ پر علانیہ سب و شتم کیا کرتا تھا۔

حسن اتفاق کہ خلیفہ ولید کسی وجہ سے ناراض ہو گیا۔ اس نے ہشام کو معزول کر کے حکم دیا۔ کہ

"اسے لوگوں کے مجمع میں کھڑا کیا جائے۔ اور جس جس کو اس سے تکلیف پہنچی ہے۔ وہ اس سے بدلہ لے"۔

اس کی بداعمالیوں سے ظاہر ہے کہ اس کے قول و کردار سے سب سے زیادہ تکلیف جن کو پہنچی تھی وہ اہل بیت تھے۔ اس لئے اسے اس بات کا از حد خطرہ لاحق ہوا کہ جنہیں وہ برسر اجلاس گالیاں دیتا تھا۔ وہ انتقام لینے میں سب سے پیش پیش ہوں گے اور وہ سلوک کریں گے

جو اس کے وہم و گماں میں بھی نہ ہوگا۔

لیکن ہشام کا یہ خطرہ غلط ثابت ہوا جن کے ہاتھوں اسے سب سے زیادہ اذیت پہنچنے کا ڈر تھا۔ وہی سب سے زیادہ کریم نکلے۔ جس کی تفصیل اس دشمنِ اہلبیت نے خود ان الفاظ میں دنیا کو بتلائی۔

"مجھے سب سے زیادہ خطرہ امام زین العابدین سے تھا کہ وہ با اثر آدمی تھے لیکن انہوں نے اپنے لڑکوں اور حامیوں کو منع کر دیا۔ کہ کوئی شخص ہشام سے تعرض نہ کرے۔"

آپ کے صاحبزادہ عبداللہ نے عرض کیا۔ کیوں؟

خدا کی قسم۔ اس نے ہمارے ساتھ بہت برائیاں کی ہیں۔ ہم کو تو ایسے وقت کا انتظار ہی تھا۔

فرمایا۔ کہ اس کو خدا کے سپرد کرتے ہیں۔

اُن کے اس اشارہ کے بعد کسی نے ہشام کے متعلق ایک لفظ تک منہ سے نہ نکالا۔ ہشام پر اتنا اثر ہوا کہ اسے امام زین العابدین کے فضل کا اعلانیہ اعتراف کرنا پڑا۔

صبر ہو تو ایسا ہو، اور صابر ہو تو ایسا ہو، حرف شکایت یا سعی انتقام، صبر کے اجر کو زائل کر دیتی ہے۔

صبرِ جمیل

حضرت عروہ بن زبیرؓ خلیفہ عبدالملک کے پاس شام گئے ہوئے تھے وہاں کسی زہریلے جانور نے پاؤں پر کاٹا جس سے ایک زہریلا زخم پیدا ہو گیا۔ اطباء نے آپ کے پاؤں کٹوا لینے کا مشورہ دیا۔ تاکہ زہر باقی جسم میں سرایت نہ کر جائے۔ اس وقت آپ اپنے فرزند محمد کی ناگہانی موت کے صدمہ سے بہت ضعیف ہو چکے تھے کہ اس جانکاہ تکلیف کا سامنا کرنا پڑا۔ طبیب نے تجویز کی کہ اپریشن سے قبل تھوڑی سی شراب پی لیں۔ تاکہ تکلیف کا احساس کم ہو۔

انہوں نے فرمایا

"جس مرض میں مجھ کو صحت کی اُمید ہو۔ اس میں حرام شے سے مدد نہ لوں گا۔"

طبیب نے کہا۔

"پھر غافل کر دینے والی دوائی استعمال کر لیجئے۔"

فرمانے لگے۔

"میں یہ بھی پسند نہیں کرتا۔ کہ میرے جسم کا ایک عضو کٹ جائے
اور میں اس کی تکلیف محسوس نہ کروں۔"

اپریشن کے وقت چند آدمی آپ کو سنبھالنے کے لئے آئے
آپ نے ان سے آنے کا سبب پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ
"زیادہ تکلیف کے وقت صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے
اسلئے آپ کو سنبھالنے کے لئے آئے ہیں۔"

فرمایا "مجھ کو امید ہے کہ تمہاری امداد کی ضرورت نہیں ہوگی۔"
غرضیکہ آپ نے نہ کوئی دوائی استعمال کی۔ نہ کسی کی مدد قبول کی۔
اور نہایت صبر و استقلال کے ساتھ اپنا پاؤں کٹوا دیا۔ جس وقت پاؤں
ٹخنوں سے الگ کیا گیا۔ تو اس وقت زبان پر تسبیح و تہلیل تھی اور جب
خون بند کرنے کے لئے زخم کو داغا گیا تو اس وقت کچھ بیہوش ہوئے
لیکن پھر جلد ہوش میں آکر اپنا پسینہ چہرے سے پونچھا اور کٹے ہوئے پاؤں کو دیکھ
کر کہا "اس ذات کی قسم جس نے تجھ سے میرا بوجھ اٹھوایا وہ خوب جانتا
ہے کہ میں تیرے ساتھ کسی حرام راستہ پر گامزن نہیں ہوا۔"

اجر و ثواب کی خوشی میں اہل ایمان دنیا کی بڑی سے بڑی تکلیف
بھی صبر و سکون سے برداشت کرتے ہیں۔

صبر کا اثر

امام ابو حنیفہؒ چالیس سال تک عشار کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے رہے سکون و خاموشی کی وجہ سے عبادت کیلئے رات کا وقت زیادہ موزوں ہوتا ہے مگر انہیں یہ سہولت بھی حاصل نہ تھی۔ کیونکہ انکا ایک رنگین مزاج اور خوش طبع موچی ہمسایہ تھا۔ جو صبح کو جوتیاں سیتا اور رات کو دوست و احباب کے ساتھ شراب و کباب اڑاتا اور گاتا رہتا۔ وہ اکثر اس مضمون کا شعر گایا کرتا تھا کہ لوگوں نے مجھ کو ہاتھ سے کھو دیا۔ کیسے بڑے شخص کو کھو دیا۔ جو لڑائی اور رخنہ بندی کے دن کام آتا۔

امام ابوحنیفہ نے اسکی ان نغمہ سنجیوں کے ذکر و شغل میں مخل ہونے کو کبھی کسی سے ذکر نہ کیا۔ انکا یہ صبر و سکوت ایک دن عجیب رنگ لایا۔ ایک رات کوتوال شہر اس گلی سے گزرا۔ اس نے یہ راگ و رنگ دیکھ کر موچی کو بند حوالات کر دیا جس کی وجہ سے رات کو خلاف معمول اس مکان پر خموشی کا پہرہ رہا۔ صبح کو امامؒ نے اپنے احباب سے دریافت فرمایا کہ میرے شب بیدار

رفیق کی رات آواز نہیں آئی۔ خیر تو ہے؟ لوگوں نے سب واقعہ عرض کر دیا۔ ہمسایہ کی گرفتاری کی خبر سے انہیں بہت صدمہ ہوا، اسی وقت درباری لباس زیب تن کر کے سواری منگائی اور سیدھے عیسٰے بن موسےٰ گورنر کوفہ کو ملنے کیلئے دارالامارۃ پہنچے۔ عہدِ عباسیہ کے اس گورنر کو جب امامِ اعظم کی آمد کی خبر پہنچی۔ تو اس جوہر شناس گورنر نے درباریوں کو امامِ وقت کے استقبال کے لئے روانہ کیا۔ اور کہا کہ دارالامارۃ کے صحن تک امام صاحب کو سواری پر لائیں۔

جب سواری قریب آئی۔ تو خود تعظیم کے لئے بڑھے۔ امام اعظمؒ کو انتہائی ادب کے ساتھ لا کر بٹھایا اور عرض کی آپ نے کیوں اتنی تکلیف فرمائی مجھے بلا لیتے۔ میں خود حاضر ہو جاتا۔ امام صاحب نے سارا واقعہ بیان کر دیا۔ عیسٰے نے اسی وقت اس موچی کو رہا کر کے ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ راستہ میں امام صاحب نے اس کے اسی شعر کی طرف جو وہ اکثر رات کو گایا کرتا تھا۔ اشارہ کر کے کہا۔ کیوں ہم نے تم کو ضائع تو نہیں کیا۔ موچی نے کہا۔ نہیں۔ آپ نے ہمسائیگی کا حق ادا کیا ہے اس واقعہ کے بعد وہ عیش پرستی سے تائب ہو کر امام اعظمؒ کے حلقۂ درس میں شامل ہو گیا۔ اور فقیہہ کے لقب سے ممتاز ہوا۔

صبر کا پھل ضرور ملتا ہے خواہ کتنی ہی دیر کیوں نہ ہو جائے۔

پیکرِ استقلال

دربارِ اشرفیہ کے رئیس الاحرار اور قطبِ زماں مفتی محمد حسن نقشبندی دائیں ٹانگ میں عرصہ قریباً بیس سال سے معمولی تکلیف چلی آتی تھی جو دن بدن پھیلتا اور بڑھتا چلا جاتا تھا۔ علاج کی سنت بھی ادا ہوتی رہی مگر کیفیت ہمیشہ یہی رہی کہ مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

سالم پنڈلی کھروں سے چھلنی کی مانند ہو چکی تھی۔ اس کا نظارہ اتنا ہیبت ناک تھا کہ حضرت خود ہی بند کمرے میں اسے دھویا کرتے تھے اور کسی کو دیکھنے نہ دیتے تھے۔ راقم کو ایک دفعہ اتفاقیہ دیکھنے کا موقعہ ملا۔ مگر حضرت نے فوراً دروازہ بند کرا دیا۔

چلنے سے معذور تھے تکلیف بے اندازہ تھی۔ مگر کبھی اس کا کسی کو احساس نہ ہونے دیا۔ بالآخر یہ رائے قرار ہوئی کہ ساری پنڈلی ہی کٹا دی جاوے۔ شروع میں آپ اس کے لئے آمادہ نہ تھے۔ لیکن ڈاکٹروں اور نیازمندوں کے اصرار پر راضی ہو گئے۔

میو ہسپتال لاہور میں گذشتہ سال آپ کا اپریشن ہوا۔ ڈاکٹروں نے تمام حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ٹانگ گھٹنے کے اوپر کے حصہ سے کاٹی جائے تاکہ پھر مصنوعی ٹانگ لگ سکے حالانکہ گھٹنے سے اوپر کا حصہ بالکل صحت مند تھا۔

ڈاکٹروں نے شدت تکلیف کے احساس کو کم کرنے کے لئے آپ کو دوائی دینی چاہی۔ مگر آپ نے کسی قسم کی کوئی دوائی لینے سے صاف انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ

"مجھے میرے حال پر چھوڑ کر آپ اپنا کام شروع کریں"۔

ستر برس سے اوپر کی عمر۔ ران کے صحت مند حصہ کو بغیر کسی نشئی چیز کے استعمال کے کاٹنا ڈاکٹروں کے لئے باعثِ حیرت و استعجاب ہوا مگر تو کلا ایک بیکہ لگا کر انہوں نے ران کاٹنی شروع کر دی۔ پورے ایک گھنٹہ کے بعد یہ اپریشن ختم ہوا۔ ڈاکٹر کرنل ضیاء اللہ جنہوں نے حضرت کی نبض پر ہاتھ رکھا ہوا تھا کا بیان ہے۔

حیرت ہے کہ اپریشن کے آغاز سے لے کر اختتام تک نبض کی رفتار میں سرمو فرق نہ آیا۔ اس اپریشن کے بعد شریانوں کے کٹنے سے جو درد پیدا ہوتا ہے اس کی شدت کا اور کوئی درد مقابلہ نہیں کر سکتا۔ مگر حضرت جس

بشاشت کے ساتھ اپریشن روم میں داخل ہوئے تھے
اسی کے ساتھ واپس لوٹے۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔
یہ درد ہفتوں رہا۔ مگر حضرت کے منہ سے اف تک نہ نکلی اور نہ
نماز قضا ہوئی۔ جب حضرت سید سلیمان ندوی مدظلہ؛ حضرت مفتی صاحب
کی عیادت کے لئے تشریف لائے تو آپ نے اس استقامت کا
راز معلوم کرنا چاہا۔ حضرت نے فرمایا۔
"میں اس وقت اس تکلیف کے اجر جزیل کی خوشی میں
ایسا محو ہوا کہ کچھ پتہ ہی نہ چلا کہ کیا ہو رہا ہے"
یہ عین الیقین کا مقام تھا۔ کہ تکلیف کا اثر راحت کا باعث ہوا
بسا اوقات تکلیف صرف بلندیٔ درجات کی خاطر دی جاتی ہے چونکہ
ہمیں اس کا استحضار نہیں ہوتا۔ اسلئے چیخنے چلانے لگتے ہیں۔ گر
ہماری نظر ہر تکلیف کے اثر و اجر پر رہے تو یہ نوبت کبھی نہ آئے۔

---

(۱۹)

ایثار و قربانی

کون اے ساقی ترے ایثار کا قائل نہیں
لیکن اپنے پینے والے کو بھی دریا دل بنا

خلیفہ اول کی تنخواہ

حضرت ابوبکر صدیقؓ پہلے تجارت کرتے تھے۔ خلیفہ بننے کے بعد ذاتی کاروبار بند کر کے اپنی ساری زندگی خدمتِ خلق و دین کے لئے وقف کر دی۔ ان کی حیثیت کسی بادشاہ یا وائسرائے سے کم نہ تھی مگر انہیں بیت المال سے صرف آدھ سیر بکری کا گوشت۔ اوڑھنے کے لئے دو چادریں۔ گھر کے لئے صرف کھانا اور کپڑا ملتا تھا۔ چادریں جب خراب یا ناکارہ ہو جاتیں۔ تو ان کو واپس کر کے دو اور چادریں لے لیا کرتے تھے۔ سرکاری طور پر صرف یہی تنخواہ اور الاؤنس تھا جس میں آپ گزارہ کرتے تھے۔ دنیا کے سامنے انہوں نے عملی سادہ زندگی کا جو نمونہ پیش کیا۔ اس پر عمل پیرا ہونے کے لئے مہاتما گاندھی نے جمہوریہ ہند کے وزرا کو تلقین کی۔ اور وزیر اعظم یو۔پی نے اپنے حکام کو ایسی سادہ زندگی بسر کرنے کا حکم دیا۔ مگر کسی اسلامی مملکت کے امیر یا وزیر کو اس پر عمل کرنے کی توفیق نہیں ہوئی۔

شیرِ خدا کا ایثار

سب سے پہلے خلیفۂ ثانی حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں محکمۂ عدلیہ کو انتظامیہ سے علیحدہ کیا گیا۔ بیت المال کی باقاعدہ بنیاد رکھ کر محکمۂ مال یا سرکاری خزانہ قائم کیا گیا۔ حکومت کا کاروبار مختلف محکموں اور عہدہ داروں کے سپرد کیا گیا۔ اور اربابِ عدل و انصاف کی تنخواہیں مشخص کی گئیں۔

عہدِ اسلامی میں تنخواہوں کا معیار مقرر کرتے وقت اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا تھا۔ کہ عہدہ داروں کو معقول مشاہرہ دیا جائے۔ جو ان کی ضروریات زندگی کے لیے مکتفی ہو۔ وہ خوشحالی سے زندگی بسر کر سکیں اور انہیں کسی دوسرے کی طرف ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہ رہے۔

اپنے ملازمین کے آرام و آسائش خوشحالی و فارغ البالی کا اس حد تک خیال رکھنے والے امراء سلطنت خود نہایت ہی سادہ زندگی بسر

کرتے تھے۔ اپنے لئے قلیل ترین تنخواہیں مقرر کر رکھی تھیں۔ مگر دوسروں کو اس کے لئے مجبور نہیں کرتے تھے۔

اسلامی عدالت کی تاریخ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ایثار کی نظیر نہیں ملتی۔ آپ کے زہد و قناعت کا یہ حال تھا کہ ہر روز بیت المال سے اپنی قوت لایموت کیلئے صرف ایک پیالہ ثرید کا لیتے تھے۔ جو بقائے زندگی کے لئے کافی ہوتا تھا۔ اور یہی ان کی تنخواہ تھی۔ مگر اسی زمانہ میں قاضی سلیمان بن ربیعہ باہلی اور قاضی شریح پانچ پانچ سو درہم ماہوار یعنی چھ ہزار درہم سالانہ تنخواہ پاتے تھے۔

دورِ حاضرہ میں ضروریاتِ زندگی کو مدِنظر رکھ کر تنخواہیں مقرر نہیں کی جاتیں۔ بلکہ عہدوں کی نسبت سے تنخواہیں مقرر کی ہوئی ہیں۔ جو تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ عام طور پر قلیل تنخواہ والوں کو زیادہ کام کرنا پڑتا ہے جس سے ان کی صحت بگڑ جاتی ہے۔ خانگی ضروریات بچوں کی تعلیم۔ بیماری۔ شادی۔ غمی کے اخراجات برداشت نہ کرنے کی وجہ سے بعض رشوت لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اور بعض دیانت کی وجہ سے تنگدستی سے گزارتے ہیں۔ اعلیٰ عہدیداروں کو زیادہ تنخواہیں ملتی ہیں اور کام کم کرنا پڑتا ہے جس کی وجہ سے بعض عیش و عشرت میں پڑ کر حکومت کے وقار کو نقصان پہنچاتے ہیں۔ اور بسا اوقات بددیانتی کے مرتکب ہوتے ہیں۔

حکومت اور حق

اموی خلیفہ عبدالملک کے عہدِ حکومت میں اہلِ مکہ نے حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کو اپنا امیر مقرر کر کے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ جب عبدالملک نے عراق کے گورنر حجاج کو عبداللہ ابن زبیرؓ کے مقابلے کے لئے روانہ کیا۔

اس وقت آپ کی والدہ حضرت اسماء بنت ابوبکرؓ کی عمر سو سال سے زائد تھی اور بینائی جواب دے چکی تھی۔

میدانِ کارزار میں جانے سے قبل آپ والدہ سے رخصت لینے آئے۔ اور عرض کی۔

"اکثر لوگ میرا ساتھ چھوڑ چکے ہیں۔ جو باقی ہیں وہ بدحال ہو چکے ہیں۔ دشمن کی طرف سے عزت۔ سرخروئی۔ حکومت اور دولت کی پیش کش ہوتی ہے اب آپ کا جیسے حکم ہو"

ماں نے کہا۔

"تم مجھ سے بہتر جانتے ہو۔ جو لوگ حق پر ہوتے ہیں۔ ان کا
بہت کم ساتھ دیا جاتا ہے۔ جب تم خود حق پر ہو۔ اور لوگوں
کو حق کی طرف بلاتے ہو۔ تو ان کے ساتھ چھوڑنے کا
تمہیں کوئی رنج نہیں ہونا چاہیئے۔
اگر تم محض دنیوی اغراض کے لئے یہ جنگ لڑنا چاہتے
ہو۔ تو نہ صرف اپنے ساتھ بلکہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ
بھی بُرا کر رہے ہو۔
جاؤ۔ دیر نہ کرو۔ اللہ کے لئے آگے بڑھو۔ اور اپنے اللہ
کو راضی کرو۔"

سبحان اللہ! کیسی دل تھی۔ اس کے بڑھاپے پر نظر ڈالئے۔ بے
بصارتی کو دیکھئے۔ اور اس عالم میں جبکہ عام طور پر اولاد کو سہارا سمجھا
جاتا ہے۔ ماں کا اپنے ہاتھ سے بیٹے کو شہادت گاہ میں بعجلت تمام
پہنچنے کے لئے روانہ کرنا۔ کتنے دل گردے کا کام ہے۔ حکومت و
ثروت پر لات مار دی۔ مگر اسلام کی عزت پر حرف نہیں آنے دیا۔
اگر اس زمانہ میں کوئی ایسی پیشکش کی جاتی۔ تو خدا و رسولؐ اور دین
و ایمان پر اسے ترجیح دی جاتی۔

وزارت پرلات

ابراہیم بن عبلہ اپنے زمانہ میں زہد و تقویٰ اور دیانت داری میں خاص شہرت رکھتے تھے۔ اموی خلیفہ ہشام بن عبدالملک نے انہیں طلب کیا۔ جب وہ حاضر ہوئے۔ تو ہشام نے ان کو وزارتِ خراجِ مصر کا عہدہ پیش کیا۔ ابراہیم نے وزارت ایسا باعزت شاہی عہدہ قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ

"میں اس کا اہل نہیں۔"

ہشام کو اس انکار پر سخت غصہ آیا۔ اس نے برہم ہو کر کہا۔

"یہ عہدہ منظور کرنا ہوگا۔ ورنہ سخت سزا دی جائے گی۔"

ابراہیم یہ سن کر خاموش ہو رہے تھوڑی دیر کے بعد جب ہشام کا غصہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو ابراہیم نے کہا۔

"حق تعالیٰ نے اپنے کلام پاک میں ارشاد فرمایا۔

ہم نے اپنی امانت زمین و آسمان کے سپرد کرنی چاہی

مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

جب احکم الحاکمین ان سے خوش نہیں ہوئے۔ آپ مجھ سے کیوں خفا ہوتے ہیں؟"

خلیفہ یہ جواب سن کر لاجواب ہو گیا۔ اور یہ وزارت ایک دوسرے شخص کے سپرد کر دی۔

صاحب نظر کے سامنے یہ وزارت کتنی بے حقیقت چیز تھی کہ اس پر لات مار دی۔ ہمارے ہاں اہل غرض اسے حاصل کرنے کیلئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں۔ اور بسا اوقات ضمیر و ایمان فروشی کی حد تک سعی کرتے ہیں۔

حق شناسی

خلیفہ عبدالملک نے اپنے ولیعہد ہشام کے لئے شیخ الاسلام سعید بن مسیبؒ سے ان کی تعلیم یافتہ حسین و جمیل لڑکی کا رشتہ مانگا۔ انہوں نے امیرالمومنین کو صاف انکار کردیا۔ اور ہر قسم کے دباؤ اور سختیوں کے باوجود یہ رشتہ نہ دیا۔

سعید کے پاس قریش کا ایک نہایت ہی غریب آدمی ابو وداعہ روزانہ آکر بیٹھا کرتا تھا۔ ایک مرتبہ وہ خلاف معمول چند روز کے بعد آیا۔ اور دریافت پر اپنی بیوی کے انتقال کا عذر پیش کیا۔ جب چلنے لگا تو سعید نے اس سے عقد ثانی کی بابت پوچھا۔ اس نے جواب دیا کہ میں غریب نادار۔ دو چار پیسے کی حیثیت کا آدمی ہوں۔ مجھ سے کون شادی کریگا۔

سعید نے کہا تم تیار ہو؟ ابو وداعہ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر انہوں نے اسی وقت دو یا تین درہم میں اپنی اسی لڑکی کا نکاح اس غریب سے کردیا۔ جس کا رشتہ خلیفہ وقت طلب کرتا تھا۔ ابو وداعہ اس غیر متوقع واقعہ پر بہت خوش ہوا۔ فرطِ مسرت میں اسے کچھ سمجھ نہ آتی تھی

کہ وہ کیا کرے۔ گھر پہنچ کر وہ رخصتی کیلئے قرض لینے کی فکر میں پڑ گیا۔
شام کے بعد سعید نے دو رکعت نماز خود پڑھی۔ اور دو رکعت لڑکی سے پڑھوا کر اسے ہمراہ لے کر داماد کے دروازہ پہ پہنچے۔ وہ روزہ افطار کر کے بیٹھا ہی تھا کہ دستک کی آواز آئی۔ ابو وداعہ باہر نکلا۔ تو سعیدؒ کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ انہوں نے فرمایا۔

"تم مجرد آدمی تھے۔ تمہاری بیوی موجود تھی۔ میں نے خیال کیا کہ تنہا کیوں رات بسر کرو۔ اسلئے تمہاری بیوی کو لے آیا ہوں۔ لو یہ تمہاری بیوی ہے۔"

یہ کہہ کر انہوں نے لڑکی کو اندر داخل کر دیا اور خود واپس چلے آئے۔ ابو وداعہ کا بیان ہے کہ

وہ نہایت حسین۔ کتاب اللہ کی حافظ۔ سنت رسولؐ کی عالم اور حقوق شوہر کی واقف تھی۔

بادشاہ وقت کی خواہش کے خلاف لیبھار کے مقابلہ میں ایک غریب کو ترجیح دینا۔ گرانقدر مہر کی بجائے دو تین درہم پر اکتفا کرنا۔ داماد کو شادی کے غیر ضروری اخراجات سے بچانے کیلئے اسکی بیوی کو اسکے گھر پہنچا آنا ایسے واقعات ہیں جن سے ہمیں سبق لینا چاہیئے اور اپنے گریبانوں میں جھانک کر سوچنا چاہیئے کہ اس معاملہ میں ہم کتاب و سنت کے کتنے پیرو ہیں؟

بے مثل قربانی

ابراہیم بن یزید تیمی بہت بڑے عابد تھے۔ ان پر سجدے میں خدا کی ہیبت و استغراق کا یہ عالم تھا کہ سجدہ کی حالت میں چڑیاں ان کی پشت پر آ کر بیٹھتی تھیں اور چونچیں مارا کرتی تھیں۔ اس زمانہ کے مشہور محدث اور فقیہ عالم ابراہیم بن یزید نخعی حجاج ثقفی کے زیر عتاب تھے۔ اس نے ان کی گرفتاری کے لئے آدمی چھوڑ رکھے تھے۔

ابراہیم تیمی کو حجاج اور ابراہیم نخعی کی مخالفت کا علم تھا۔ ابراہیم تیمی نے ابراہیم نخعی کو اس ظالم کی دست برد سے بچانے کے لئے تلاش کنندگان کے روبرو اپنے آپ کو یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ ابراہیم میں ہوں۔

گرفتار کرنے والے اور حجاج دونوں ابراہیم نخعی کی شکل سے واقف نہ تھے۔ اس لئے گرفتار کرنے والوں نے ابراہیم تیمی کے اقرار پر اسے گرفتار کر کے حجاج کے پیش کر دیا۔

حجاج نے ابراہیم تیمی کو قیدیوں میں جکڑ کر دیا اس کے قید خانہ میں بھجوا دیا۔ جو موت کے گھر کے نام سے مشہور تھا اور صرف سنگین مجرموں کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس میں سردی اور گرمی، بارش اور دھوپ سے بچنے کا کوئی انتظام نہ تھا۔

قید کی صعوبتوں نے ابراہیم تیمی کو ایسا حلیہ بگاڑا کہ انھیں خود ان کی والدہ شناخت نہ کر سکی۔ وہ آپ ایک عالم وقت کی جان بچانے کے شوق میں نہایت صبر و استقلال سے تمام صعوبتیں برداشت کرتے کرتے راہی ملک عدم ہو گئے۔

ان کی شب وفات حجاج نے خواب دیکھا کہ شہر میں ایک جنتی فوت ہو گیا ہے۔ صبح اس نے پتہ کرایا کہ آج کون مرا ہے۔ تحقیقات پر پتہ چلا کہ جیل میں ابراہیم فوت ہوا ہے۔ اس جفا شعار نے یہ سن کر ان کی نعش گھورے پر پھنکوا دی۔

یہ ایک ایسی قربانی ہے جس کی مثال ملنی محال ہے۔ پیغمبر کے لئے جان تک قربان کرنا تو ایک طرف رہا۔ اس زمانہ میں اپنوں کی خبر گیری سے بھی گریز کیا جاتا ہے۔

بے مثال ایثار

ابو محمد الازدی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ مرو کی ایک مسجد کو آگ لگ گئی جس سے بہت نقصان ہوا۔ تحقیق اور تفتیش سے شبہ عیسائیوں پر ہوا کہ انھوں نے خانہ خدا کو جلایا ہے۔ مسلمان بہت مشتعل ہوئے اور عیسائیوں کے کئی گرجے جلا ڈالے۔ جب اس واقعہ کی اطلاع سلطان وقت کو پہنچی تو اس نے گرجے جلانے کی حرکت کو سراسر خلافِ تعلیم اسلام قرار دیکر مجرموں کی گرفتاری کا حکم صادر کر دیا۔ وہ سب پکڑے آئے۔ سلطان نے تمام واقعات کی جانچ پڑتال کے بعد مجرموں کو تین قسم کی سزاؤں کا حکم دیا۔ ۱۔ سزائے تازیانہ ۲۔ سزائے قطع ید و پا ۳۔ سزائے موت مگر یہ تخصیص کرنے کی بجائے کہ بید زنی۔ ہاتھ پاؤں کے کاٹے جانے اور موت کی سزا کس کس کو دی گئی ہے۔ یہ عجیب طریقہ استعمال کرنا تجویز کیا کہ مذکورہ بالا سزائیں تحریر کر کے ملزموں کی طرف پھینکیں کہ جس کے حصہ میں جو پرچی آ گئی۔ وہ خود کو اسی سزا کا مستحق سمجھے

جس شخص کے متعلق میں سزائے موت کا پروانہ آیا۔ اس نے کہا۔
"واللہ۔ میں قتل ہونے سے نہیں ڈرتا۔ لیکن رہ رہ کے مجھے
اپنی ماں کا خیال آتا ہے۔ جس کا میرے بعد کوئی آسرا
نہیں ہے۔ نہ کوئی بہن نہ بھائی اور نہ کوئی اور عزیز!"
ساتھ والے ملزم نے جسے تازیانہ کی سزا کا پروانہ ملا تھا۔
اپنے ساتھی کی مندرجہ بالا مجبوری کا احساس کرتے ہوئے فوراً کہا
کہ تم ہرگز نہ گھبراؤ۔ اپنی پرچی مجھے دے دو اور میری پرچی تم لے لو
کیونکہ میری ماں فوت ہو چکی ہے۔ تم کوڑے کی سزا بھگت کر ماں
کی خدمت کرنا۔ میں سزائے قتل بھگت لوں گا۔

اس نوجوان نے اپنے مخلص رفیق کی یہ پیش کش قبول کرتے
ہوئے اس سے اپنی پرچی بدل لی۔ اور کوڑے کھا کر اپنی والدہ کی
خدمت کو چل دیا۔ اور دوسرا پیکرِ ایثار موت کا پیالہ پی کر دارالبقا میں
اپنی والدہ سے جا ملا۔

کیا آج کل ایسی قربانی کا تصور بھی کیا جا سکتا ہے؟ حقیقت
یہ ہے کہ صاحبِ ایمان لوگوں کے لئے موت ایک بازیچۂ اطفال
سے زیادہ وقعت نہیں رکھتی تھی۔

ایثار مجسم

نظامِ اسلام میں امیرِ سلطنت کے لئے ایک مثالی شخصیت ہونا لازمی امر ہے کیونکہ اس کا قول و عمل عوامی زندگی کی بنیاد کہلاتا ہے۔ عوام سے راشدین کے بعد پہلا شخص جس نے حکومت کو اس معیار پر پہنچایا وہ پہلا اترا وہ حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے۔ ان کی حکومت ممالک حجاز۔ شام۔ عراق۔ سمرقند۔ بخارا۔ خراسان۔ کابل۔ ایران۔ سندھ۔ روما۔ اندلس۔ ترکستان۔ آذربائجان۔ آرمینیا اور ایشیائے کوچک تک وسیع تھی۔

رعایا ٹیکسوں کے بار سے آزاد تھی۔ خزانہ زر و مال سے پُر تھا۔ ہر طرف خوشحالی اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔ گویا عمر بن عبدالعزیز اپنے نانا کا دورِ حکومت واپس لے آئے تھے۔ عہدِ اسلام کے شاہی دور میں ایسی مثالی حکومت کس چیز پر قائم کی گئی؟

اس سوال کا جواب اسلام کے اس مجددِ اول کی سیرت صرف دو لفظوں میں پیش کرتی ہے۔ "ایثار اور قربانی"

بیت المال سے انہیں پندرہ روپیہ ہوا یعنی آٹھ آنہ یومیہ تنخواہ
ملتی تھی کھانے کے سوا اس سے گھر کی ضروریات پوری کی جاتی
تھیں عسرت و تنگدستی سے گزارہ کرتے تھے خلیفۂ اسلام کی بیوی
اور بچوں کیلئے رعایا کی خوشحالی قابلِ رشک حسرت تھی۔ ان حالات
کے پیشِ نظر ایک بار عبداللہ بن زکریا نے آپ کی خدمت میں عرض کی۔
"امیر المومنین آپ اپنے عمال کو سو سو دو دو سو دینار بلکہ اس سے بھی
زیادہ مشاہرہ دیتے ہیں۔ مگر اپنا یہ حال کر رکھا ہے۔ آپ بھی زیادہ نہیں تو
کم از کم عمال کے برابر ہی لیجئے کیونکہ آپ ان سے زیادہ کام کرتے ہیں"
انہوں نے فرمایا۔ "اگر میرے عمال قرآن و حدیث کے مطابق
عمل کریں تو یہ بہت ہی کم تنخواہ ہے میں انہیں معاشی مجبوری
سے بالکل نجات دلانا چاہتا ہوں"

پھر فرما کر اپنا بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ پر رکھ کر ہنسنے لگے۔
لیکن یہ گوشت کا ٹکڑا خدا کے مال سے پیدا ہوا ہے
اور اب میں خدا کے مال سے اس میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتا۔

خلیفہ کا یہ رویہ زمانہ حال کے اربابِ اقتدار کیلئے سرمایہ عبرت و بصیرت ہے
جو ناقابلِ برداشت ٹیکسوں کے ذریعہ خزانہ بھرتے رہتے ہیں اور
گرانقدر مشاہروں الاؤنسوں اور شاہانہ خرچوں کے ذریعے اسے خالی کرتے رہتے
ہیں۔

فاطمہ کی قربانی

بنو امیہ کے خلیفہ عبدالملک کی لاڈلی بیٹی فاطمہ کی شادی اس وقت کے رئیسِ اعظم عمر بن عبدالعزیز سے ہوئی تھی۔ ایک بڑے بادشاہ کی چہیتی بیٹی ہونے کے سبب کافی زر و مال جہیز میں لائی تھی۔ یہ امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کرتے تھے جب کبھی سفر پہ جاتے تو ذاتی ساز و سامان کے کئی کئی اونٹ ساتھ ہوتے تھے۔ نہ صرف ان کے خاندان میں بلکہ اُس وقت کسی دوسرے خاندان میں بھی کوئی ان جیسا خوش لباس اور عیش پرست گھرانا نہ تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد انقلابِ زمانہ نے آپ کے سر پہ تاجِ خلافت رکھا۔ اس گراں بار ذمہ داری نے عمر بن عبدالعزیز کی ساری زندگی بدل دی۔ صرف خلیفہ کی ہی نہیں بلکہ ان کے سارے گھر کی کایا پلٹ دی۔ عنانِ حکومت سنبھالتے ہی انہوں نے اپنا پہلا حکم ناز و نعم سے پلی ہوئی اور زر و جواہرات سے لدی ہوئی فاطمہ کو دیا کہ

"تمہارے یہ سارے زیورات و پارچات اور مال و دولت مسلمانوں کی غصب شدہ املاک ہے۔ اگر تم میری بیوی رہنا چاہتی ہو۔ تو یہ سب فی الفور بیت المال میں داخل کردو ورنہ اس حکم کی تعمیل تک میں تم سے نہیں بول سکتا۔"

یہ حکم فاطمہ کی امیرانہ زندگی پر بجلی کی طرح گرا۔ اس کی وہ تمام امیدیں خاک میں مل کر رہ گئیں۔ جو اس نے اپنے مالک کے بادشاہ بننے سے لگا رکھی تھیں۔ اُس نے اس حکم کی فوراً تعمیل کی۔ کسی قسم کے رنج و ملال کے اظہار کے بغیر تمام ساز و سامان اور زیورات و پارچات بیت المال میں داخل کر کے خالی ہاتھ ہو بیٹھی۔ اور پھر ساری عمر اس شاہزادی نے عسرت و قناعت سے گزار دی کہ ایک مزدور کی بیوی اور خلیفہ وقت کی بیوی میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔

اس زمانہ میں عورتوں سے اس قدر قربانی کی توقع عبث ہے ان کی اکثریت آزادی نسواں کا شکار ہو کر شرعی حدود و قیود کے دائرہ سے باہر نکل چکی ہے۔ اچھے اچھے گھرانوں میں لباس و خوراک کے معاملہ میں مردوں پر عورتوں کی برتری نظر آتی ہے۔"دین جائے۔ مگر بناؤ سنگار میں فرق نہ آئے" پر ان کا عمل ہے لیکن ان کی اصلاح کی طرف کسی کی توجہ ہی نہیں۔

خشت شماری

خلیفہ منصور ابوجعفر نے ۱۴۶ سنہ ہجری میں امام ابوحنیفہ کے نام کوفہ میں طلبی کا حکم بھیجا۔ وہ بتعمیل حکم تشریف لائے۔ ربیع نے انکو ان الفاظ خلیفہ کے پیش کیا۔

"یہ دنیا میں آج سب سے بڑا عالم ہے۔"

منصور نے پوچھا۔

تم نے کس کس سے تعلیم حاصل کی ہے۔

امام ابوحنیفہؒ نے اپنے اساتذہ کرام کے نام بتائے جن کا سلسلہ شاگردی بڑے بڑے صحابہ تک پہنچتا تھا۔

منصور نے کہا۔

"میں تمہارے لئے قضاۃ کا عہدہ تجویز کرتا ہوں۔"

امام نے جواب دیا۔

"میں اس کی قابلیت نہیں رکھتا۔"

منصور نے غیظ و غضب میں آکر کہا۔

"تم مجبور کے ہو"

امام نے فرمایا۔

"آپ نے میرا دعویٰ سچا کر دیا۔ کیونکہ جھوٹا قاضی مقرر نہیں ہو سکتا"

امام اعظم کے اس جواب نے تو خلیفہ کو لاجواب کر دیا۔ مگر محض اپنا وقار قائم رکھنے کی خاطر خلیفہ نے قسم کھا کر کہا کہ

"تم کو یہ قبول کرنا ہو گا"

امام اعظم کب ڈرنے والے تھے۔ انہوں نے قسم کھا کر کہا۔

"ہرگز قبول نہیں کروں گا"

اس بیباکانہ جواب نے تمام دربار کو حیرت زدہ کر دیا۔

خلیفہ نے اپنی قسم پوری کرنے کیلئے امام اعظم سے ایک ادنیٰ عہدہ یا سرکاری خدمت لینے کا فیصلہ کیا۔ غالباً اس وقت شہر بغداد کی تعمیر ہو رہی تھی۔ امام اعظم کو اینٹوں کی گنتی پر مامور کر دیا گیا جو تعمیر میں لگ رہی تھیں۔ امام اعظم نے خلیفہ کے اصرار کے مقابلہ میں یہ حقیر خدمت قبول کر لی۔ جیسے اینٹیں تیار ہوتی جاتی تھیں وہ ایک بانس کے ذریعہ انہیں گنتے جاتے تھے۔ اس زمانہ میں جاہ و منصب حاصل کرنے کیلئے اکثر ضمیر فروشی تک کی کوشش کی جاتی ہے۔ چہ جائیکہ ایسی پیشکش کو ٹھکرا کے ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا جائے۔

خلیفہ کی بے بسی

خلافتِ راشدہ کے بعد خلیفہ عمر بن عبد العزیز کے عہد حکومت کو چھوڑ کر جس قدر بھی مسلمان خلفاء یا بادشاہ گزرے ہیں۔ ان کی حکومت گو اسلامی حکومت ہی کہلاتی تھی۔ مگر فی الحقیقت وہ اسلامی یا شرعی طرز کی حکومتیں نہ تھیں اسلئے علمائے حق نتائج و عواقب سے بے پروا ہو کر ان کے پیش کردہ مناصب اور وزارتوں کو پائے استحقار سے ٹھکرا دیتے تھے بقول امام شعرانی اس کی ابتدا مروان کے زمانہ سے شروع ہوئی۔

حیات بن شریح کو خلیفہ منصور نے جب مصر کی قضاء کا عہدہ پیش کیا۔ انہوں نے اسے قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا خلیفہ نے ان کی اس عدول حکمی کی وجہ سے ان کو دربار میں طلب کر کے قتل کی دھمکی دی۔ لیکن اس پیکرِ عزم و ثبات پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے فوراً اپنی جیب سے گھر کی کنجیاں نکال لیں اور بادشاہ کے سامنے پھینک کر انتہائی جرأت سے کہا۔

"خدا کی قسم۔ میں اپنے اللہ سے ملنے کیلئے تیار ہوں"۔
منصور ان کے عزم واستقلال کی تاب نہ لا سکا اور انہیں چھوڑ دیا۔

اس زمانہ میں معمولی معمولی منصب حاصل کرنے کے لئے رشوت سفارش۔ خوشامد اور کئی دیگر ناقابلِ ذکر حربوں سے کام لیا جاتا ہے جو ان کوششوں میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ وہ عموماً دیانت وامانت سے کام نہیں کرتے۔ بلکہ اکثر اپنے مربی کے اشارہ چشم و ابرو پر چلتے ہیں۔ اسی وجہ سے حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ

"جو شخص خود کو کسی عہدے کے لئے پیش کرے۔ اسے اس کا قطعاً اہل نہ سمجھا جائے"۔

جس پر اس زمانہ میں عمل کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

ایثارِ دوست

"تیسری صدی ہجری کے مشہور عالم واقدی لکھتے ہیں۔

"میرے دو دوست تھے۔ جن میں ایک ہاشمی تھا۔ ہم باہم اس قدر اتحاد تھا کہ یک جان سہ قالب ہو گئے تھے۔ ایک بار میں سخت تنگدستی میں مبتلا تھا۔ اس حالت میں عید کا زمانہ آگیا۔"

بیوی نے کہا۔

"ہم لوگ تو صبر کر سکتے ہیں لیکن بچوں کی حالت دیکھ کر میرا کلیجہ پھٹا جاتا ہے کیونکہ وہ پھٹے حال میں ہیں ہمسایوں کے بچوں کو عمدہ کپڑے پہنے ہوئے دیکھیں گے تو ان کا کیا حال ہوگا؟ اگر کسی حیلہ سے کچھ روپیہ پیدا کرتے تو میں انکو کپڑے بنوا دیتی۔"

میں نے اپنے ہاشمی دوست سے اعانت کی درخواست کی۔ اس نے ایک ہزار درہم کی سر بمہر تھیلی بھیجدی۔ عین اسی حالت میں میرے دوسرے دوست نے مجھ کو خط لکھا۔ اور وہی احتیاج ظاہر کی جس کا اظہار میں اپنے

ہاشمی دوست سے کرچکا تھا۔

میں نے وہ مہربند تھیلی اس کے پاس بھیج دی۔ اور خود مسجد میں رات بسر کرنے چلا گیا۔ کیونکہ مجھے بیوی کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی تھی۔ جب دوسرے روز گھر گیا۔ اور بیوی نے حال سنا۔ تو اس نے مجھے سرزنش کرنے کی بجائے میرے اس فعل کو پسند کیا۔

اسی حالت میں میرا ہاشمی دوست تھیلی کو اسی مہربند حالت میں لے کر آیا۔ اور کہا کہ

"سچ سچ بتاؤ۔ تم نے میری بھیجی ہوئی تھیلی کیا کی"۔

میں نے اصلی واقعہ بیان کر دیا۔ اس نے کہا۔

"جب تم نے مجھ سے اعانت کی درخواست کی تو میرے پاس اس تھیلی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ اسلئے میں نے اپنے دوسرے دوست سے اعانت کی درخواست کی۔ تو اس نے میرے پاس خود میری ہی مہربند تھیلی بھیج دی"۔

غرضیکہ ہم نے پہلے اپنی بیوی کیلئے سو درہم نکالے اور پھر باقی رقم کو باہم تقسیم کر لیا۔

اس دوستی و قربانی کے نثار جائیے۔ کہ جب امتحان و آزمائش کا وقت آیا تو ایثار و قربانی میں کوئی بھی ایک دوسرے سے کم نہ نکلا۔

آج کل کی دوستی بالعموم خودغرضی و مطلب برادی کے لئے ہوتی ہے

لاکھ درہم کی قربانی

ایک مرتبہ مامون رشید کے چچا ابراہیم نے اس کے خلاف بغاوت کردی۔ مامون رشید نے اعلان کرادیا کہ اسے گرفتار کر کے لانے والے کو ایک لاکھ درہم انعام دیا جائیگا۔

ابراہیم کو جب اس اعلان کی خبر ملی تو اس نے فوراً راہِ فرار اختیار کی۔ تاکہ کسی طرح گرفتاری سے بچ سکے۔ گرمی کا موسم اور دوپہر کا وقت تھا۔ پریشانی کے عالم میں ابراہیم ایک ایسے کوچہ میں داخل ہوگیا جو سربستہ تھا۔ نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن۔ کوچہ سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ اور پیچھے مڑنا خطرہ سے خالی نہ تھا۔

اس کشمکش میں ابراہیم کی نظر ایک شخص پر پڑی جو اس کوچہ میں اپنے دروازہ پر کھڑا تھا۔ ابراہیم نے اس سے کچھ دیر کے لیئے پناہ چاہی اس نے دروازہ کھول دیا۔ ایک مزیّن کمرہ میں اسے بٹھا کر خود باہر چلا گیا۔ ابراہیم بہت گھبرایا کہ شاید وہ پولیس کو اطلاع دینے چلا گیا ہے

تھوڑی دیر بعد وہ کچھ کھانے پینے کا سامان لایا۔ جسے دیکھ کر ابراہیم کی جان میں جان آئی۔ اس نے کہا۔

"میں حجام اور غلام ہوں۔ میرے گھر کا کھانا آپ کی شان کے شایاں نہیں تھا۔ اس لئے بازار سے لایا ہوں۔ آپ یہاں اطمینان سے رہیں۔ آپ نے اس غریب خانہ کو جو شرف بخشا ہے اس کے مقابلہ میں ایک لاکھ درہم کوئی حقیقت نہیں رکھتے۔"

ابراہیم نے اسے آفریں کہی۔ چند یوم کے بعد افشائے راز کے خوف سے اخفائے حال کیلئے زنانہ لباس میں وہاں سے نکل پڑا۔ راستہ میں اسے ایک فوجی سپاہی نے تاڑ لیا اور پکڑنے کی کوشش کی ابراہیم نے اسے دھکا دیکر گرادیا اور خود ایک گلی میں گھس گیا۔ جہاں دروازہ پر ایک عورت کھڑی تھی۔ اس سے پناہ مانگی۔ اس نے بخوشی اسے اپنے گھر ٹھہرالیا۔ تھوڑی دیر بعد وہی فوجی وہاں آنکلا۔ دراصل یہ اسی کا گھر تھا۔ پناہ دینے والی عورت اس فوجی کی بیوی تھی۔

فوجی شکار کو جال میں پھنسا دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ بیوی سے انعام کا حال بیان کیا۔ لیکن اس پاکباز عورت نے خاوند کو ایک لاکھ درہم کے لالچ میں آنے سے بمشکل روکا کہ پناہ دی جا چکی ہے اسے

گرفتار کرانے سے جو ذلت ہوگی۔ اسکے مقابلہ میں ایک لاکھ درہم ہیچ ہیں۔ خاوند مجبور ہوگیا۔ عورت نے ابراہیم کو تین دن تک پناہ دینے کی ذمہ داری لی۔

تیسرے دن ابراہیم وہاں سے نکل کر بچتا بچاتا اپنی ایک کنیز کے گھر پہنچا۔ اس نے بظاہر بڑی غمخواری اور خاطر داری کی لیکن بباطن پولیس کو اطلاع دے کر اسے گرفتار کرا دیا۔

غیروں کے مقابلہ میں اپنوں کا سلوک ملاحظہ کیجئے۔ ایک غلام حجام نے لاکھ درہم کو اس اعزاز کے مقابلہ میں ہیچ سمجھا۔ جو ابراہیم کو پناہ دینے کے باعث اسے حاصل ہوا تھا۔ ایک معمولی سپاہی کی بیوی نے اس بے عزتی پر ایک لاکھ درہم کی قربانی کو ترجیح دی جو وعدہ خلافی کے باعث ابراہیم کی گرفتاری کی صورت میں اسے اُٹھانی پڑتی۔ مگر اپنی پروردہ کنیز نے ابراہیم کو گرفتار کرا دیا۔

سبحان اللہ اُس زمانہ کے ادنیٰ طبقہ کے لوگ بھی کتنے مستغنی المزاج واقع ہوئے تھے۔ کہ زر و دولت کے ڈھیر بھی انہیں قول و اقرار کی پابندی سے منحرف نہیں کر سکتے تھے جبکہ اِس دور میں مالِ زر کے حصول میں ایمان تک بیچنے سے دریغ نہیں کیا جاتا۔

---

(۲۰)

علوم و فنون

ہے مگر اس نقش میں رنگِ ثباتِ دوام
جس کو کیا ہو کسی مردِ خدا نے تمام

علم الابدان و جراحی

ابوالقاسم علم جراحی کے موجد تھے۔ انہوں نے علم جراحی، علم ادویہ اور علم الابدان میں نئے نئے انکشافات کئے تھے۔ ابن زہرا نے سب سے پہلے دنیا کو خارش کے اسباب و علاج سے آگاہ کیا۔ محمد ابن قاسم نے امراض چشم۔ داؤد الاغربی نے تبخیر اور قبض۔ محمد تمیمی نے فتق اور رسولی۔ صلاح الدین بن یوسف نے نگاہ کے مسئلہ پہ سب سے زیادہ توجہ دی تھی۔ مختلف قسم کے انجکشن۔ زخموں کو سینے کی سوئیاں اور دھاگے ماہرین اندلس نے ایجاد کئے اور آجکل کی طرح پٹی باندھنے کے طریقہ سے دنیا کو روشناس کرایا۔ انکے معملوں اور تجربہ گاہوں میں علم الابدان کی عملی تعلیم کے لئے ہر وقت محفوظ حالت میں جانوروں اور انسانوں کی نعشیں موجود رہتی تھیں۔ ان کی ایجادات اور آلاتِ جراحی آج تک یورپ میں مقبول اور رائج ہیں۔ آج جو انجکشنوں کا دور چل رہا ہے۔ یہ مسلمانوں کا لایا ہوا ہے۔ جس سے اہل مغرب فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

علم کیمیا و ادویہ

علم کیمیا سے مسلمانوں کی دلچسپی نے انہیں دوا سازی کا موجد بنایا۔ تیزاب شورہ۔ تیزاب کبریت الکحل۔ تیزاب نوشادر۔ پوٹاشیم۔ چاندی کا پانی اور فاسفورس مسلمانوں نے ایجاد کیے۔

جابر ابنِ حیان پہلے سائنسدان ہیں۔ جنہوں نے معدنیات کے تکستد اور گاسوں کے علم سے دنیا کو روشناس کرایا۔ نمک اور شورہ کا مرکب تیزاب بنایا۔ کچلہ۔ کسیجہ۔ حب الملوک۔ املی۔ صندل۔ کباب چینی جو بیدار سنا۔ ریوند چینی اور کافور ایسے مفردات سے یورپ کو آگاہ کیا۔

علم ادویہ پر اتنی توجہ دی جاتی تھی۔ جتنی آج کل ملکی دفاع پر دی جاتی ہے۔ ہر بڑے شہر میں علم الادویہ کی تجربہ گاہیں اور دوا سازی کے سرکاری کارخانے موجود تھے۔ جن میں سرکاری عمال کی زیر نگرانی دوائیاں تیار ہو کر ہسپتالوں اور دواخانوں کو مہیا کی جاتی تھیں۔ اس امر کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا۔ کہ کوئی دوائی غلط طور پر تیار نہ ہو جائے۔ جس سے صحتِ عامہ پر برا اثر پڑے۔

جسمِ انسانی کی تشریح۔ امراضِ چشم۔ علم تولید۔ چیچک۔ خسرہ اور مختلف بخاروں اور بیماریوں پر الگ الگ سینکڑوں کتابیں تصنیف ہو چکی تھیں۔

انہوں نے نباتات یعنی پودوں کے خواص معلوم کرنے پر بھی خاص توجہ دی۔ ابن العوام نے اپنی کتاب میں چھ سو ایسی بوٹیوں کا نام لکھا ہے۔ جن سے مختلف دوائیاں تیار ہوتی تھیں۔ ابن بیطار نے جڑی بوٹیوں سے تین سو دواؤں کے نسخے تیار کیے۔ اور ابن السواری نے تو ذاتی تجربوں کے بعد ایسی بوٹیوں کی تصویریں چھاپ دیں۔ جو دواؤں کے کام آ سکتی تھیں۔

علمِ طب کے طلبار کو نظری تعلیم کے علاوہ شاہی تجربہ گاہوں میں عملی تعلیم بھی حاصل کرنی پڑتی تھی۔ اور اس وقت تک کسی کو سند نہ ملتی تھی جب تک کہ وہ متعلقہ فن کی جزئیات تک سے پورا واقف نہ ہو جائے۔ کند ذہن۔ نکمے اور بے حس طلبار کو دوا سازی یا علاج کی ممانعت ہوتی تھی۔

اس دور میں مسلمان اس شعبہ میں خال خال نظر آتے ہیں جس کی وجہ سے پاکستان میں ڈاکٹروں کی کمی ہے۔

علمِ سائنس

علمِ سائنس میں اولیت کا سہرا مسلمانوں کے سر رہا ہے۔ قرطبہ اشبیلہ اور غرناطہ کی یونیورسٹیوں کی عمارتیں خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھیں۔ ان کی تجربہ گاہیں اور معملوں کا سامان عجائبات کی حیثیت رکھتا تھا۔ اُن میں ایسے درجنوں کمرے موجود تھے جن کی لمبائی اور چوڑائی سو سو فٹ تھی۔

ہر پروفیسر اور ماہرِ فن کی تجربہ گاہ الگ اور خصوصی ہوتی۔ جو شاہی محل کا درجہ رکھتی تھی۔ تمام ضروری سامان حکومت مہیا کرتی تھی اور سائنس دانوں کی حوصلہ افزائی کے لئے خزانہ کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ صرف سائنس کی ضروریات پوری کرنے کے لئے شاطبہ کے عظیم الشان کاغذ ساز کارخانے پورے چوبیس گھنٹے چلتے رہتے تھے۔ جبکہ سارے یورپ میں کاغذ کا ایک ورق بھی تیار نہ ہوتا تھا۔

سائنس کی تحقیقات۔ انکشافات اور ایجادات کے سلسلہ میں باقاعدہ طور پر ہفتہ وارہ۔ ماہوارہ۔ دو ماہی۔ سہ ماہی۔ ششماہی اور سالانہ روئیدادیں چھاپی جاتی تھیں۔ جن کی ایک ایک کاپی ہر سائنسدان سرکاری ادارہ اور کتب خانہ کو بھیجی جاتی تھی۔

الناصر۔ منصور اور الحکم ثانی کے دور میں بعض سائنسدانوں کی تجربہ گاہیں شاہی محلات سے زیادہ وسیع اور شاندار ہوتی تھیں۔ اور سائنس والوں کا بادشاہِ وقت سے زیادہ احترام کیا جاتا تھا۔ ایسی ہی بغداد۔ مراغہ۔ سمرقند۔ اصفہان۔ دمشق اور مصر کی بڑی بڑی رصدگاہیں تھیں۔

الخازن یا الہثیم نے دنیا میں پہلی بار شفق جو کے ثقلِ نوعی اور پتھر کے متعلق انکشافات کئے۔ بندوق بارود۔ بحری جہاز۔ بادنما آلہ فانوس۔ دوربین۔ کرے۔ گھڑیاں۔ قطب نما۔ مقیاس الحرارت۔ اصطرلاب۔ جرِ ثقیل۔ مساحت۔ کیمیا اور موسیقی کے آلات۔ مختلف قسم کے ترازو۔ کاغذ۔ کرسیاں۔ زربفتی اور ریشمی کپڑے۔ صابن۔ طلسمی پیالے وغیرہ سب مسلمانوں کی ایجادیں ہیں۔ جو آج اہلِ مغرب سے منسوب کر کے مسلمانوں کو علمِ سائنس کا مخالف ظاہر کیا جاتا ہے۔

علمِ جغرافیہ

عرب جغرافیہ دانوں نے اس سلسلہ میں بڑی محنت و کاوش کی تھی۔ انہوں نے نہ صرف اندلس کا جغرافیہ مرتب کیا۔ بلکہ اس وقت جس قدر یورپ اور ایشیا کا علاقہ معلوم ہو چکا تھا۔ اس کی جغرافیائی معلومات بھی مرتب کیں۔ ساٹھ جغرافیہ دانوں نے اس علم کے متعلق اعلیٰ درجہ کی تصنیفات مرتب کیں۔ جغرافیئی درجے قائم کیے۔ پیمائش ارض کے بعد ریشم کے کپڑوں پر اعلیٰ درجے کے نقشے اس عمدگی سے تیار کیے کہ وہ اب تک صحیح مانے جاتے ہیں۔

ابن حمید ادریسی اور ابن جبیر نے صرف علم جغرافیہ کے لیے دنیا بھر کی سیاحت کی۔ عبید البکری نے اسی سلسلہ میں اپنی آدھی زندگی گزار دی۔ ابن بطوطہ اس فن کی خاطر چوبیس برس تک دنیا کا سفر کرتے رہے بعض روایات کے مطابق ادریسی نے ہی امریکہ کا پتہ لگایا تھا۔ یہ اپنی سیاحت کے دوران میں جہاں جہاں پہنچا۔ ان تمام ملکوں کے طول

وعرض کا حساب لگایا۔

ادریسی ہی دنیا کے سب سے بڑے جغرافیہ دان تھے انہوں نے ہی دنیا کا سب سے پہلا صحیح جغرافیہ تیار کیا۔ اس کے ساتھ جو نقشے لگائے وہ تین سو سال تک بطور سند استعمال ہوتے رہے۔ جن کی صحت کا آج تک انکار نہیں کیا گیا۔ ایک چاندی کا ایسا کرہ تیار کیا۔ جس میں زمین کے چپہ چپہ کا پتہ دیا گیا۔ دوسرے کرے پر جو ساڑھے پانچ من وزنی تھا۔ زمین و آسمان کی ہر کیفیت درج تھی۔ اس کے ایک طرف ستارے اور برج بنے ہوئے تھے۔ اور دوسری طرف خشکی و تری کے تمام زمینی حصے ظاہر کئے گئے تھے اور ایسے اسطرلاب بنائے جن کے ذریعہ سو شہروں کا طول بلد معلوم کیا جا سکتا تھا۔

سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ کے امرِ الٰہی پر ان جغرافیہ دانوں نے ایسے وقت میں عمل کیا جبکہ سفر بہت دشوار گذار تھا۔ اخراجاتِ سفر برداشت کرنے کے لئے کہیں بھی ایسے ادارے موجود نہ تھے۔ جیسے آجکل یورپ اور امریکہ میں موجود ہیں۔

دورِ حاضرہ کے مسلمانوں نے اس سلسلہ میں کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں کیا۔ نہ اب وہ جذبہ اور ہمت نظر آتی ہے۔

علمِ تاریخ

فنِ تاریخ کا آغاز امیر معاویہ کے زمانہ سے شروع ہوا۔ عمر بن عبدالعزیز کے زمانہ سے اس نے کتابی شکل اختیار کی اور مسلمانانِ اندلس نے اسے عروج پر پہنچایا۔ اس زمانہ میں مورخوں کی حیثیت اخبار نویسوں جیسی تھی۔ فکرِ معاش سے آزاد ہو کر دل جمعی سے کام کرنے کے لیے انہیں باقاعدہ طور پر سرکاری خزانہ سے تنخواہیں ملا کرتی تھیں۔ کتاب مرتب ہونے پر مسرت افزائی کے لئے انہیں گرانقدر انعامات سے نوازا جاتا تھا۔

اس زمانہ میں تاریخ نویسی پر خصوصی توجہ کا یہ نتیجہ نکلا کہ ہر مقام ہر شہر اور شاہی دربار میں واقعہ نگار موجود رہتے تھے۔ اور ہر واقعہ پوری چھان بین اور ذاتی تحقیق و تفتیش کے بعد ضبطِ تحریر میں لاتے تھے۔ ان میں سے ابن احمد طلیطلی۔ خزاجی۔ النضرابی۔ الحجاری۔ ابن بشکوال۔ محمد اور لسان الدین ابن خطیب بہت مشہور مورخ گزرے ہیں۔

مورخین میں شاہانِ وقت بھی شامل تھے بطلیوسں کے بادشاہ ابن افطس نے اندلس کی ایک بہت بڑی مستند تاریخ لکھی تھی۔ خلیفہ الحکم ثانی نے ایک ایسی بلند پایہ تاریخ مرتب کی تھی۔ جو صدیوں ممتاز رہی۔ ویسے اندلس کے مسلمانوں نے علمِ تاریخ پر بارہ ہزار کتابیں لکھیں جن میں سے بعض نے غیر معمولی شہرت پائی۔

ان باہمت مورخوں نے جانوروں تک کی تاریخ لکھ ڈالی۔ ابو المنذر بلنسی اور ابن زید نے گھوڑوں کی تاریخ لکھی اور عبدالملک نے اونٹوں کی تاریخ تحریر کی۔ بن جبرائیل اور ابن رشد نے سب سے پہلے اپنی کتب میں یہ نظریہ پیش کیا کہ قانونِ ارتقا کا اثر حیوانات نباتات اور جمادات پر یکساں موجود ہے جس پر ڈارون نے اپنے شہرہ آفاق نظریہ کی بنیاد رکھی۔ یہ اس کا نظریہ نہ تھا۔ بلکہ انہی فلسفیوں کی موشگافیوں کا مرہونِ منت تھا۔

مسلمانوں نے اَسَاطِیرُ الْاَوَّلِیْنْ پر ہزاروں کتابیں لکھیں۔ مگر انہیں سرمایہ عبرت وبصیرت نہ بنایا۔

علمِ ریاضی

ریاضی کے میدان میں اندلسی مسلمان گوئے سبقت لے گئے۔
انہوں نے

ستاروں کی رفتار معلوم کی۔ ان کے جدول تیار کئے سورج کے مدار کی دوری دائرۃ البروج کا تدریجی ارتقا یا انحراف اور دن رات میں اعتدال کی صحیح قدر مقرر کی۔ کسور اعشاریہ کے قواعد بنائے۔ الجبرا میں نئی نئی باتیں معلوم کیں جیب ہندسی ایجاد کیا۔ قاعدہ مساوات مکعبی۔ اور مساحت المثلثات ان ہی کی ایجاد ہے۔

اشبیلی اور زرقل اس فن کے امام تھے۔ انہوں نے اس فن کو بہت ترقی دی۔ زرقل نے مدار النجوم کے لئے بیضوی راستہ تجویز کیا۔ اس عالم بے مثل نے آفتاب کے بُعدِ اقصیٰ کی حرکت معلوم کرنے کے لئے چار سو دو تجربے کئے

اس نے اپنی رصد گاہ میں ان مشاہدات پر جتنی محنت کی۔ کسی اور نے نہیں کی۔

ابوالحسن علی نے نوسو مشاہدات کئے۔ ابن سینا نے جو فہرست تیار کی۔ اس میں ایک ہزار بائیس ستاروں کے نام لکھے۔ ابن ابی صلت تیس سال تک سیاروں کی رفتار معلوم کرنے میں لگے رہے۔

مسلمان ریاضی و سائنس دانوں نے جو کرہ ارضی و سماوی بنائے وہ اپنی مثال آپ تھے۔ ان میں پانچ صد جدولیں ہوتیں جو دونوں طرف کھودی جاتیں۔ نیچے کے حصہ میں گیارہ عدد نقش ہوتیں۔ اوپر کے حصے میں برجوں کی علامتیں بنی ہوتیں کہکشاں کی طرف اشارے ہوتے اور بڑے بڑے ستاروں کے نام لکھے ہوتے"۔

آفتاب کی رفتار معلوم کرنے کیلئے ابن یونس نے دھوپ گھڑی اور کلاک ایجاد کئے۔ بلکہ بعض نے پانی کی گھڑیاں۔ آب پیما۔ آلات منظر کواکب اور ترجیعات ایجاد کئے۔ بر قسطہ کے بادشاہ معتدر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے وقت کے سب سے بڑے سائنسدان اور ریاضی دان تھے۔

آجکل مسلمانوں میں اس علم کا شوق نظر نہیں آتا۔ اسلئے اکثر طلبا آرٹس کو ترجیح دیتے ہیں۔

تعلیم و تربیت

اہل اندلس نے علم کو جس معراج پر پہنچایا تھا۔ اس معیار پر آج یورپ اور امریکہ بھی نہیں پہنچ سکے۔ اس وقت تعلیم کے سب سے بڑے مرکز قرطبہ۔ اشبیلیہ اور غرناطہ تھے۔ دوسرے درجہ پر طلیطلہ۔ سرقسطہ۔ ملاغہ المیریا۔ بلنسیہ۔ شاطبہ وغیرہ تھے۔ ہر ضلع تحصیل میں اعلیٰ درسگاہیں اور ہر بڑی بستی میں ثانوی تعلیم کا اہتمام تھا۔

بارھویں صدی عیسوی میں صرف قرطبہ میں ایک ہزار بڑی درسگاہیں اور تعلیمی ادارے تھے۔ جہاں دس ہزار سے زائد ماہرین تعلیم ہر وقت موجود رہتے تھے۔ ان میں یگانۂ روزگار ابن رشد۔ زرقلی، بغدادی اسحاق۔ ابن حنین۔ اشبیلی۔ ابوالحسن علی۔ ابن ابی صلت۔ ابن یونس الخازن۔ جابر کوفی۔ جابر ابن افلح۔ داؤد القرطبی۔ ابوالقاسم۔ ابن زہر ابن سعید الخطیب۔ ابن وافد اور محمد التمیمی بھی تھے۔ جن کا ثانی آج تک پیدا نہیں ہوا۔

اس وقت یونیورسٹیوں میں قرآن۔ حدیث۔ تفسیر۔ فقہ۔ ہندسہ۔ طب۔ موسیقی۔ نظم ونثر۔ ادویہ سازی۔ جراحت۔ نجوم۔ سائنس۔ زراعت اور باغبانی کی تعلیم دی جاتی تھی۔

قرطبہ یونیورسٹی کے صرف مقامی کالجوں میں گیارہ ہزار طلبار روزانہ تعلیم پاتے تھے۔ ان میں یہودی۔ عیسائی اور غیر اندلسی یورپی بھی تھے ہر ایک طالبعلم سے یکساں سلوک ہوتا تھا۔ ان میں کوئی تفریق یا امتیاز نہ برتا جاتا تھا۔

امرار کے بچوں کے علاوہ ہر طالب علم کو کتابیں مفت ملتی تھیں غیر مقامی طالب علموں کی رہائش۔ خوراک۔ پوشاک کا مفت انتظام تھا۔ طلبار شاہی مہمان تصور کئے جاتے تھے۔ اندلس کے ساڑھے تین کروڑ باشندوں میں سے ایک بھی ان پڑھ نہ تھا۔ ہر شخص لکھنا پڑھنا جانتا تھا۔ شاہی انتظام کے علاوہ امرا کی طرف سے بھی اپنے اپنے گاؤں اور شہروں میں درسگاہیں کھلی ہوتی تھیں۔

لیکن اس دور میں ارباب اقتدار تعلیم کو اس لئے عام نہیں کرتے کہ لوگوں میں شعور پیدا ہونے سے ان کی اقتدار کی گدیاں خطرے میں پڑ جائیں گی۔

تصنیف و تالیف

اس میدان میں مسلمانوں نے وہ جولانیاں دکھائیں کہ اہل مغرب حیران رہ گئے۔ حافظ جمال الدین نے اس قدر کتابیں لکھیں کہ ان کی عمر کے حساب سے نو صفحے روزانہ اوسط آتے ہیں۔ ابن خطیب نے فلسفہ تاریخ اور علم طب پر گیارہ سو۔ ابن حبیب اسلمی۔ ابومروان اور عبدالملک نے ہزار ہزار۔ ابن حسن نے فلسفہ و قانون پر ساڑھے چار چار سو۔ ابن خرم۔ ابن مانی اور امام غزالی نے چار چار سو۔ شیخ ابن جوزی نے اڑھائی سو۔ ابوعبید اور ابن ہشیم نے دو دو سو کتابیں لکھیں۔

ابن عساکر کی تاریخ دمشق اسّی جلدوں میں مکمل ہوئی۔ ابو حنیفہ دینوری نے کتاب النبات ساٹھ جلدوں میں ختم کی۔ المظفر شاہ بطلیوس نے عربی زبان میں ایک انسائیکلوپیڈیا مرتب کی۔ جو پچاس جلدوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ سبط بن جوزی کی "مرأت الزمان" اور امام غزالی کی تفسیر "یاقوت التاویل" چالیس چالیس جلدوں پر مشتمل تھیں

علامہ ابوالفرح اصفہانی کی تصنیف "آغانی" بیس جلدوں کی ہے الحکم خلیفہ اندلس نے چار ہزار میں خریدی تھی۔ ابن رشد نے طبی سائنس پر سولہ کتابیں لکھیں۔ تاریخ بغداد چودہ جلدوں کی اور تاریخ ابن اثیر بارہ جلدوں کی ہے۔

غرضیکہ مسلمانوں نے جس فن کو بھی سنبھالا اسے معراج ترقی پر پہنچا دیا۔ جس کی وجہ سے مسٹر جوزف میکب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ

"اگر اسلامی تعلیمات ہم تک بروقت پہنچ چکی ہوتیں اور فرانس کے عیسائی بادشاہ مسلمانوں کو یورپ میں داخل ہونے سے نہ روک دیتے۔ تو آج نہ صرف ہم بلکہ تمام بنی نوع انسان ۵۰۰ برس پہلے ہر شعبہ علم و فلسفہ میں ترقی کر چکے ہوتے۔ ان نقصانات کی تلافی ہم دو دھو کر کسی طرح نہیں کر سکتے۔"

تصنیف و تالیف کے میدان میں بھی اب وہ رونق نظر نہیں آتی۔

کتب خانے

از منۂ قدیم میں ہر یونیورسٹی کے ساتھ بڑے بڑے کتب خانے ہوتے تھے۔ جن میں ہر مضمون کی کتابیں نہایت ترتیب سے جمع رہتی تھیں اور کوئی مضمون ایسا نہ ہوتا تھا جس پر ہزاروں کتابیں موجود نہ ہوں۔

طرابلس (شام) کے کتب خانہ میں تین لاکھ۔ ماموں رشید کے کتبخانہ بغداد اور عزیز باللہ کے کتب خانہ مصر میں دس دس لاکھ۔ خلیفہ الحکم کے کتب خانہ قرطبہ اور کتب خانہ مراغہ میں چار چار لاکھ۔ شاہ الحکم بامراللہ کے کتب خانہ میں ایک لاکھ اور المیریا کے وزیر اعظم ابن عباس کے ذاتی کتب خانہ میں ایک لاکھ سے اوپر کتابیں موجود تھیں۔ جن میں بعض نوادارات میں شمار ہوتی تھیں۔ ان میں اکثر کتابیں فنی اور اونچے درجہ کی تھیں۔ جن کی تزئین اور جلد بندی کے لئے سینکڑوں آدمی روزانہ کام کرتے تھے۔

اس وقت یہی کتب خانے دارالاشاعت کا کام دیتے تھے ایک ایک کتب خانہ میں ہزاروں خطاط اور خوش نویس روزانہ کام کیا کرتے

تھے۔ جیسے کوئی نئی کتاب تصنیف ہوتی۔ یہ فوراً اسے نقل کرنا شروع کر دیتے اور ہزاروں کی تعداد میں نقل کرنے کے بعد ملک کے طول و عرض میں پھیلا دی جاتیں شاہی کتب خانہ میں جو یونیورسٹیوں کے کتب خانہ سے بالکل الگ تھا۔ ایک وقت میں پانچ ہزار خطاط کام کرتے تھے۔ جن کی شب و روز کی محنت سے ملک بھر کے علما، صاحبِ ذوق اور کتبخانے استفادہ کرتے تھے۔

الحکم ثانی کے زمانہ میں قرطبہ میں بیس ہزار دکانیں ایسی تھیں جو صرف کتب فروشی کیلئے مخصوص تھیں۔ جو کتابیں وہاں بکتی تھیں۔ ان کی جلدیں مطلّا اور مذہب ہوتی تھیں اور بعض کی جلدوں میں خوشبودار لکڑی بھی استعمال ہوتی تھی۔ ویسے ملک بھر میں ایک لاکھ سے کم کتب فروش نہ تھے اور کروڑوں کتابیں فروخت ہوا کرتی تھیں۔

کتابوں کے انتخاب میں کوئی سختی نہیں برتی جاتی تھی۔ ہر ملک۔ ہر قوم۔ ہر مذہب۔ ہر خیال اور ہر موضوع کی کتابیں کتب خانوں میں آتی تھیں منصور ابن عامر کے سرکاری کتب خانوں میں ہزاروں کتابیں دہریت اور خلاف اسلام فلسفہ کے متعلق موجود تھیں۔ ان کتب خانوں میں مترجم موجود رہتے تھے۔ انہیں اختیار تھا کہ جو مفید کتب دیکھیں۔ اس کا فوراً ترجمہ شروع کر دیں۔ پریس کے زمانہ میں یہاں کہیں بھی ایسے حالات دکھائی نہیں دیتے۔

تعمیری عجائبات

مسلمانوں نے اپنے وقتوں میں فن تعمیر میں ایسی ایسی عجائب کاریاں دکھلائیں کہ دیکھنے والے حیران و ششدر رہ جاتے تھے

عباسی خلیفہ مقتدر باللہ نے اپنے لئے ایک خاص محل بنوایا تھا۔ اس کے اندر ایک بہت بڑا حوض تھا۔ جس میں سونے چاندی کے مصنوعی درخت لگے ہوئے تھے۔ ان کی ہر ہر شاخ اور اس کے پتے جواہر اور موتیوں سے تیار کئے گئے تھے۔ جن میں جواہرات کے میوے اور پھل لگے ہوئے تھے۔ ان درختوں کی شاخوں پر سونے چاندی کے پرندے اس عمدگی سے بٹھلائے گئے تھے کہ جب ہوا چلتی تو یہ سارے پرندے چہچہانے لگتے اور ان سے دلنواز و دلفریب آوازیں پیدا ہوتیں۔ حوض کے چاروں طرف بندرہ مرد گھوڑے سواروں کے مجسمے اس طرح کھڑے تھے کہ سب ریشمی لباس پہنے شمشیر بکف تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ابھی ایک

دوسرے سے برسرپیکار ہوتے ہیں۔ اور دیکھنے والا انہیں اصل سمجھنے لگتا۔

اندلسی خلیفہ عبدالرحمن الناصر نے قرطبہ سے چار میل کے فاصلہ پر قصر الزہرار کی تعمیر شروع کرائی جس کی تکمیل اس کے بیٹے الحکم نے کی۔ اس عمارت کی تکمیل پر دو کروڑ اشرفیاں خرچ آئیں۔ یہ محل ۲۷۰۰ گز لمبا ۱۵۰۰ گز چوڑا تھا۔ اس میں سفید اور سبز پتھر کے ۴۲۰۰ ستون تھے عجیب وغریب قسم کے سنہرے اور روپہلے حوض تھے۔ ان کے خانوں میں شیر۔ ہرن۔ تیندوا۔ اژدہا۔ عقاب۔ ہاتھی۔ کبوتر۔ نیز ان میں مور۔ مرغ اور گدھ کے سرخ سونے کے مجسمے بنے ہوئے تھے جو بیش بہا موتیوں سے آراستہ تھے اور ان کے منہ سے پانی نکلتا رہتا تھا۔ اس محل کے وسط میں ایک بڑی مسجد تھی۔ جس کے تالاب میں ہر قسم کی مچھلیاں رہتی تھیں۔

اسی طرح قصر الحمرا کی دیواریں مسلمانوں کی فرامین نبانے اور پچی کاری کی عروج کی داستان بیان کر رہی ہیں۔ اس کے ستونوں میں سنگ مرمر بہت کم استعمال کیا گیا۔ مگر کوئی ایسا مصالحہ استعمال کیا جس کی وجہ سے ان کے حسن ولطافت کو کوئی دوسرا ستون نہیں پہنچ سکا۔ اس کی چھتیں بھی ویسی ہی حسین تھیں۔ جن میں ہاتھی دانت کا

کام اور سونے چاندی کے تار استعمال ہوئے ہوئے تھے۔ ستونوں پر سونے کی پتریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کی دیواروں پر ایک سو باون نمونہ کے ایسے بیل بوٹے بنے ہوئے تھے جو رنگ و روغن میں ایک دوسرے سے بالکل مختلف تھے۔ اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہوا کے ایک ہلکے سے جھونکے سے اڑ جائیں گے۔ یہ حسین و لطیف اور نرم و نازک بیل بوٹے صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ویسے کے ویسے موجود ہیں۔ اس کے حسین محراب۔ دلفریب جالیاں منقش دیواریں ایک سدا بہار باغ کا سماں دکھاتی تھیں جس کے متعلق ایک مسلمان مورخ نے اسے دیکھنے کے بعد یہ رائے قائم کی تھی کہ ایسی حسین عمارت نہ آج تک بنی ہے اور نہ کبھی بنے گی۔ یہی حالت ہے "تاج ہندوستان" کے تاج محل کی ہے۔

گو ان تاریخی عجائبات پر مسلمانوں کا اربوں روپیہ خرچ ہوا۔ جو بعض کے نزدیک اسراف ہے۔ مگر یہ اس گم گشتہ راہ قوم کے ذہنی عروج اور فنی ارتقا کی زندہ جاوید تاریخ کا کام دے رہے ہیں۔

(۲۱)

خوف و خشیّت

تو اگر اپنی حقیقت سے خبردار رہے

نہ سیہ روز رہے پھر نہ سیاہ کار رہے

خشیتِ ایزدی

سیدالبشر، وجہ موجودات۔ رحمۃ اللعالمین کو عمر بھر قیامِ شب اور تہجد گزاری کی عادت رہی۔ نوافل پڑھتے پڑھتے قدم مبارک متورم ہو جاتے تھے۔ دن بھر ستر سے سو بار استغفار فرمایا کرتے تھے دل ہر وقت خشیتِ ایزدی سے لبریز رہتا تھا۔ فرمایا کرتے تھے۔ کہ اے اللہ میرے کان۔ میری آنکھ۔ میرا گوشت۔ میرا خون اور میری ہڈیاں رب العالمین کی خشیت سے معمور ہو گئیں۔ میرے اگلے اور پچھلے۔ ظاہر و باطن گناہوں کو بخش دے اور میری زیادتیوں سے درگزر فرما۔

حق تعالےٰ نے اس حالت پر رحم کھا کر فرمایا کہ ہم نے آپ پر قرآن مجید اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ مشقت میں پڑیں۔

لوگوں نے وجہ پوچھی۔ فرمایا کہ میں آپ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں۔

معصومِ مجسم کی تو یہ حالت تھی۔ اور ہم سراپا عصیاں بے خوف پھر رہے ہیں۔

رحم کا متلاشی

دنیا تے اسلام میں، صرف حضرت عمرؓ کو ہی یہ شرف حاصل ہوا کہ انہیں خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے حق تعالیٰ سے مانگ کر لیا۔ ان کے قول و فعل کی تائید میں اللہ جل شانہ نے آیات نازل فرمائیں۔ بقول خاتم النبیینؐ اگر دنیا میں کوئی دوسرا نبی آنا ہوتا۔ تو وہ حضرت عمرؓ ہی ہوتے اور بقول دشمنانِ اسلام اگر ایک عمرؓ اور پیدا ہو جاتا تو تمام کرۂ زمین پر اسلام پھیل جاتا۔

پابندیٔ احکامِ اسلام میں جن کا یہ مقام تھا کہ خلافِ شرع عمل پر اپنے لختِ جگر کی دھجیاں مجمع عام میں اُڑا دیں اور اُف تک نہ کی۔ عشقِ رسولؐ میں جن کا یہ مقام تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کی جب خبر سنی۔ تو تلوار کھینچ کر آ گئے کہ جس نے کہا کہ حضور وصال فرما گئے ہیں۔ اس کی گردن اڑا دی جائیگی۔ دار الآخرت میں جن کا یہ مقام تھا کہ مخبرِ صادق نے وہاں جانے سے بہت پہلے انہیں داخلۂ جنت کی بشارت دیدی مگر ان کے مقامِ عبدیت کا اس وقت پتہ لگا۔ جب موت کا فرشتہ انہیں دنیا کے اندیشوں اور دین کی فکروں سے آزاد کرانے کیلئے آیا تو انہوں نے

دارالبقار کو سدھارنے سے قبل اپنے صاحبزادہ حضرت عبداللہؓ سے فرمایا

"میرا چہرہ زمین پر رکھ دے کہ خدا مجھ پر مہربان ہو جائے اور رحم کرے"

جو خدمتِ دین و اسلام کا اس قدر لاثانی اعمال نامہ رکھتے ہوں ان کا دمِ واپسیں ایسی عاجزی و انکساری اور خوف و خشیت کا اظہار اور اس کی عظمت و جلال کا استحضار ساری دنیا کے لئے درسِ عبرت ہے کہ خواہ کوئی کتنا عابد، زاہد، نیک اور صالح ہو۔ اسے اپنے اعمال پر نازاں نہیں ہونا چاہیئے۔ نہ ان پر انحصار کرنا چاہیئے۔ کیا خبر کہ وہ عند اللہ مقبول بھی ہیں۔ نیز اعمالِ صالحہ کے بعد ہمیشہ اس کے فضل اور اپنی عاجزی پر نظر رکھنی چاہیئے۔

اسی طرح ان کو بھی اعمالِ صالح کی فکر سے بے فکر نہ ہونا چاہیئے جو مال و دولت کے سرور اور طاقت اور حکومت کے غرور میں مبتلا ہو کر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ان کے مقبول ہونے کی علامت ہے۔ کیا خبر کہ اللہ تعالےٰ نے انہیں آزمائش میں ڈالنے اور اپنی خوشنودی سے محروم کرنے کے لئے ایسا کر رکھا ہو۔

نیز ان کو بھی اپنے مقام و انجام پر نگاہ رکھنی چاہیئے۔ جو نہ صرف نیکیوں سے گریز کرتے ہیں۔ بلکہ عمداً احکامِ اسلام کی مخالفت کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں۔

خوفِ قیامت

حضرت عمر بن عبد العزیز نے خلافت سنبھالنے کے بعد اصلاح کا
کام اپنے خاندان سے شروع کیا اور جن کو پہلے بادشاہوں کی طرف
سے جاگیریں اور عطیے ملے ہوئے تھے۔ ان میں سے بقدر ضروریاتِ
زندگی چھوڑ کر باقی حصہ ضبط کر لیا کیونکہ مسلمانوں کی حق تلفی کر کے اقربا
نوازی کے طور پر بغیر کسی استحقاق جائز کے انہیں یہ عطیے اور جاگیریں
دی گئی تھیں۔

خلیفۂ وقت کے اس اقدام سے ان کے خاندان میں ناراضی
کی لہر دوڑ گئی۔ ان کی پھوپھی نے خاندان والوں کی وکالت کرتے ہوئے
ان سے کہا۔

پہلے خلفاء جو ہم کو عطیہ دیتے تھے اور ہمارے مراتب کا خیال
رکھتے تھے۔ آپ نے ان کو اس سے محروم کر دیا ہے ان
کے قدیم حقوق رہنے دیتے اور ان سے غیروں کی دی ہوئی

روٹی نہ چھینتے۔"

خلیفہ نے کہا۔

"میں نے ان کا کوئی حق نہیں روکا۔"

پھپھی بولی۔

"سب لوگ آپ کے مخالف ہو رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ وہ تمہارے خلاف بغاوت نہ کر دیں۔"

انہوں نے جواب دیا۔

"اگر میں قیامت کے سوا کسی اور دن سے ڈروں تو خدا مجھے اس کی برائیوں سے نہ بچائے۔"

اس کے بعد ایک اشرفی۔ گوشت کا ایک ٹکڑا اور ایک انگیٹھی منگائی اشرفی کو آگ میں ڈال دیا۔ جب وہ سرخ ہو گئی۔ تو اسے نکال کر گوشت کے ٹکڑے پر رکھ دیا۔ جس سے وہ جل بھن گیا۔ پھر پھپھی سے فرمایا۔

"اپنے بھتیجے کیلئے اس قسم کے عذاب سے پناہ نہیں مانگتی؟"

خلیفہ نے اپنوں کا حق نہیں کھایا تھا بلکہ انہیں دوسروں کا حق کھانے سے روک کر ان سے بھلائی کی تا کہ آخرت میں ان کی رسوائی نہ ہو۔

پھپھی اس عملی مثال سے متاثر ہو کر خاموش رہ گئی۔

خوفِ خدا و آخرت کے بغیر کسی نظام کی اصلاح ممکن نہیں۔

اربابِ خشیّت

محمد بن سیرین بصرہ کے سب سے بڑے متورع فقیہ، فاضل حافظ متقن اور معبرِ خواب تھے۔ یہ جامع العلم والعمل، عین التزین تعبیر کا کام کرتے تھے۔

بہت ہی خوش طبع اور صاحبِ ذوق ہونے کے باوجود ان کا دل ہروقت خشیتِ الٰہی سے لبریز رہتا تھا جب بھی ان کے سامنے موت کا ذکر آتا۔ ان پر موت کی سی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اور ہر عضو بدن مرجھا جاتا تھا۔

یونس کا بیان ہے۔

ابن سیرین ہنس مکھ اور بہ مذاق آدمی تھے۔ لیکن گدازِ قلب اور خشیتِ الٰہی کا یہ حال تھا۔ کہ جلوت میں ان کے لب ہنستے رہتے تھے۔ اور خلوت میں ان کی آنکھیں اشکبار رہتی تھیں۔

ہشام بن حسان ان کی نسبت کہتے ہیں۔

ایک مرتبہ ہم لوگ ابن سیرین کے ساتھ مقیم تھے۔ دن کو ان

کو ہنستے دیکھتے اور رات کی تاریکی میں ان کے گریہ کی آواز سنتے تھے۔

مشہور تابعی ربیع بن خثیم کی یہ حالت تھی کہ ایک دن لوہار کی بھٹی سے گزر رہے تھے۔ بھٹی کی دہکتی ہوئی آگ کو دیکھتے ہی دوزخ کی آگ کا جو تصور کیا، وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ دوزخ کے ذکر پر اس قدر روتے تھے کہ ریش مبارک تر ہو جاتی تھی۔

شیخ الاسلام سلیمان بن طرخان تیمی کی یہ حالت تھی کہ خدا کا خوف انکی رگ رگ و پے میں جاری و ساری رہتا تھا۔ چالیس سال تک انہوں نے عشاء کے وضو سے صبح کی نماز پڑھی۔ کسی نے آپ سے کہا کہ آپ کی مثل کون ہو سکتا ہے۔ فرمایا۔

"ایسا نہ کہو۔ مجھے معلوم نہیں۔ میرا رب میرے ساتھ کیا معاملہ کریگا"

خشیت الٰہی ہی تمام اعمالِ حسنہ کا سرچشمہ ہے۔ ساری دنیا سر جوڑ کر بیٹھ جائے اور دنیا سے خرابیوں کو دور کرنے کے لئے امکان بھر قوت و طاقت خرچ کر ڈالے۔ مگر وہ اس وقت تک کامیاب نہ ہو سکینگے جب تک لوگوں کے دلوں میں خوفِ خدا اور روزِ حساب پیدا نہ ہو۔ یہ صفت صرف تعلیمِ دین اور اہل اللہ کے فیضِ صحبت سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ مگر اس طرف کسی کی توجہ نہیں۔

خوفِ آخرت

خاندانِ غلاماں کا مشہور عادل اور رحم دل بادشاہ سلطان شمس الدین التمش خواجہ قطب الدین بختیار کاکی قدس سرہٗ کے مریدانِ باصفا میں سے تھا۔ ان کی نسبت خود ان کے شیخ فوائد السالکین میں فرماتے ہیں۔

"اس (التمش) کا اعتقاد صحیح تھا۔ راتوں کو وہ جاگتا۔ کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا۔ وہ بیدار رہ کر عالم تحیّر میں کھڑا رہتا اور اگر سو جاتا۔ تو فوراً بیدار ہو جاتا۔ اُٹھ کر وضو کرتا۔ اور مصلّیٰ پر جا بیٹھتا۔ اپنے نوکروں میں سے کسی کو نہ اُٹھاتا اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو تکلیف کیوں دی جاوے

ایک رات وہ میرے پاس آیا۔ اور میرا پاؤں پکڑ لیا۔ میں نے کہا کہ۔

"مجھ کو کب تک تکلیف پہنچاتے رہو گے جو ضرورت ہو بیان کرو۔"

اس نے کہا۔

"رب العزت نے مجھ کو مملکت تو دی ہے لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے باز پرس ہوگی۔ اور اس کا حساب دینا ہوگا اس وقت بھی آپ مجھے نہ چھوڑیں۔"

وہ اس وقت تک واپس نہ گیا جب تک کہ میں نے اسکی بات قبول نہ کر لی۔

اتنے بڑے بادشاہ کی شب بیداری۔ ملازموں تک سے ایسا حسن سلوک کہ خود وضو کا سامان کر لینا اور ان کی نیند میں خلل انداز نہ ہونا تک میں امن وامان کے علاوہ رعایا کی ضرورت سے زیادہ خبر گیری کرنا اور اس کی ضرورتیں پوری کرنا۔ ایسے امور ہیں جو مقبول عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ بادشاہ یوم الحساب سے اس قدر خائف تھا۔ کہ اُس روز کے لئے بھی اولیاء اللہ کی رفاقت کا سہارا ڈھونڈھ رہا تھا۔

ہم سارا دن نافرمانیوں اور ساری رات لہو ولعب میں گزارنے کے باوجود یوم آخرت سے بے پروا پھر رہے ہیں۔ جیسے کبھی یہ دن آنا ہی نہیں۔

دولت سے اندیشہ

حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ اپنے وقت کے غوث گزرے ہیں۔ صاحب علم و فضل اور کشف و کرامات کے علاوہ امیر کبیر بھی تھے۔ انہوں نے بوقتِ وصال چار صاحبزادے اور چار کروڑ نقد ترکہ چھوڑا۔ آپ کے فرزندِ اکبر حضرت صدرالدین رحمتہ اللہ علیہ مسند نشین ہوئے اور مبلغ ایک کروڑ نقد اپنے والد کے ترکہ سے حصہ پایا۔ زرِ کثیر کے نشہ سے آپ کے ذکر و شغل میں خلل پڑنے لگا۔ اسلئے آپ نے غلام کو حکم دیا کہ

"میرے حصہ کے ایک کروڑ روپے فقرا اور مستحقین میں فی سبیل اللہ تقسیم کر دیئے جائیں"

لوگوں نے یہ سن کر سخت حیرت و تعجب کا اظہار کیا اور کہا۔

"یا شیخ۔ آپ کے والد بزرگوار نے یادِ خدا کے باوجود چار کروڑ کی رقم خطیر جمع کی۔ اور آپ اس طرح اتنی بڑی رقم ختم

کئے دیتے ہیں"

آپ نے جواب دیا۔

"میرے والد بڑے عالی ظرف تھے۔ ان کے پاس چار کروڑ روپے نقد موجود تھے۔ اس کے باوجود خدا کی یاد کیا کرتے تھے۔ مگر میرا یہ حال ہے کہ جب سے میں نے سنا ہے کہ میرے حصہ میں ایک کروڑ روپے آئے ہیں میرے دل میں طرح طرح کے خیال آ رہے ہیں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ ان روپوں کی وجہ سے میں خدا سے غافل نہ ہو جاؤں اس لئے ان کا تقسیم کر دینا ہی بہتر ہے"

سبحان اللہ۔ یہ محبتِ الٰہی خشیتِ ایزدی اور یادِ خداوندی میں سرشاری کا اثر تھا۔ کہ زرِ کثیر کا خسارہ صرف بقائے دین و ایمان کی خاطر بخوشی برداشت کر لیا۔ ان کا تعلق مع اللہ اور ان کے وابستگانِ دامن کا تعلق غیر اللہ رہتے۔ جو ذاتی اغراض و اعزازات کو تعلق مع اللہ پر ترجیح دیتے ہیں

———————— ————

خوفِ حساب

ہندوستان کے مشہور بادشاہ ناصر الدین محمود کا عہدِ حکومت اس وجہ سے خاص اہمیت رکھتا ہے کہ انہوں نے اپنی غیر معمولی قابلیت سے ملک کو مغلوں کے پیہم حملوں اور اندرونی شورشوں سے بچا لیا تھا۔ انکی حکومت کی شان و شوکت اور زر و دولت کا اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ "۶۸۵ھ ہجری میں مغلوں کے بادشاہ چنگیز خاں کے پوتے ہلاکو خاں کا سفیر جب سلطان سے ملنے کے لئے دہلی آیا تو سلطان نے اس پر ہیبت شاہی طاری کرنے کیلئے ایک شاندار جشن منعقد کیا۔ جس میں پچاس ہزار سوار۔ دو لاکھ پیادوں کے زرق برق لباس اور فوجی ہتھیاروں سے آراستہ فوج اور دو ہزار جنگی ہاتھیوں کے سلسلہ سے گزرتے ہوئے اس سفیر کو دربار میں لایا گیا۔ جہاں سونے چاندی۔ جواہرات۔ کے آرائشی ساماں کے ساتھ ایک پہلو میں سادات۔ مشائخ قضا اور علماء کی صف تھی۔ دوسری جانب ان پچیس شہزادوں اور بادشاہوں کی قطار تھی۔ جو خراسان۔ ایران۔ عراق اور آذربائیجان وغیرہ ممالک سے

اپنی سلطنتوں کو انہی تاتاری مغلوں کے ہاتھ برباد کرا کر ہندوستان میں پناہ گزین تھے۔ اور تخت شاہی کے گرد ہندو راجے مہاراجے حلقہ باندھے کھڑے تھے۔ اس جشن کے مرعوب کن نظارہ کا یہ اثر ہوا کہ تاتاری مغلوں نے آئندہ کے لئے ہندوستان پر حملوں کا خیال دل سے نکال دیا۔ اور سرحدی امیروں کے پاس احکام بھیج دیئے کہ آئندہ کے لئے ہندوستان پر کوئی حملہ آور نہ ہو۔

اس جلوت کے بعد اس کی خلوت پر بھی ایک نظر ڈال لیئے۔ امور سیاست و سلطنت کا یہ ماہر و شجاع پرلے درجہ کا عابد شب بیدار۔ زاہد خوش اطوار بھی تھا۔ سال بھر میں دو قرآن ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اور انہی کے ہدیہ پر اپنا سال بھر کا گزارہ کرتا تھا۔ اس کی ایک بیوی تھی۔ یہ ملکہ ہند خود اپنے ہاتھ سے روٹی پکاتی تھی۔ ایک مرتبہ ہندوستان کے اس جلیل القدر بادشاہ کی ملکہ نے عرض کی کہ

"روٹی پکانے کے لئے کوئی خادمہ رکھ دیجئے۔"

سلطان نے کہا۔

"میری آمدنی میں اتنی گنجائش نہیں کہ نوکر رکھ سکوں۔ رہا شاہی خزانہ۔ وہ سب رعایا کا مال ہے اس میں سے ایک کوڑی بھی میں اپنی ذات کے لئے نہیں لے سکتا۔"

ناصر الدین محمود نے اپنی بادشاہت کے بیس سال اسی طرح گزار دئے۔ مگر خوف حساب سے شاہی خزانہ سے ایک پائی تک لینے کے روادار نہ ہوئے۔ حالانکہ قوت لا یموت کی حد تک ضرور ہی لے سکتے تھے۔ مگر اتنا بھی گوارا نہ کیا۔

اب تو ارباب حکومت نے بڑی بڑی تنخواہیں۔ الاؤنس وغیرہ حاصل کرنے کے باوجود بنگلہ، موٹر، سامانِ آرائش وزیبائش۔ دعوت وتفریح اور بعض دوسرے اخراجات کا بوجھ بھی قانونًا خزانہ پر ڈال رکھا ہے۔ اگر اندرون ملک یا بیرون ملک سرکاری کام کے لئے دورہ پر جانا پڑے تو فی الواقعہ خرچ سے زائد سفر خرچ حاصل کرنے کے قانونًا حقدار ہوتے ہیں۔ اس طرح قوم کے روپیہ پر خود خوشحالی سے زندگی بسر کرتے ہیں۔ مگر رعایا کو فارغ البال کرنے کی بجائے اس پر آئے دن ناجائز اور ناقابل برداشت ٹیکس لگا کر اس پر عرصۂ حیات تنگ کیا جاتا ہے۔ اور اس بات کا احساس نہیں کرتے کہ ایک دن احکم الحاکمین کو پائی پائی کا حساب دینا ہوگا

---

(۲۲)

نصیحت و وصیت

ہے شباب اپنے لہو کی آگ میں جلنے کا نام
سخت کوشی سے ہے تلخ زندگانی انگبیں

تنبیہ کا اثر

مفتیٔ وقت ابو محمد حلوانی اکیس برس کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ انہیں پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ایک دن اپنے موروثی مکانات کا جائزہ لینے گئے۔ وہاں انہیں بتایا گیا کہ آپ کے اعمال کی وجہ سے آپ کے کرایہ دار آپ کے متعلق نامناسب و نازیبا الفاظ استعمال کرتے رہتے ہیں۔ یہ سن کر وہ بہت متاثر ہوئے فوراً واپس لوٹے۔ والدہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ میں شیخ ابو الخطاب کی مسجد میں جا رہا ہوں۔ اگر ضرورت پڑے۔ تو وہیں سے بلا لیا کریں۔ یہ کہہ کر سیدھے شیخ ابو الخطاب کی خدمت میں پہنچے انہوں نے انکو اپنے درس میں شریک کرنا منظور کر لیا۔ جو بالآخر قاضی بن کر نکلے۔

شیخ ابن جوزی لکھتے ہیں کہ میں نے خود ابو محمد حلوانی کو دیکھا ہے، وہ فتویٰ دیا کرتے تھے۔

بسا اوقات لوگوں کی طعن و تشنیع بھی نصیحت کا کام کر جاتی ہے۔

طریقِ نصیحت

ایک مرتبہ چند مروانی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مہمان ہوئے طبقہ امرا سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اچھے کھانے پینے کے عادی تھے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ان کو نصیحت کرنے کی یہ ترکیب نکالی کہ اپنے باورچی سے کہہ دیا۔

"ان کی خاطر تم جو کھانا تیار کر رہے ہو۔ اس میں ذرا دیر کرنا جلدی نہ کرنا۔"

باورچی نے ایسا ہی کیا۔ یہ لوگ بھوک سے بیتاب ہونے لگے اور باورچی کو کہا۔

"اب زیادہ دیر انتظار نہیں کی جا سکتی جو موجود ہے وہی کھلا دو۔"

باورچی بھی سمجھدار تھا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کی طرف سے تاخیر کے حکم کا مطلب سمجھ گیا۔ اس لئے اس نے جلدی سے ستو اور کھجوریں لا کر ان مہمانوں کے سامنے رکھ دیں۔ شدتِ بھوک کی وجہ سے انہوں نے

یہ بڑے مزے سے کھاتے۔ یہاں تک کہ پیٹ بھر گیا۔

تھوڑی دیر کے بعد باورچی نے ان کے سامنے دسترخوان بچھایا اور کھانے چنے۔ ان لوگوں نے سیر شکمی کی وجہ سے مزید کچھ کھانے سے انکار کر دیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے بہت اصرار کیا کہ۔

"تمہاری خاطر یہ سب کچھ تیار کرایا گیا ہے کچھ نہ کچھ تو کھا لیجئے"۔

مہمانوں نے جواب دیا۔

"ہم خوب سیر ہو چکے ہیں اب کچھ کھا ہی نہیں سکتے۔ ورنہ ضرور تعمیلِ ارشاد ہوتی"

اس پر خلیفہ نے کہا۔

"جب اس قدر سادہ غذا انسان کا پیٹ بھرنے کے لیے کافی ہو سکتی ہے۔ تو پھر آگ میں کیوں گھستے ہو۔ اور پیٹ بھرنے کیلئے ناجائز ذرائع معاش کیوں اختیار کرتے ہو"

اس عملی نصیحت کا ان پر اتنا اثر ہوا کہ وہ رو پڑے۔ اور کہنے لگے۔ کہ

"واقعی جو لطف و آرام مختصر اور سادہ زندگی میں ہے وہ عیش و عشرت میں نہیں"

حکمرانی کا چارٹر

اموی بادشاہ ہشام بن عبدالرحمن کو اندلس میں حکومت کئے ابھی آٹھ سال ہی گزرے تھے کہ اس عادل اور فرض شناس فرمانروا کو مرض الموت نے آگھیرا۔ دنیا سے رخصت یقینی جان کر خلیفہ نے اپنے لڑکے الحکم کو ولیعہد مقرر کیا اور وصیت کی۔

بیٹے! امیر و غریب کو ہمیشہ ایک نظر سے دیکھنا۔ انصاف و عدل کے ترازو پر ہر ایک کو تولنا۔ کسی کے ساتھ زیادتی اور ظلم نہ کرنا جو لوگ تمہارے محتاج اور تمہارے تابع ہیں ان سے نرمی کے ساتھ پیش آنا۔ انسانوں کے مراتب میں کوئی فرق نہ کرنا۔ جو حکام رعایا سے زیادتی کریں۔ انہیں سخت سے سخت سزا دینا۔ سپاہیوں کو رعایا کے مال و جان کی حفاظت کے سوا کسی دوسرے کام پر نہ لگانا۔ کسی کو یہ اجازت نہ دینا کہ وہ رعایا کو تنگ کر سکے۔ رعایا سے محبت کرنا۔ تاکہ وہ تم

سے محبت کرے۔ رعایا کے دلوں میں اپنے لئے نفرت یا ڈر پیدا نہ ہونے دینا۔ یہ دونوں چیزیں حکومت کو کمزور کر دیتی ہیں۔ کاشتکاروں کا سب سے زیادہ خیال رکھنا۔ وہی اس معیشت کی ریڑھ کی ہڈی ہیں۔ ان کی فلاح و بہبود کے لئے ہر وقت مستعد رہنا۔ ان کی فصل خراب نہ ہونے دینا۔ ان کی ہر موقعہ پہ مدد کرنا۔ اگر تمہاری رعایا خوشحال رہی اور اس نے تمہیں دعائیں دیں تو تمہاری دنیا و عاقبت دونوں سدھر جائیں گی۔

یہ وصیت کر کے ہشام نے آنکھیں بند کر لیں۔ خلافت راشدہ کے طریقوں پر شخصی حکومت چلانے والے ہشام کی یہ وصیت آنے والے حکمرانوں کے لئے ایک چارٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔

سب سے بڑی اسلامی سلطنت کے نظامِ حکومت کو بھی انہی خصوصیات کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر یہاں تو معاملہ کچھ الٹا ہی نظر آتا ہے۔

شراب سے توبہ

ایک روز ابن حرملہ اپنے گھر سے باہر نکلا۔ ایک شخص شراب کے نشہ میں گلی میں جھومتا جا رہا تھا۔ اس نے اس شرابی کو رسوائی سے بچانے کے لئے جلد گھسیٹ کر اپنے گھر میں چھپا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ابن حرملہ حضرت سعید بن مسیبؒ سے ملے۔ اس واقعہ کا ذکر کر کے ان سے پوچھا کہ اس کا کیا کرنا چاہیئے۔ حضرت سعید احکام خداوندی کے اجرا میں بہت سخت تھے۔ مگر کسی مسلمان کی پردہ دری کے بھی روادار نہ تھے۔ اس لئے انہوں نے مشورہ دیا کہ اگر تم اس کو اپنے گھر چھپا سکو۔ تو چھپا لو۔

حضرت سعید سے مشورہ کرنے کے بعد ابن حرملہ گھر پہنچا۔ تو وہ شرابی ہوش میں آ چکا تھا۔ شرابی کی جونہی اُس پر نظر پڑی۔ شرم کے مارے پانی پانی ہو گیا۔ کچھ بولنے کی ہمت نہ ہوئی۔ بت بنا کھڑا رہا۔ ابن حرملہ نے اس سے کہا۔

"تم کو شرم نہیں آتی۔ اگر تم صبح اس حالت میں پکڑ لیے جاتے اور تم پر حد جاری کی جاتی۔ تو لوگوں کی نظروں میں تمہاری کیا عزت رہتی۔ تم زندگی ہی میں مردہ ہو جاتے۔ تمہاری شہادت تک قبول نہ ہوتی اور تم پر انگلیاں اُٹھائی جاتیں"
یہ نصیحت سن کر وہ تائب ہو گیا اور کہا۔
"خدا کی قسم! اب آئندہ میں کبھی شراب نہ پیا کروں گا"
سلیم الفطرت انسان کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے اور بدسرشت کو قید و بند کی مصیبتیں بھی بسا اوقات راہِ راست پر نہیں لا سکتیں۔

نصیحت طلبی

بااقتدار طبقہ بالعموم اپنے آپ کو مشوروں اور نصیحتوں سے بالاتر سمجھتا ہے۔ اگر اسے غلط روی سے روکنے کے لیے صحیح مشورہ دیا جائے تو اسے اپنی عقل و دانش کی توہین سمجھتا ہے اور اپنے اختیارات میں مداخلت بے جا تصور کرتا ہے۔

اسلام کے مسکین خلیفہ عمر بن عبدالعزیز پر جب خلافت کا بار ڈالا گیا۔ تو انہوں نے قدیم روش کے خلاف اپنی ذمہ داریوں کا کما حقہٗ احساس کرتے ہوئے امورِ سلطنت کے معاملہ میں علماء سے نصیحت لینی ضروری سمجھی۔ تاکہ لغزشوں، غلطیوں اور کوتاہیوں سے بچے رہیں۔

ایک بار آپ نے حسن بصری رحمتہ اللہ علیہ کو لکھا۔

"مجھے اختصار کے ساتھ نصیحت کیجئے۔"

انہوں نے مختصر الفاظ میں چند نصیحتیں لکھ کر آپ کی خدمت میں بھیجیں جن سے آپ بہت متاثر ہوئے۔

اسی غرض کے لئے ایک بار آپ نے عراق کے تمام فقہا کو طلب کیا۔ سب آئے مگر حضرت حسن بصری خود تشریف نہ لا سکے۔ اور ایک نصیحت آمیز خط لکھ بھیجا۔ جب آپ کو وہ خط ملا۔ تو اسے آنکھوں سے لگایا۔ کھول کر پڑھا۔ اور اتنے متاثر ہوئے کہ رو پڑے۔

ایک بار ابن اہتم ان کی خدمت میں گئے۔ اور کہا۔

"میں آپ کو مسرور کروں"۔

فرمایا۔

"نہیں"

ابن اہتم نے کہا۔

"نصیحت کروں"۔

فرمایا

"ہاں"

نصیحت پذیری کا دور ختم ہو چکا ہے۔ اب تو خود رائی۔ خود نمائی اور خود بینی کا دور ہے۔

سلطنت کی قیمت

ایک مرتبہ خلیفہ ہارون رشید پانی پی رہا تھا۔ ابن سماک نے اسے پانی پینے سے روک دیا۔ اور کہا۔

"ہارون! اگر یہ پانی کا پیالہ تم سے چھین لیا جائے اور کوئی قوتِ بالا اس کے پینے سے تم کو روک دے۔ تو تم اس کی کیا قیمت ادا کرو گے؟"

ہارون نے جواب دیا۔

"میں آدھی سلطنت اس پیالہ کے عوض دے دوں گا۔"

ابن سماک بولے۔

"اب پانی پیو۔"

جب وہ پانی پی چکا تو ابن سماک نے پوچھا۔

"اگر تمہارا پیشاب رک جائے تو تم پیشاب کھلوانے کے لئے کیا قیمت دے سکتے ہو؟"

ہارون نے کہا۔

"آدھی سلطنت۔"

ابن سماک نے فرمایا۔

"ہارون! تم نے پھر کبھی سوچا۔ جو سلطنت آدھی تو پانی کے ایک پیالے کی قیمت میں چلی جاوے اور آدھی پیشاب کھلوانے میں خرچ ہو جاوے۔ اس کی کیا حیثیت ہے اور کون بھلا آدمی اس کی آرزو کر سکتا ہے۔"

ہارون پر اس کا بڑا اثر ہوا۔ وہ اتنا رویا کہ ہچکی بندھ گئی۔ ارباب فہم و فراست حکومت کو کانٹوں کی سیج سمجھ کر اس کے قریب نہیں جاتے۔ اور بندگانِ حرص و ہوا اس کے حصول کے لئے جان تک گنوا دیتے ہیں۔

عملی نصیحتیں

شیخ ابن جوزی لکھتے ہیں۔
سلفِ صالحین جو عموماً سب کمالات رکھتے تھے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک چیز بھی چھوٹ جاتی تو اس پر روتے رہتے تھے۔
حضرت ابراہیم بن ادھمؒ کہتے ہیں۔
ہم ایک عابد کے پاس گئے جو بیمار تھے اور اپنے پیروں کی طرف دیکھ دیکھ کر رو رہے تھے۔ میں نے سبب پوچھا تو فرمایا۔
"اِن پیروں کو کبھی جہاد کا موقعہ نہیں ملا۔"
اسی طرح ایک اور صاحب کا واقعہ ہے کہ وہ رو رہے تھے پوچھنے پر بتلایا۔
"ایک رات ایسی گذر گئی جس میں شب بیداری نہ کر سکا اور ایک دن ایسا گذرا کہ میں نفلی روزہ نہ رکھ سکا۔"
عامر ابن عبد قیس سے کسی نے کہا۔ ذرا ٹھہریئے۔ کچھ کہنا ہے۔

بولے "سورج کو روک لو۔ یعنی وقت گزرتا جاتا ہے۔ یہ کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔"

حضرت معروف کرخیؒ کی خدمت میں کچھ لوگ حاضر تھے۔ انہوں نے ارشاد فرمایا۔

"آپ لوگ اب تشریف لے جائیں۔ آفتاب پر جو فرشتہ مقرر ہے وہ اس کو بڑی تیزی سے چلا رہا ہے۔"

اگلے لوگ وقت کی بہت قدر کرتے تھے۔ بہت سے ایسے تھے کہ عشا کے وضو سے صبح کی نماز پڑھتے تھے۔ حضرت العبرادویہ رات بھر عبادت کرتی تھیں اور صبح ہونے کے قریب نیند کا ایک جھونکا آجاتا تو گھبرا کر اٹھ بیٹھتیں اور اپنے نفس کو مخاطب کر کے کہتیں "قبر میں سونے کا بہت موقعہ ہے۔"

غور کیجئے اس دنیا میں ہمیں زندگی بسر کرنے کی جو مدت ملتی ہے اس کی حقیقت کیا ہے۔ فرض کرو ایک شخص ساٹھ سال زندہ رہتا ہے۔ تو اس نے تیس سال سونے میں گزار دیے۔ پندرہ سال بچپن کے کھیل کود کی نذر ہو گئے۔ اب جو وقت باقی رہا۔ وہ ہمارے کھانے پینے اور کمانے میں خرچ ہو جاتا ہے۔ ثواب بناؤ کہ اس حیاتِ ابدی کے حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس وقت کہاں۔ کاش کہ ہم نے بھی کبھی یہ احساس کیا ہوتا! اور زندگی کا صحیح مصرف جانا ہوتا!

بیوی کو وصیت

شہیدِ اسلام غازی انور پاشا نے میدانِ جنگ سے اپنی بیوی کے نام جو آخری خط لکھا تھا۔ وہ دو حصوں پر مشتمل تھا۔ پہلا حصہ اسکی ذاتِ خاص سے متعلق تھا۔ جو شجاعت و مردانگی کے باب میں درج ہو چکا ہے۔ دوسرا حصہ آپ کی وصیت پر مشتمل ہے۔ جو درج ذیل ہے

"پیاری نجیبہ! میری وصیت سن لو۔ اگر میں شہید ہو جاؤں۔ تو تم اپنے دیور نوری بک (انور پاشا کے چھوٹے حقیقی بھائی) سے شادی کر لینا تمہارے بعد مجھے سب سے زیادہ عزیز نوری ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے سفرِ آخرت کے بعد وہ زندگی بھر وفاداری کے ساتھ تمہاری خدمت کرتا رہے۔

میری دوسری وصیت یہ ہے کہ تمہاری جتنی اولاد ہو۔ سب کو میری زندگی کے حالات سنانا۔ اور سب کو میدانِ جہاد میں اسلام کی خدمت کے لئے بھیج دینا۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا۔ تو یاد رکھو میں

جنت میں تم سے روٹھ جاؤں گا۔

تیسری وصیت یہ ہے کہ مصطفےٰ کمال پاشا کی ہمیشہ خیرخواہ رہنا ان کی ہر ممکن مدد کرتی رہنا۔ کیونکہ اس وقت وطن کی نجات خداوند تعالیٰ نے ان ہی کے ہاتھ میں رکھ دی ہے۔

اچھا پیاری۔ رخصت نہیں معلوم کیوں میرا دل خود بخود کہتا ہے کہ اس خط کے بعد تمہیں کبھی خط نہ لکھ سکوں گا۔ کیا عجب ہے کہ کل ہی شہید ہو جاؤں۔ دیکھو صبر کرنا۔ میری شہادت پر غم کھانے کی بجائے خوش ہونا کہ میرا اللہ کے کام آجانا تمہارے لئے بھی باعث صد فخر ہے۔

نجیبہ۔ رخصت ہوتا ہوں۔ اپنے عالم خیال میں تمہیں گلے لگاتا ہوں۔ انشاء اللہ تعالےٰ جنت میں ملیں گے اور کبھی جدا نہ ہونگے"

ایسا جذبہ اب کہاں؟

طالب علم کیلئے

چھٹی صدی ہجری کے مشہور عالم علامہ ابن جوزی اپنے بیٹے محمد (ابوالقاسم) کو جو ۶۵۶ھ میں تاتاریوں کے حملے میں شہید ہوئے ایک خط کے دوران میں یوں نصیحت کرتے ہیں۔

"میرے لخت جگر!

اللہ تمہیں نیکیوں کی توفیق دے۔ دنیا میں زندگی کی سانسیں بہت کم اور قبر کی زندگی بہت طویل ہے۔ نیکی اس کے نصیب میں آئی۔ جس نے اپنی خواہشات کو چھوڑا۔ اور محروم وہی ہے جس نے دنیا کے مقابلہ میں آخرت سے منہ موڑا۔

اصل کمال علم اور عمل دونوں کے جمع کرنے میں ہے جس کو یہ دونوں نعمتیں ملیں اس کا مرتبہ بلند ہوا۔

قرآن مجید کی تفسیر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ صحابہ کرامؓ اور علماء کے حالات پیش نظر رہیں تاکہ بلند سے بلند مرتبہ اختیار

کرنے کی توفیق ہو۔ طلب علم کے دوران میں طالب علم کو بلند ہمتی سے
کام لینا چاہیئے۔ میں اپنے حالات کا ایک نمونہ تمہارے پیش کرتا ہوں
مجھے خوب یاد ہے کہ میں چھ سال کی عمر میں مدرسہ میں داخل ہوا
بڑی عمر کے طلبا میرے ہم سبق تھے۔ میں بچوں کے ساتھ کبھی کھیل
میں حصہ نہیں لیتا تھا۔ میں نے کبھی اپنے کام میں غفلت نہیں کی
تھی۔ اور نہ کبھی ہنسی مذاق میں اپنا وقت ضائع کیا تھا۔ دوسرے
لڑکے دجلہ کے کنارے کھیلا کرتے تھے۔ اور میں سب سے
الگ علمی کاموں میں مشغول رہتا تھا۔ اُستاد کی زبان سے جو سنتا
اسے خوب یاد کر لیتا اور گھر آ کر لکھ لیتا تھا۔

خدا نے مجھ کو زہد کی توفیق عطا فرمائی۔ میں نے کثرت سے
روزے رکھے۔ کھانے میں کمی کی۔ راتوں کو جاگتا تھا۔ اور ہر فن
کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا تھا۔ میں فخر کے طور پر نہیں بلکہ شکر
کے طور پر کہتا ہوں کہ اللہ نے میرے کلام میں عجیب تاثیر بخشی۔
قریباً دو سو ذمی (غیر مسلم) میرے ہاتھ پر اسلام لائے۔ اور ایک لاکھ
سے زائد آدمیوں نے میری مجلس میں توبہ کی۔

میں مشائخ کے حلقوں میں حاضری دینے میں اس قدر جلدی کرتا
تھا۔ کہ دوڑنے کی وجہ سے میری سانس پھول نے لگتی تھی۔ صبح اور شام

اس طرح گذرتی کہ کھانے کا انتظام نہ ہوتا تھا۔ مگر رب کا شکر ہے کہ اس نے مخلوق کی احسان مندی سے بچایا۔

تم کو چاہیئے کہ اس غفلت کی نیند سے جاگو۔ پچھلی زندگی پر شرمندہ ہو۔ اپنی عمر کی ان گھڑیوں کو یاد کرو۔ جو بیکاری میں گذر گئیں۔ اور اتنی کوشش کرو کہ کاملین کے درجہ تک پہنچ جاؤ۔"

ہمارے نونہالوں کو ذرا اپنے گریبانوں میں جھانکنا چاہیئے کہ وہ اپنی طالب علمانہ زندگی کو آوارگی میں گزارتے ہیں جو قحط الرجال کی سب سے بڑی وجہ ہے۔